گنگا کے پجاری ناگ

2

اے۔ حمید

17028 ت

گنگا کے پجاری ناگ (2)

اے حمید

اردو فینز ڈاٹ کام

مکتبہ القریش، سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور ۲

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں پاروتی کے پہلو میں ایک قدم پیچھے ہو کر کھڑا تھا۔

سانپ بھی اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہلا تھا۔ پاروتی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر سانپ کو نمسکار کیا اور اس کے آگے جھک گئی۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ یہ ہندو توہم پرست عورت تو اپنی پوجا پاٹھ میں لگ گئی ہے اگر سانپ نے اچھل کر مجھ پر حملہ کر دیا تو میں اپنا بچاؤ نہیں کر سکوں گا۔ پاروتی کسی منتر کا جاپ کرنے لگی۔ منتر پڑھ کر وہ اپنے اوپر پھونک مارتی اور پھر منتر پڑھنے لگتی۔ سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا رہا۔ پاروتی ہاتھ جوڑے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹی گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی پیچھے ہٹنے لگا۔ ہم جھاڑیوں سے باہر نکلے تو پاروتی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

"ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ شو دیوتا کے اندر ناگ کے درشن ہو گئے۔ یہ اندر ناگ ہے جس کو یہ سانپ درشن دیتا ہے اس کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تو اپنے اندر ناگ سے کہو کہ ہماری جو کشتی سمندری طوفان میں بہہ گئی ہے وہ واپس لا دے۔"

پاروتی بولی۔ "ہو سکتا ہے کشتی شام تک واپس آ جائے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"اس قسم کے بیہودہ عقیدوں کی وجہ سے تم اس حال تک پہنچی ہو۔ اگر تمہارے ماں باپ ستی ماتا کے بجائے گھر میں گھسنے ہی نہ دیتے تو آج تمہاری یہ حالت نہ ہوتی۔ مگر وہ بھی دوسرے ہندوؤں کی طرح دیوی دیوتاؤں کو اپنا بھگوان مانتے تھے۔ انہوں نے ستی ماتا کی دیوتاؤں کی طرح آؤ بھگت کی اور وہ بدمعاش بھیڑیے تمہیں اٹھا کر لے گئے۔"

پاروتی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کہنے لگی۔

"کبھی کبھی مجھے یہ دیوی دیوتا سب جھوٹ لگتا ہے لیکن میں ان عقیدوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ یہ میرے خون میں شامل ہو چکے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "خدا تمہیں سیدھا راستہ دکھائے۔ اب یہ بتاؤ کہ شام ہو رہی ہے۔ رات کہاں گزارنی ہے؟ مجھے خطرہ ہے کہ رات کو یہاں کوئی درندہ وغیرہ نہ کہیں سے نکل آئے۔"

پاروتی نے ارد گرد کے درختوں کو دیکھا۔

"ہم ان درختوں پر بھی رات کو بسیرا کر سکتے ہیں۔ مگر یہ بڑے اونچے درخت ہیں۔ ان پر چڑھنا آسان نہیں۔"

میں نے کہا۔ "اور پھر ساحل پر جو چٹانیں ہیں وہاں چل کر دیکھتے ہیں۔ شاید وہاں کوئی ایسا ٹھکانہ مل جائے جہاں رات بسر کی جا سکے۔"

پاروتی بولی۔ "لیکن میرے لئے دو تین سانپوں سے ڈسوانا بڑا ضروری ہے۔"

میں نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جو سانپ تھا اس سے ڈسوا لیتی۔ اس سے کیوں نہیں ڈسوایا؟"

پاروتی نے ذرا تلخ لہجے کے ساتھ کہا۔

"یہ اندر ناگ شو دیوتا کا خاص سانپ۔ اس نے بھی میرے جسم کی بو پا لی تھی۔ اسے بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں آدھی سے زیادہ ناگن بن چکی ہوں۔ وہ مجھے کبھی نہ ڈستا۔"

ہم اسی طرح باتیں کرتے ساحل پر سمندر میں دور تک پھیلی ہوئی چٹانوں میں آ گئے۔ سمندر کا پانی ان چٹانوں کے اندر تک چلا گیا تھا۔ ہم پانی میں چلتے ان چٹانوں میں رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ پاروتی دوڑ کر ایک طرف گئی۔ اس نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا اور جب باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک دھاری دار سانپ پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس کی کلائی اور بازو پر بار بار ڈس رہا تھا۔ پاروتی بڑے آرام سے کھڑی سانپ سے ڈسوا رہی تھی۔ میں چند قدم کے فاصلے پر کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

جب سانپ میں مزید ڈسنے کی طاقت نہ رہی تو پاروتی نے اس کا سر منہ میں ڈال کر کھانا شروع کر دیا۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ یہ مکروہ منظر میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ میرے پاس آئی تو بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ سمندر کا سانپ تھا۔ سمندر کے سانپ کا زہر ہلکا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پاروتی! میرا کہا مانو اور تم سانپ کھانے چھوڑ کر مچھلیاں کھانا شروع کر دو۔"

وہ سر جھٹک کر بولی۔

"کہاں مچھلی کہاں سانپ۔ کہاں راج بھوج اور کہاں کنگوا تیلی۔۔۔۔۔۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ عورت اب لاعلاج ہو چکی ہے۔ تھوڑی دیر چٹانوں میں چلنے پھرنے کے بعد ہم نے ایک چٹان میں رات بسر کرنے کی جگہ تلاش کر لی۔ یہ ایک کھوہ تھی جو سمندری موجوں نے بنا دیا ہوا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔ کھوہ میں چٹان کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پاروتی کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

اور وہ چلی گئی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے زرد کیلوں کا گچھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں دو کچے ناریل تھے۔ میں کیلے

Prepared By: S.Sohail Hussain

اور جنگل کھاتے کھاتے تک آگیا تھا مگر وہاں اس کے سوا کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ مچھلیاں سمندر میں دور دور تک تھیں اور اگر کوئی مچھلی ہم پکڑ بھی لیتے تو اس کو درست کرنے کے لئے آگ کہاں سے جلاتے۔ میرے پاس ماچس بھی نہیں تھی۔

دن کی روشنی کم ہونے لگی تھی۔ ابر آلود آسمان کی وجہ سے سورج غروب ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم کچھ دیر جنگل کے اندر بیٹھے جزیرے سے فرار کی ترکیبیں سوچتے رہے۔ ہمارے سامنے ایک ہی ترکیب تھی کہ کسی طریقے سے گرے پڑے دو چار درختوں کی شاخوں کو کاٹ کر انہیں آپس میں باندھ دیا جائے اور سمندر میں ڈال کر اس پر بیٹھ جائیں اس میں خطرہ بھی تھا۔ درختوں کی شاخیں سمندری موجوں کے تھپیڑوں سے الگ الگ بھی ہو سکتی تھیں۔ اس کے سوا دوسرا کوئی طریقہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھی شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں پوری رات اس جنگل میں گزارنی تھی۔ پاروتی کہنے لگی۔

"چلو چل کر جزیرے میں پھرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے جھونپڑے میں کوئی آدمی آ گیا ہو۔ اگر اس کی کشتی سمندر میں نظر آ گئی تو ہم اسے لے کر فرار ہو جائیں گے۔"

یہ بالکل یقین باتیں تھیں۔ پھر بھی میں وقت گزارنے کے لئے پاروتی کے ساتھ چٹانوں سے نکل کر جزیرے میں داخل ہو گیا۔ جزیرے میں دھندلا دھندلا اندھیرا اترنے لگا تھا۔ چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ دس پندرہ منٹ تک ہم جزیرے کے اندر سیدھ میں چلتے رہے۔ اس کے بعد جزیرے کا مشرقی ساحل آ گیا۔ ہم سخت بور ہو گئے تھے۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"اس سے تو یہی بہتر تھا کہ چٹان میں ہی بیٹھے رہتے۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔ جھونپڑی بھی خالی پڑی تھی۔"

پاروتی سمندر میں مشرق کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ کے اشارے سے اور سمندر میں مجھے کچھ دکھاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کوئی جزیرے کی طرف آ رہا ہے۔"

میں نے سمندر پر نگاہ دوڑائی۔ دور ایک کشتی جزیرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"پاروتی! کچھ لوگ کشتی میں بیٹھے اس طرف آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ جنگلی لوگ ہوں۔ جلدی سے کسی جگہ چھپ جاتے ہیں۔ اگر یہ کشتی یہاں چھوڑ کر دوسری طرف گئے تو ہم ان کی کشتی لے کر بھاگ جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ اس درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔"

ساحل کے ساتھ ساتھ ناریل کے درختوں کی جو قطار دور تک چلی گئی تھی اس میں ایک چھوٹے قد کا گھنا درخت بھی تھا۔ اس کی شاخیں بڑی گھنی تھیں۔ ہم جلدی جلدی درخت پر چڑھ کر شاخوں میں اس طرح چھپ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں سمندر کا ساحل صاف نظر آ رہا تھا۔ کشتی آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ہم دونوں درخت کی ٹہنیوں میں چھپے بڑے غور سے کشتی کو قریب آتے دیکھ رہے تھے۔ جب کشتی مزید قریب آ گئی تو اس میں بیٹھے ہوئے آدمی نظر آنے لگے۔ یہ تین آدمی تھے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ ساحل پر آ کر وہ کشتی سے اتر گئے۔ اب ہم نے دیکھا کہ عورت دبلی پتلی لڑکی تھی۔ آدمیوں کے جسم تقریباً عریاں تھے۔ کمر کے ساتھ کیلے کے پتوں کی جھالریں سی باندھ رکھی تھیں۔ جسم پر مختلف رنگ کی لکیریں پڑی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے کندھے سے تیر کمان لٹک رہا تھا اور ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔ لڑکی نے لمبا سا کرتہ پہنا ہوا تھا جو اس کے گھٹنوں تک چلا گیا تھا۔ انہوں نے لڑکی کے دونوں ہاتھ رسی سے باندھے ہوئے تھے۔ لڑکی ان سے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے ساحل پر لا رہے تھے۔ پاروتی نے آہستہ سے کہا۔

"ہے بھگوان! یہ جنگلی لوگ تو لڑکی پر ظلم کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "اپنے بھگوان کے لئے خاموش رہو۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ کشتی چلانے کا امکان کہاں تک ہے۔ انہوں نے کشتی کو
ریت پر کھینچ لیا تھا اور وہ کشتی سے زیادہ دور نہیں تھے۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا
کہ یہ لوگ لڑکی کو لے کر جزیرے کے اندر چلے جائیں تاکہ ہمیں کشتی میں بیٹھ کر
فرار ہونے کا موقع مل جائے۔ مگر وہ لوگ کچھ اور پروگرام بنا کر جزیرے پر لڑکی کو لائے
تھے۔ انہوں نے کشتی سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر لڑکی کے ہاتھ کھول دیئے اور
اسے زبردستی پکڑ کر ریت پر لٹا دیا۔

ایک آدمی نے تھیلے میں سے لکڑی کی میخیں نکال لیں۔ انہوں نے لڑکی کے
چاروں طرف لکڑی کی میخیں ریت میں گاڑ دیں۔ پھر لڑکی کے دونوں ہاتھ اور دونوں
پاؤں ان میخوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ اب لڑکی بالکل جکڑی ہوئی حالت میں پڑی تھی۔ وہ
ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ صرف گردن ادھر ادھر ہلاتے ہوئے رو رہی تھی اور
اپنی زبان میں بار بار کچھ کہہ رہی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"یہ لوگ کیا کرنے لگے ہیں؟"

پاروتی نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔

"میرا خیال ہے یہ لڑکی کو قتل کر کے کھا جائیں گے۔"

دو آدمی لڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک آدمی کلہاڑی لے کر درختوں کی طرف چل
پڑا۔ وہ ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں نے پاروتی کے کان میں کہا۔

"بالکل نہ بولنا۔"

ہم دونوں سانس روک کر شاخوں میں ساکت ہو گئے۔

جنگلی آدمی ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر درختوں کے نیچے گری پڑی لکڑیاں
اٹھانے لگا۔ وہ خشک گھاس بھی کاٹ رہا تھا۔ تین چار پھیرے لگا کر وہ ڈھیر ساری لکڑیاں
اور خشک گھاس پھوس لے گیا۔ ان جنگلی آدمیوں نے مل کر لکڑیاں اور گھاس پھوس
زمین پر جکڑی ہوئی لڑکی کے چاروں طرف ڈھیریاں سی بنا کر ڈال دیا۔ ایک ڈھیری لڑکی
کے سر کے بالکل قریب پیچھے کی جانب لگا دی گئی۔

لڑکی اونچی آواز میں روئے اور اپنی زبان میں بار بار ایک ہی جملہ دہرانے لگی۔
میں نے پاروتی سے کہا۔

"یہ لوگ لڑکی کو زندہ جلا رہے ہیں۔ ہمیں اس کو بچانے کی کوشش کرنی
چاہیئے۔"

پاروتی نے کہا "ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ تین آدمی ہیں۔ ان کے پاس
زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک جنگلی کو مار لوں گی۔ اس کے بعد
ہماری موت یقینی ہے۔"

پاروتی نے درست کہا تھا۔ اس قسم کی حرکت ہم دونوں کو لڑکی سمیت موت کے
منہ میں لے جا سکتی تھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ان جنگلی آدمیوں نے گھاس پھونس اور
درختوں کی شاخوں کی ڈھیریوں کو آگ لگا دی اور لڑکی کے گرد اچھل اچھل کر چیخ چیخ کر
چکر لگانے لگے۔ وہاں دھواں اٹھنے لگا۔ تینوں جنگلی لڑکی کو اردگرد جلتی ہوئی آگ کے
حوالے کر کے کشتی کی طرف دوڑ کر گئے۔ کشتی کو کھینچ کر سمندر میں ڈالا۔ اس میں
بیٹھے اور تیزی سے چپو چلاتے دور ہونے لگے۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ لڑکی کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اگرچہ آگ براہ راست اس
کے اوپر نہیں لگی تھی لیکن آگ اس کے چاروں طرف تھی اور آہستہ آہستہ آگ کے
شعلے اس کی طرف بڑھ رہے تھے اور دھوئیں سے بھی اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے
پاروتی سے کہا۔

"جب تک جنگلی سمندر میں نظر آ رہے ہیں تم درخت پر ہی رہنا۔ میں لڑکی کو
بچانے جاتا ہوں۔"

میں نے درخت سے نیچے چھلانگ لگا دی اور زمین کے ساتھ لگ کر جھک جھک کر
کچھ دوڑ کر کچھ رینگ کر جتنی جلدی پہنچ سکتا تھا لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے ایک
طرف سے آگ پر ریت ڈال کر اسے بجھانا شروع کر دیا۔ لڑکی کے سر کی طرف سے
میں نے آگ بجھا دی۔ لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ چیخ چیخ کر

Prepared By: S.Sohail Hussain

مجھے اپنی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ میں نے بھیگی ہوئی گھاس اور لکڑیوں کو پرے ہٹا دیا۔
اور جلدی جلدی لڑکی کے ہاتھ پیر کھول دیئے اور اسے لیٹے لیٹے بازوؤں سے پکڑ کر
ریت پر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

لڑکی اٹھنے لگی تو میں نے اسے پکڑ کر وہیں لٹا دیا اور اپنی زبان میں کہا۔

"لیٹی رہو۔ اٹھو نہیں۔"

لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ میرے کھینچ کر نیچے لٹانے سے ہی ریت پر میرے ساتھ
پڑی رہی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ ہمارے اور سمندر کے درمیان آگ اور
دھوئیں کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی جس نے ہمیں سمندر میں داخل ہوتے جنگلی لوگوں کی
نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ میں نے اس دیوار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ پکڑ
کر اسے اٹھایا اور اسے کھینچتا اور اپنے ساتھ دوڑاتا ہوا درختوں میں لے آیا۔

اس دوران پاروتی بھی درخت سے نیچے اتر چکی تھی۔ ہم نے لڑکی کو وہیں
جھاڑیوں کے پاس بٹھا دیا۔ لڑکی کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ نقوش نیشیا کے ملنے والے لوگوں
کی طرح ذرا چپٹا تھا۔ وہ حیران ہو کر کبھی مجھے اور کبھی پاروتی کو دیکھتی۔ میں نے لڑکی
سے ہندوستانی میں پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔ یہ کون تھے؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پاروتی نے بھی اس سے دو تین بار یہی سوال کئے
مگر لڑکی یا تو ہماری زبان نہیں سمجھ رہی تھی یا ابھی صدمے کے اثر سے باہر نہیں ہوئی
تھی۔

سمندر پر جنگلیوں کی کشتی اب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ہم لڑکی کو
لے کر ساحل پر کھلی فضا میں لے آئے۔ جہاں اسے لٹا کر آگ اگلائی گئی تھی وہاں آگ
ابھی تک لگی ہوئی تھی اور دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔ جب لڑکی کے ہوش و حواس ذرا
بحال ہوئے تو اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں کہا۔

"میں بچوا۔ یہ دشمن۔ میں بابا۔ دور۔۔۔ میرا گھر۔۔۔"

کافی دیر بعد اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں کو جوڑ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ اپنے ماں
باپ کے پاس ساتھ والے کسی قریبی جزیرے میں رہتی ہے۔ یہ لوگ دشمن قبیلے کے
آدمی تھے۔ اسے ہلاک کرنے کے لئے یہاں لے آئے تھے۔ اس کی باتوں سے یہ معلوم
کر کے ہمیں بڑا حوصلہ بھی ہوا کہ کوئی دوسرا جزیرہ جہاں آبادی بھی ہے وہاں سے
قریب ہی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ لڑکی کو جو اپنا نام مچھوا بتا رہی تھی اس کے جزیرے
تک کس طرح پہنچایا جائے اور خود بھی وہاں کس طرح پہنچا جائے۔

رات ہم نے چٹان کی کھوہ میں گزاری۔ دوسرے دن ہم اس جگہ پر آ گئے جہاں
رات کو لڑکی کو جنگلی آدمیوں نے زندہ جلانے کے لئے لٹایا تھا۔ وہاں جلی بجھی راکھ
کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لڑکی نے چیخ چیخ کر کچھ کہا۔ وہ سمندر کی طرف اشارہ کر رہی
تھی۔ اشارہ کرتے ہی وہ درختوں کی طرف بھاگ گئی۔ ہم نے سمندر کی جانب دیکھا۔
دور سمندر میں ایک کشتی ساحل کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ میں نے پاروتی سے
کہا۔

"میرا خیال ہے اس لڑکی کے دشمن قبیلے کے لوگ ہوں گے۔ اسی لئے یہ لڑکی ان
کو دیکھ کر بھاگ گئی ہے۔"

"تو پھر ہمیں بھی درختوں میں جا کر چھپ جانا چاہئے۔ ہم اس بار انہیں زندہ نہیں
چھوڑیں گے۔"

یہ کہہ کر پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑا اور درختوں کی طرف بھاگی۔ ہم ناریل کے
جھنڈوں میں آئے تو جنگلی لڑکی وہیں جھاڑیوں میں چھپی سمندر کی طرف دیکھ رہی
تھی۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ یہ کون لوگ آ رہے ہیں؟ لڑکی نے ہمیں بڑی مشکل
سے سمجھایا کہ یہ دشمن قبیلے کے لوگ ہیں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیاں اور کھوپڑی لینے
آئے ہیں۔ ہم لڑکی کو وہاں سے دور لے گئے اور اسے جھاڑیوں کے پیچھے بٹھا کر
اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں سمجھایا کہ وہ وہیں رہے اور کسی حالت میں بھی ساحل
سے سمندر کی طرف نہ آئے۔ میں اور پاروتی ساحل والے درختوں کی اوٹ میں بیٹھ

Prepared By: S.Sohail Hussain

گئے اور کشتی کو سمندر کی طرف آتے دیکھنے لگے۔ کشتی اب قریب آ گئی تھی۔ اس میں صرف آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے ساحل پر آتے ہی کشتی سے چھلانگیں لگا دیں اور کشتی کو ریت پر کھینچنے کے بعد اس مقام پر آ کر غور سے پیچھے ریت کو دیکھنے اور پاؤں سے جلی ہوئی شاخوں اور گھاس پھوس کی راکھ کو ادھر ادھر ہٹانے لگے۔ پھر وہ تعجب سے ادھر ادھر دیکھنے اور ایک دوسرے سے تیز تیز آواز میں باتیں کرنے لگے۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں راکھ میں لڑکی کی ہڈیاں اور کھوپڑی نہیں ملی جس پر وہ حیران اور جھنجلائے ہوئے ہیں۔

اچانک ایک آدمی نے زمین پر پارو تی اور لڑکی کے پاؤں کے نشان دیکھ کر چیخ ماری کلہاڑی والے ہاتھ کو بلند کیا اور وہ نشان اپنے ساتھی کو بھی دکھانے لگا۔ دونوں جھک کر نشان کو دیکھنے اور پاؤں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ ادھر والے درختوں کی طرف آنے لگے۔ کیوں کہ پاؤں کے نشان انہیں ہماری طرف ہی لا رہے تھے۔ پارو تی نے مجھے کندھے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ایک کو سنبھال لوں گی۔ تم موقع دیکھ کر دوسرے کو پکڑ لینا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھوں کہ اس نے یہ کس قسم کا فیصلہ کیا ہے وہ دوڑ کر درختوں سے نکل کر ان جنگلی آدمیوں کے سامنے آ گئی۔ میں حیرت زدہ ہو کر درخت کی اوٹ میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں جنگلی وہیں سیدھے ہو کر پارو تی کو غور سے دیکھنے لگے۔ پارو تی نے لپک کر ایک آدمی کا بازو تھاما اور اسے دوسری طرف لے گئی۔ وہ جنگلی زور سے ہنس پڑا۔ اس نے اپنی زبان میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور پارو تی کو وہیں ریت پر گرا لیا۔ شاید پارو تی یہی چاہتی تھی۔ دوسرا آدمی وہیں کھڑا ان دونوں کو تکتا رہا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔

پارو تی جنگلی آدمی کے ساتھ زمین پر گرتے ہی اپنا کام کر چکی تھی۔ کیونکہ جنگلی زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پارو تی نے اٹھ کر دوسرے آدمی کو بھی اشارے سے

اپنی طرف بلایا۔ دوسرا آدمی ڈرتا ڈرتا جھکا جھکا کلہاڑی ہاتھ میں لئے پارو تی کی طرف بڑھا۔ پارو تی نے بلند آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"باہر مت نکلنا۔ میں اسے بھی نرک میں پہنچا رہی ہوں۔"

جیسے ہی دوسرا جنگلی پارو تی کے قریب آیا پارو تی نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے جیسے اسے اپنے قریب آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ جنگلی نے جھک کر اپنے ساتھی کو دیکھا جس پر پارو تی کے ہاتھوں کا قاتل زہر اپنا کام کر چکا تھا۔ جیسے ہی وہ جھکا پارو تی اس سے لپٹ گئی اور اس کی گردن میں انگلیوں کے سارے ناخن چبھو دیئے۔ دس انگلیوں کے ناخنوں کا زہر ایک دم سے جنگلی کے خون میں شامل ہوا تو اس پر سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے کلہاڑی گر پڑی۔ پارو تی نے جلدی سے کلہاڑی اٹھائی اور چار پانچ قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں جنگلی ختم ہو چکے تھے۔ پارو تی دوڑ کر میرے پاس آ گئی۔ ہم جنگلی لڑکی کے پاس گئے۔ اسے بتایا کہ اس کے دونوں دشمن ختم کر دیئے گئے ہیں۔ جب اسے دونوں کی لاشیں ریت پر پڑی ہوئی دکھائیں تو جنگلی لڑکی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ یہ خوشی کی چیخ تھی۔ وہ ہمیں سمجھانے لگی کہ کشتی ہمارے پاس موجود ہے۔ میرے ماں باپ کے جزیرے پر چلو۔ میں تمہیں وہاں لئے چلتی ہوں۔ ہم کشتی میں سوار ہو گئے۔ جنگلی لڑکی اور میں نے چپو سنبھال لئے اور کشتی سمندر میں اس جزیرے کی طرف چل پڑی جس جزیرے پر جنگلی لڑکی کے ماں باپ رہتے تھے۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہم جنگلی لڑکی کے جزیرے پر پہنچ گئے۔

لڑکی ہمیں اس جگہ لے گئی جہاں ایک پہاڑی کے دامن میں جنگلی لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ لڑکی کے ماں باپ نے لڑکی کو دیکھا تو دوڑتے ہوئے آئے اور اسے گلے لگا لیا۔ دوسرے جنگلی بھی ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے۔ لڑکی نے اپنی زبان میں ماں باپ کو ہمارے بارے میں بتایا۔ انہوں نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمیں پھل اور پھل کھانے کو دیئے۔ ایک دن اور ایک رات ہم نے ان لوگوں کے پاس گزارے۔ مشکل یہ پیش آئی کہ وہ ہماری زبان بالکل نہیں سمجھتے تھے۔

پاروتی نے بہت کوشش کر کے صرف اتنا معلوم کیا کہ یہ جزیرہ انڈونیشیا کے طویل ترین جزیرے سماترا اور ملایا کے درمیانی سمندر یعنی آبنائے ملاکا کے درمیان کا کوئی ویران جزیرہ ہے۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان کے جنوب میں نکل بیچ آ گئے ہوئے ہیں اور اب ہمیں سب سے پہلے اس زمانے کے ملایا اور آج کے ملائشیا کی بندرگاہ کوالالمپور جانا ہو گا اور وہاں سے ہندوستان تک کا سمندری سفر طے کرنا ہو گا۔ جب یہ ساری صورت حال پاروتی کو بتائی تو وہ کچھ پریشان ضرور ہوئی لیکن کہنے لگی۔

"کم از کم چلاتوں اور بحری ڈاکوؤں سے تو نجات ملی۔ اب ہم تعلیم یافتہ شہروں میں سفر کر کے انڈیا پہنچیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ان شہروں میں داخل ہونے کے لئے پاسپورٹ ویزا نہ

ہوا تو ہمیں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا جائے گا۔"

پاروتی نے بڑی عقل مندوں والی بات کی۔ کہنے لگی۔

"ان سارے ملکوں پر جاپانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ جاپانی بھاگ گئے ہیں۔ یہاں پھر سے انگریزوں کی حکومت بن گئی ہے۔ کسی نے پوچھا تو ہم کہہ دیں گے کہ ہم جنگ میں جاپانیوں کی قید میں تھے۔ ہمارے پاس پاسپورٹ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔"

میں بہت حد تک اس معاملے میں مطمئن ہو گیا۔ اب سوال اس جزیرے سے نکلنے اور ملایا کی بندرگاہ کوالالمپور پہنچنے کا تھا۔ جنگلی لوگوں نے ہمارے لئے ایک کشتی تیار کر دی جس میں چھ سات روز کا کھانے پینے کا سامان رکھ دیا۔ وہ اپنی زبان میں اور اشاروں سے ہمیں سمجھاتے رہے کہ ہمیں سمندر میں کس طرف سفر کرنا ہو گا اور کتنے دن کے بعد ہم ملایا کے ساحل پر پہنچیں گے۔ میں سخت بیزار تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"تم ہی ان کی جنگلی زبان سمجھو۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔"

پاروتی میں ایک بات میں نے دیکھی تھی کہ وہ سخت مایوسی کی حالت میں بھی پرامید ضرور رہتی تھی۔ شاید اس لئے کہ اس کا مزاج ہی ایسا ہو یا شاید یہ سانپوں کے زہر کا اثر ہو۔ کہنے لگی۔

"میں سمجھ رہی ہوں۔ تمہیں بھی سمجھا دوں گی۔"

اندھیرے ہماری کشتی جنگلیوں کے جزیرے سے سمندر میں روانہ ہو گئی۔ سب لوگ ہمیں رخصت کرنے ساحل پر جمع تھے۔ ہماری کشتی آہستہ آہستہ سمندر میں بہنے لگی۔ میں اور پاروتی دونوں چپو چلا رہے تھے۔ ساحل پر سمندر کی موجیں واپس جاتے ہوئے ہماری کشتی کو بھی اپنے ساتھ سمندر میں دور تک لے گئیں۔ جنگلی لوگوں نے جس طرف جانے کو کہا تھا ہم کشتی کو اس طرف چلا رہے تھے۔ سب سے بڑی نشانی ہمیں یہ دی گئی تھی کہ سورج ہمیشہ ہمارے عقب میں طلوع ہونا چاہئے۔ بہرحال ہم

Prepared By: S.Sohail Hussain

ایک مرتبہ پھر کھلے سمندر میں تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار ہمارے پاس کھانے پینے کا کافی سامان بھی موجود تھا اور کشتی ایسی تھی کہ سمندری موجوں کے ساتھ ہی اوپر اٹھ جاتی اور ان موجوں کے ساتھ ہی نیچے آ جاتی تھی۔ یعنی سمندری موجیں ہماری کشتی سے ٹکرا کر اسے الٹ نہیں سکتی تھیں۔ ہاں اگر سمندر میں طوفان آ جاتے تو پھر بچنا مشکل تھا۔ میں دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ یا خدا ہمیں سمندری طوفان سے محفوظ رکھنا۔

دن کے وقت ہم چلتے تھے۔ سارا دن سمندر میں کشتی چلتی رہی۔ دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے بیلوں نے کشتی میں ایک طرف ترپال کی چھت ڈال دی تھی۔ سمندر میں عام طور پر جنوبی سمندروں میں جب دھوپ چمکتی ہے تو اس کی چمک اور گرمی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ ہم سائبان کے سائے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ کشتی ایک ہی سمت میں جا رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم سورج کی سمت دیکھ کر اندازہ لگا لیتے تھے کہ ہم صحیح جانب جا رہے ہیں یا نہیں۔ ابھی تک ہم اپنے خیال میں درست سمت کو جا رہے تھے۔

ایک دن گزر گیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا۔ چوتھے دن دوپہر کے وقت ہمیں شمال مشرق کی جانب سمندر میں دور سیاہ لکیر دکھائی دی۔ پاروتی نے وہ لکیر مجھے دکھائی اور کہا۔

"یہ دھرتی ماتا کی لکیر ہے۔"

میں نے لکیر کو غور سے دیکھا۔ واقعی یہ زمین کی لکیر تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن اس لکیر کو جنگل کے درختوں کی شکل اختیار کرتے کرتے پورے دو دن لگ گئے۔ ہم ایک جگہ ساحل پر کشتی سے اتر گئے۔ اترتے ہی ہم زمین پر چت لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ جب آدمی تین چار دن سمندر میں بے یار و مددگار ایک تنہا کشتی میں سفر کرنے کے بعد زمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس وقت زمین اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت محسوس

ہوتی ہے۔ ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ وہیں تک ہم ساحل سمندر کی ریت پر لیٹے رہے۔ پھر اٹھے اور درختوں کی چھاؤں میں آ کر بیٹھ گئے۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ ہم واقعی ملایا کے ساحل پر پہنچے ہیں کہ کسی دوسرے ویران جزیرے پر آ گئے ہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم درختوں کے نیچے ایک طرف چل پڑے۔ درخت ناریل کے بھی تھے اور تاڑ اور دیودار کے بھی تھے۔ آگے جا کر ریوڑ کے درختوں کی قطاریں دیکھیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ ملایا ہی ہے۔ ایک جگہ ندی بہہ رہی تھی۔ اس کا پانی میٹھا تھا۔ سمندر میں ہم ناریل کا پانی ہی پیتے رہے تھے۔ اتنے دنوں کے بعد ندی کا میٹھا پانی پیا تو طبیعت بشاش ہو گئی۔ پھر ہم نے سب سے پہلے اپنے اپنے کپڑے ندی میں دھوئے۔ خوب نہائے۔ جب کپڑے سوکھ گئے تو انہیں پہنا اور ایک طرف روانہ ہو گئے۔ پاروتی کی بھوک تیز ہو گئی تھی۔ میں نے تو جنگلی کیلے اور ناریل کھا کر پیٹ بھر لیا تھا مگر پاروتی کی بھوک نہیں مٹی تھی۔ میں نے اسے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتے اور ناک اونچی کر کے سونگھتے دیکھا تو کہا۔

"تمہیں یہاں بہت سانپ مل جائیں گے فکر نہ کرو۔"

وہ ابھی تک فضا میں سانپوں کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری بات سن کر بولی۔

"اس طرف سے مجھے سانپوں کی بو آ رہی ہے تم یہاں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

مجبوراً مجھے وہیں بیٹھنا پڑا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد پاروتی درختوں میں سے میری طرف آئی تو وہ بڑی خوش خوش تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں کے سانپ بڑے زہریلے اور گرم ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اب مجھے یہ نہ بتانا کہ تم نے کتنے سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوایا ہے اور کتنے سانپ کھائے ہیں۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے کہا۔

"پاروتی! ہم اب شہروں میں داخل ہو رہے ہیں وہاں تمہیں اتنی آسانی سے سانپ نہیں ملیں گے۔ وہاں کیا کرو گی۔ اس لئے میری بات مانو اور یہ بری عادت ترک کر دو اور دوسرے انسانوں کی طرح زندہ رہنا سیکھو۔"

پاروتی اپنے بازو پر وہ جگہ دیکھ رہی تھی جہاں اس نے سانپ سے ڈسوایا تھا۔ وہاں مجھے تھوڑا تھوڑا خون نکلتا نظر آیا۔ کہنے لگی۔

"تم میری فکر نہ کرو۔ شہروں میں بھی سانپ مل جاتے ہیں۔ سانپ جہاں ہو گا مجھے اس کی بو آ جائے گی۔"

ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور اٹھ کر دوبارہ چلنے لگے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہاں لوگوں سے معلوم ہوا کہ ہم واقعی ملایا کے ملک میں ہیں۔ اس گاؤں کے لوگ ملائی مسلمان تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں مسلمان ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے پاروتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ میری بیوی ہے۔ ہم چیتوں کے جنگلی قیدی کیمپ سے بھاگے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ چیتوں یہاں سے دفع ہو گئے ہیں۔"

گاؤں کے ملائی مسلمانوں نے ہمیں کھانا کھلایا۔ ہمیں نئے کپڑے پہننے کو دیئے۔ میں نے کرتے کے اوپر دھوتی باندھ لی۔ جس طرح ملایا کے دیہاتی مسلمان باندھا کرتے ہیں۔ پاروتی کو بھی انہوں نے اسی قسم کا لباس دیا جو اس نے پہن لیا۔ ہمیں نئے جوتے بھی دیئے۔ ہم دو دن وہاں ملائی مسلمانوں کے مہمان رہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ سامنے والی پہاڑیوں کے پیچھے ہمیں ایک سڑک ملے گی جو ہمیں مغرب کی طرف ایک شہر میں پہنچا دے گی وہاں ریلوے سٹیشن ہے۔ جہاں سے ہم گاڑی میں بیٹھ کر کوالالمپور پہنچ سکتے ہیں۔

رخصت کرتے ہوئے ان نیک دل ملائی مسلمانوں نے ہمیں کچھ رقم بھی دی۔ ہم

ان کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے اور سامنے والی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ سارا دن چلتے رہے سورج غروب ہو رہا تھا کہ ہم پہاڑیوں کی دوسری جانب سڑک پر آ گئے۔ یہ کشادہ اور پختہ سڑک تھی۔ سڑک پر سے ٹرک اور فوجی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ان فوجی گاڑیوں میں جاپانیوں کے بجائے انگریز فوجی بیٹھے نظر آتے تھے۔ ہمیں ایک ٹرک والے نے اپنے ٹرک میں بٹھا لیا۔ شام کو ہم ایک شہر میں پہنچے جس کا نام میں اب بھول گیا ہوں۔ سٹیشن پر جا کر معلوم ہوا کہ کوالالمپور کو رات کے وقت گاڑی چلتی ہے۔ ہم وہیں سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ پاروتی نے ملائی مسلمان عورتوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میں اس لباس میں کیسی لگتی ہوں؟"

میں نے کہا۔ "اتنی بری نہیں لگتی ہو۔"

وہ بڑی لگاوٹ سے میرے قریب ہو کر بولی۔

"تم نے مجھے اپنی بیوی کہا ہے تو کیوں نہیں مجھ سے بیاہ کر لیتے؟ میں تمہاری بڑی سیوا کروں گی۔"

میں نے اس سے کہا کہ تم سے شادی کر کے تو میں سانپوں سے بھرے ہوئے کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں۔ میں نے اسے جواب دیا۔

"کوئی اور بات کرو پاروتی۔"

وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چیز تلاش کر رہی ہے۔ میں نے کچھ نہ پوچھا اور خاموش رہا۔ وہ کچھ بے چین ہونے لگی میں پھر بھی جان بوجھ کر چپکا ہو کر بیٹھا رہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "میں ذرا باتھ روم تک جا رہی ہوں۔"

اگرچہ وہ تقریباً جنگلی لڑکی بن چکی تھی اس کے باوجود وہ ایک بڑے شہر کی رہنے والی تھی۔ وہ شہر کے ادب آداب اور تمدن کو پوری طرح سمجھتی تھی۔ مگر مصیبت یہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

تھی کہ وہ شہر میں جنگل کی خوراک تلاش کرنے جا رہی تھی۔ قریب ہی ریفرشمنٹ روم تھا۔ وہ اس کے اندر چلی گئی۔ کوالالمپور کو جانے والی ٹرین کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ پاروتی ریفرشمنٹ روم سے باہر آئی تو بدستور بے چین تھی۔ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ "تمہیں کیا تکلیف ہے کہ اپنی بری عادت چھوڑو۔ شہر میں تمہیں اتنی آسانی سے سانپ نہیں ملیں گے۔"

پاروتی نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے پھنکار کی سی آواز نکلی۔ وہ پکی جنگل والی ڈائن بن گئی تھی۔

"مل جائیں گے سانپ۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ سانپ خود مجھے تلاش کر کے میرے پاس آ جائیں گے۔"

میں اٹھ کر کاؤنٹر پر چلا گیا جہاں سگریٹ فروخت ہوتے تھے۔ ایک پیکٹ سگریٹ خریدا۔ سگریٹ سلگایا اور بنچ پر پاروتی کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے سگریٹ پینے لگا۔ دل میں تھوڑی سی تشویش بھی تھی کہ اگر پاروتی کو کوئی سانپ نہ ملا تو کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے۔ سانپ اس کے جسم کا اس کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ سٹیشن پر کافی رونق تھی۔

پاروتی نے اپنا چہرہ پلیٹ فارم کے جنوبی سرے کی طرف کیا اور کچھ سونگھنے لگی۔ پھر میرا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔

"میرے ساتھ آؤ۔ ایک سانپ مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے۔"

میں نے دل میں کہا یا خدا خیر ہو۔ یہ شہر ہے۔ کہیں یہ عورت مجھے کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔ مجبوراً اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ پاروتی کی حس اسے دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جس طرف وہ جا رہی ہے ادھر کہیں نہ کہیں کوئی سانپ ضرور ہو گا۔ ٹرین کے چلنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو یہ تماشہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ پلیٹ فارم جہاں ختم ہوتا تھا وہاں ایک طرف ایک کیبن بنا ہوا تھا۔

شاید یہ ریلوے کا کوئی سودا وغیرہ تھا۔ پاروتی نے اس کیبن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"سانپ اس طرف ہے۔"

کیبن کے آگے تھوڑی سی جگہ تھی جہاں کیلے کے درخت اور گھاس وغیرہ اگی ہوئی تھی۔ وہاں صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ زیادہ روشنی نہیں تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو ایک چوکیدار کیبن سے نکل کر آ گیا۔ اس نے ملائی زبان میں ہم سے کچھ پوچھا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں اسے بتایا کہ ہم نے یہاں ایک سانپ دیکھا ہے۔ اس کو مارنا چاہتے ہیں تاکہ کسی مسافر کو نہ ڈس دے۔ چوکیدار ہندوستانی زبان سمجھ لیتا تھا۔ سانپ کا سن کر وہ بھی خوف زدہ سا ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"کہاں دیکھا تھا سانپ؟"

اس کے پاس ایک ڈنڈا تھا۔ پاروتی نے کہا۔

"تم اس طرف جا کر بیٹھو۔ ہم خود سانپ کو ڈھونڈ کر مار دیں گے۔ کہیں سانپ تمہیں نہ کاٹ لے۔"

چوکیدار پہلے ہی خوف زدہ تھا۔ وہ جلدی سے گھاس اور درختوں میں سے نکل کر دور چلا گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"میں بھی ادھر چلا جاتا ہوں کہیں سانپ نے مجھے ڈس لیا تو میں تاحیر میں مارا جاؤں گا۔"

پاروتی نے بڑے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"کسی سانپ میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ میرے پیارے دوست کو کاٹے۔ میں تو اسے کچا چبا جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو تم ویسے بھی اسے کچا چبا جاؤ گی۔ میں اس طرف جاتا ہوں۔"

میں بھی وہاں سے دور ہٹ گیا۔ اچانک پاروتی ایک طرف کو جھکی جھکی دوڑ پڑی۔ میں سمجھ گیا۔ اس نے سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ وہیں غائب ہو گئی۔ جب اسے کافی دیر لگ گئی تو چوکیدار میرے پاس آ کر کہنے لگا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"کہیں تمہاری عورت کو سانپ نے نہ کاٹ لیا ہو۔"

میں نے کہا۔ "وہ سانپ کو ختم کر کے ہی آئے گی۔"

اور واقعی پاروتی سانپ کو پورے کا پورا ختم کر کے ہی آئی۔ وہ خالی ہاتھ تھی اور بڑی پریشان پریشان تھی۔ کہنے لگی۔

"میں نے سانپ کو مار دیا ہے۔"

چوکیدار نے اطمینان کا سانس لیا۔

ہم واپس پلیٹ فارم پر آ گئے۔ میں نے پاروتی سے پوچھا۔

"سانپ ایک تھا یا دو؟"

وہ افسوس کے ساتھ بولی۔

"ایک ہی تھا۔ کاش دو تین ہوتے۔ لیکن کافی زہریلا سانپ تھا۔"

میں نے دل میں سوچا کہ شہر میں جانے سے ایک فائدہ تو ضرور ہو گا کہ وہاں کے سارے سانپ ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔ وہاں سے ہم تو ہی رات کو ٹرین میں سوار ہوئے اور باقی کی ساری رات اگلا سارا دن اور اس کے بعد رات کا سفر کرنے کے بعد تیسرے دن صبح سویرے ملایا کے سب سے بڑے شہر کوالالمپور پہنچ گئے۔ وہیں سٹیشن پر ہم نے ناشتہ کیا۔ پاروتی کو سانپوں کی تلاش تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"خدا کے لئے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو۔ یہ شہر ہے یہاں اتنی جلدی سانپ نہیں ملیں گے۔"

یہاں سے ہمیں سمندری جہاز میں سوار ہو کر انڈیا جانا تھا۔ یہ چھ ایک دن کا سمندری سفر تھا۔ اس زمانے میں سمندری جہازوں کی رفتار زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ ہمارے پاس کافی رقم تھی جو گاؤں کے ملائی مسلمانوں نے آپس میں چندہ کر کے ہمیں دی تھی۔ ہم نے شہر کے ایک چھوٹے سے غریبانہ ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو میاں بیوی ظاہر کیا۔ میں پاروتی کو ہوٹل میں چھوڑ کر بندرگاہ کی طرف

روانہ ہو گیا تاکہ پتہ کروں کہ ہندوستان کو جہاز کس روز روانہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ پرسوں ایک جہاز دوپہر کے بعد روانہ ہونے والا ہے۔ اس کے ٹکٹ بندرگاہ کے ساتھ ہی ایک آفس میں فروخت ہوتے تھے۔ میں نے وہاں سے جہاز کے تھرڈ کلاس کے کوالالمپور سے کلکتے تک کے دو ٹکٹ خرید لئے۔

دن بھر ہم شہر کی سیر وغیرہ کرتے رہے۔ رات کو ہوٹل میں واپس آئے تو پاروتی کا جسم ایک بار پھر ٹوٹ رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"تم ہوٹل میں بیٹھو میں باہر جا کر اپنی خوراک تلاش کرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "پاگل ہو گئی ہو۔ یہ شہر ہے جنگل نہیں۔"

وہ بولی۔ "یہاں باغ بہت ہیں۔ ان علاقوں کے باغوں میں سانپ بچھو اکثر مل جاتے ہیں میں ابھی واپس آ جاؤں گی۔"

اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

وہ کوئی دو گھنٹے بعد واپس آئی تو بڑی خوش تھی۔ کہنے لگی۔

"بچھو مل گئے۔ دو میں نے وہیں کھا لئے دو اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔"

میں اچھل کر پلنگ پر چڑھ گیا۔

"ان کو یہاں کیوں لے آئی ہو؟"

وہ تیز لہجے میں بولی۔

"کل کیا کھاؤں گی۔ کل کس سے اپنے کو ڈسواؤں گی تم سے؟"

میں چپ ہو گیا۔ اس نے دونوں سانپ اپنی قمیض کے اندر چھپائے ہوئے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دونوں سانپ نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ دونوں سیاہ رنگ کے ایڑھ بالشت لمبے سانپ تھے اور پاروتی کے ہاتھوں میں تڑپ رہے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں ایک چھوٹی میز پر ایک تانبے کا گلاس پڑا تھا۔ پاروتی نے دونوں سانپ میز پر رکھ کر جلدی سے ان کے اوپر گلاس اوندھا رکھ دیا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"یہ بھگوان۔ یہاں شہر کے باغوں درختوں کے سانپ بڑے زہریلے ہیں۔ دیکھو۔ میرے بازو پر ان کے کاٹنے سے خون نکل آیا ہے۔"

وہ مجھے اپنا بازو دکھانے لگی۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"خدا کے لئے مجھے یہ منظر نہ دکھاؤ۔"

پاروتی بازار سے ایک چھوٹا سا تھیلا خرید لائی جس کے اوپر زپ لگی تھی۔ زپ سے تھیلا بند ہو جاتا تھا۔ اس نے دونوں سانپ تھیلے میں ڈال کر زپ سے اس کا منہ بند کر دیا۔

"اب دو دن کے لئے میرے پاس میری خوراک جمع ہو گئی ہے۔"

دونوں دن پاروتی نے ایک ایک سانپ پر گزارہ کیا۔ جس روز شام کو ہمیں کوالالم پور سے کلکتے کے لئے روانہ ہونا تھا اس روز دوپہر کے بعد پاروتی ریزے کے درختوں اور شہر کے غیر آباد علاقوں کی طرف نکل گئی اور تھیلے میں اکٹھے چھ سات سانپ بھر کر لے لئے کہنے لگی۔

"جہاز میں میرے ہم آئیں گے۔"

اس زمانے میں سمندری جہاز پر سوار ہوتے وقت سامان کی چیکنگ وغیرہ نہیں ہوتی تھی۔ کسی نے نہ پوچھا اور پاروتی سانپوں کے تھیلے سمیت جہاز پر سوار ہو گئی۔ شام کے وقت جہاز نے بندرگاہ سے لنگر اٹھا دیا۔ اسے ایک بڑا سٹیمر لوہے کی زنجیر سے کھینچتا ہوا گہرے پانیوں میں لے گیا۔ وہاں جہاز کے انجن سٹارٹ ہو گئے اور جہاز سمندر میں اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جس روز ہم روانہ ہوئے اس روز بھی بارش ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہم نے اپر ڈیک کی بجائے لوئر ڈیک میں اپنے بستر لگا لئے تھے۔ سمندر میں کافی تموج تھا۔ ساری رات سارا دن جہاز میں رونق ہوتی رہی۔ پاروتی روزانہ دن کے وقت تھیلے میں سے ایک سانپ نکال کر اسے قمیض کے اندر چھپا کر جہاز کے باتھ روم میں ساتھ لے جاتی اور اس سے اپنے آپ کو خوب ڈسوا کر اور اسے ہڑپ کرنے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر اشاش بشاش واپس آ جاتی۔ کوالالم پور سے چلے ہوئے ہم چار دن

کے بعد رنگون پہنچے۔

جہاز پورا ایک دن رنگون کی بندرگاہ پر کھڑا رہا۔ یہاں کچھ مسافر اتر گئے اور کچھ سوار ہو گئے۔ ان میں بنگالی مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ میں بنگلہ زبان بول اور سمجھ لیتا تھا۔ پاروتی تو تھی ہی بنگالن۔ ہمارے ڈیک پر بھی کچھ بنگالی کنبے اپنا سامان لے کر آ گئے تھے۔ میں نے پاروتی سے کہا کہ ان لوگوں سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرنا مگر ایک مدت کے بعد اسے اپنے ہم زبان لوگ ملے تھے۔ ایک بنگالی میاں بیوی ہمارے پاس ہی سامان لگا کر بیٹھے تھے۔ پاروتی اس کی بیوی سے بنگالی زبان میں خوب باتیں کرنے لگی۔ یہ بنگالی جوڑا نوجوان ہی تھا مگر زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ پاروتی ان سے خوب گھل مل گئی۔ میں نے سوچا کہ چلو اس کا دل لگا رہے گا۔ اب اسے کچھ دنوں کے بعد تو اپنے ماتا پتا کے پاس پہنچ ہی جانا ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ پاروتی کو کلکتے میں اس کے گھر چھوڑ کر میں بھی اپنے صوبہ پنجاب کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ مجھے بھی اپنے گھر سے نکلے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔ رنگون سے کلکتے پہنچنے میں جہاز نے پورے تین دن لگائے۔ چوتھے روز دن کے وقت جہاز کلکتے کے دریائے ہگلی میں داخل ہو گیا۔ پاروتی اپنے شہر کا ساحل اور ساحل کے درختوں اور اڑتے پرندوں کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ ہم اوپر والے ڈیک پر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ پاروتی کوئی بنگلہ گیت گنگنانے لگی۔ وہ بڑی خوش تھی کہ ایک مدت کے بعد اپنے ماتا پتا کی شکل دیکھے گی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"وہ مجھے دیکھ کر کس قدر خوش ہوں گے۔ کیا وہ مجھے پہچان لیں گے؟ کیوں نہیں۔ مجھے میری ماتا جی میرے باپو جی ضرور پہچان لیں گے۔ میں بڑی بدل گئی ہوں نا۔ پہلے میرا رنگ اتنا کالا کہاں ہوتا تھا۔ اب میں بڑی کالی ہو گئی ہوں۔"

میں نے اس کو کہا۔

"پاروتی! اپنے بھگوان کے لئے میری ایک بات مان لو اور گھر پہنچ کر سانپوں کی دوستی چھوڑ دینا۔ ذرا سوچو۔ تمہارے ماتا پتا کو جب پتہ چلے گا کہ تم سانپ کھاتی اور

Prepared By: S.Sohail Hussain

ساتھیوں سے اپنے آپ کو اسواتی ہو تو انہیں کتنا دکھ ہو گا۔"

پاروتی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ میں گھر جانے کے بعد یہ عادت چھوڑ دوں گی۔"

تیسرے پہر جلد نکلنے کی نظر پر، بیٹی کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ ہمارے پاس کوئی سامان تو تھا نہیں۔ بندرگاہ سے نکل کر ایک ٹیکسی لی اور پاروتی نے اسے اپنے محلے کا پتہ بتا کر وہاں چلنے کو کہا۔ جب ہم اس محلے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ پاروتی کے ماتا پتا تو ایک عرصہ ہوا مکان چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ پاروتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اپنے مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

پاروتی کے مکان میں کوئی دوسرے کرایہ دار آ گئے ہوئے تھے۔ ہمسایوں میں سے بھی اکثر لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ پاروتی کے ماں باپ کس شہر میں نقل مکانی کر گئے ہیں۔ پاروتی انتہائی غمزدہ ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"شہر میں تمہارا کوئی رشتے دار ہے تو چلو وہاں چل کر پوچھ لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے ماتا پتا کا انہیں کچھ علم ہو۔"

پاروتی نے کہا۔ "شہر میں ہمارا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔"

میں بھی بڑی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ پاروتی کو میں اتنے بڑے شہر میں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے قیام کا اعلان ہو چکا تھا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں فرقہ وارانہ ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ کلکتہ شہر کی فضا بھی خراب تھی۔ یہ سب کچھ ہمیں وہیں پاروتی کے پرانے محلے کے بنگالی ہندوؤں نے بتایا۔ ایک بنگالی عورت نے پاروتی سے کہا کہ تم درگا ماتا کے مندر میں چلی جاؤ۔ رات وہاں گزارو۔ صبح اپنے ماتا پتا کا شہر میں کھوج لگانا۔ پاروتی نے وہاں مجھے اپنا خاوند ہی ظاہر کیا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ لوگ مجھے بھی ہندو ہی سمجھ رہے تھے۔ بعد میں پاروتی نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ بتا رہے تھے کہ ایک روز پہلے ان کے محلے میں دو مسلمان آ گئے تھے۔ محلے کے ہندو بنگالیوں نے ان دونوں کو چھرے مار کر مار ڈالا تھا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

پاروتی ابھی تک اپنی گلی میں مکان کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے۔ اس نے اداس آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"تم اپنے وطن جانا چاہتے ہو تو بے فکر چلے جاؤ میں کسی۔ کسی طرح زندگی بسر کر لوں گی۔"

میرے دل پر اس کے اس جملے کا بڑا اثر ہوا۔ اصل میں مجھے بھی پاروتی کے ساتھ ایک خاص انس سا پیدا ہو گیا تھا۔ آخر ہم اتنی مدت تک مصیبتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ اب اس حالت میں چھوڑ کر جانا میں مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کہا۔

"پاروتی! میں اس حالت میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"تم میری خاطر اپنے آپ کو مشکل میں کیوں ڈالتے ہو؟"

میں نے کہا "بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم کسی اپنے رشتے دار کا ہی ٹھکانہ بتا دو۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

وہ کہنے لگی۔ "دلی میں میری ایک خالہ رہتی تھی۔ شاید ماتا جی وہاں چلی گئی ہوں۔"

"تو چلو دلی چلتے ہیں۔"

ہم گلی میں سے نکل کر بازار میں آ گئے۔ پاروتی کہنے لگی۔

"میں کلکتے میں ناگن ماتا کے مندر میں ایک بار درشن کے لئے ضرور جانا چاہتی ہوں تم میرے ساتھ چلو۔"

"یہ ناگن ماتا کا مندر کہاں ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے۔ میں ایک دو بار وہاں جا چکی ہوں۔ یہاں سے رکشا لیتے ہیں۔"

ناگن ماتا کا مندر کلکتہ شہر کے شمالی مضافات میں بانس اور ناریل کے جھنڈوں کے

پاس ایک ندی کے کنارے پر تھا۔ ایسا ہی مندر تھا جیسا کہ بنگال میں ہندوؤں کے مندر ہوتے ہیں۔ کافی ہندو مرد عورتیں وہاں نظر آ رہی تھیں۔ مندر کے بڑے دروازے پر ایک سانپ کا مجسمہ لگا تھا جس کا نچلا دھڑ سانپ کا اور اوپر والا دھڑ عورت کا تھا۔ پاروتی نے بتایا کہ یہ ناگن ماتا کی مورتی ہے۔ مجھے اس کی ناگن ماتا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ پاروتی کو اس کے رشتے داروں کے پاس پہنچا کر اپنے شہر امرتسر کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ مجھے یہ اطمینان ضرور ہونا چاہئے تھا کہ پاروتی محفوظ جگہ پر پہنچ گئی ہے۔ میرا اس کا اتنی دیر کا ساتھ تھا۔ ہم نے بڑی مصیبتوں کے دن دیکھے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جاتا۔

پاروتی نے مجھے ہندو ظاہر کیا ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ مندر میں لے گئی۔ وہاں اسے ایک جوگن عورت ملی۔ اس نے دور سے پاروتی کو دیکھا تو اس کے پاس آ گئی۔ عمر چالیس سے اوپر ہو گی۔ رنگ اس کا بھی کالا تھا۔ بال کھلے تھے۔ ماتھے پر سرخ تلک لگا تھا۔ کیسری ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے پاروتی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بنگلہ زبان میں کہا۔

"بیٹا میرے ساتھ چل، تجھے ناگن ماتا کا آشیرباد دلاؤں۔"

پاروتی نے مجھے ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس جوگن کے ساتھ مندر کے بڑے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں ایک طرف درخت کے نیچے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر کے بعد پاروتی واپس آئی۔ وہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید اسے اپنی ماتا پتا کا ٹھکانہ معلوم ہو گیا ہے۔ میرے پاس آئی تو میں نے پوچھا۔

"یہ جوگن کون تھی؟ کیا اس نے تمہیں تمہارے ماتا پتا کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟"

پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک طرف لے گئی۔ کہنے لگی۔

"تمہیں ایک راز کی بات بتانا چاہتی ہوں۔ مگر یہاں نہیں۔ اس طرف آ جاؤ۔ ان

Prepared By: S.Sohail Hussain

درختوں کے نیچے چل کر بیٹھتے ہیں۔"

کچھ فاصلے پر گھاس کا چھوٹا سا قطعہ تھا جہاں بادیل اور املی کے درختوں نے چھتریاں ڈال رکھی تھی۔ کلکتے کا آسمان اس روز ابر آلود تھا۔ ہم ان درختوں کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔

"اب بتاؤ وہ راز کی بات کیا ہے؟"

راز کی بات جو مجھے پاروتی نے بتائی وہ بڑی حیرت ناک اور ناقابل یقین تھی۔ جوگن جو پاروتی کو مندر میں لے گئی تھی ناگن ماتا کی بھکشنی تھی۔ اس نے پاروتی کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ لڑکی سانپوں سے اپنے آپ کو اسواتی ہے اور سانپ کھاتی ہے اور ایک عرصے سے یہ کام کر رہی ہے۔ اس نے پاروتی کے آگے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا۔ اس نے پاروتی سے کہا کہ تم اپنی طاقت سے بے خبر ہو۔ تم ایک مدت سے سانپ اسواری ہو اور سانپ کھا رہی ہو۔ تم کو معلوم نہیں کہ برما کے جنگلوں میں تم نے بے خبری میں ایک ایسا سانپ مار کر کھا لیا تھا جو ناگن ماتا کے دشمن قبیلے کا سب سے بڑا سانپ تھا اور جس کا نام چوم گری سانپ تھا۔ اس سانپ نے تمہارے خون میں ایک ایسی طاقت پیدا کر دی ہے کہ اگر تم تین راتیں ایک خاص چلہ کرو تو ناگن ماتا کی کرپا سے تمہارے اندر ایسی شکتی آ جائے گی کہ تم جس وقت چاہو انسان سے ناگن کا روپ بدل سکو گی اور ناگن سے انسان کی شکل میں بھی واپس آ سکو گی۔۔۔

جوگن عورت نے پاروتی کو یہ بھی بتایا کہ چونکہ تم نے ناگن ماتا کے دشمن سانپ کو ہلاک کر کے کھایا تھا اس وجہ سے ناگن ماتا تم سے بہت خوش ہے اور تین راتوں کا چلہ کاٹنے کے بعد وہ تمہیں درشن بھی دے گی اور تمہیں انسان سے ناگن اور ناگن سے دوبارہ انسان کا روپ اختیار کرنے کی شکتی بھی دے دے گی۔

جب پاروتی مجھے ساری رام کہانی سنا چکی تو میں نے مذاق میں کہا۔

"پاروتی! اس کا مطلب ہے کہ اب تم خود سانپ بننے والی ہو۔ دیکھنا سانپ بن کر

کہیں مجھے نہ ڈس دینا۔"

پاروتی نے کہا۔

"تم اسے مذاق مت سمجھو۔ جوگن میا نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ بھی ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچو اگر مجھے یہ شکتی یہ طاقت مل گئی کہ میں جب چاہے انسان سے ناگن اور ناگن سے دوبارہ انسان بن جاؤں تو میری زندگی میں کتنا بڑا انقلاب نہیں آ جائے گا۔ میں دنیا کی سب سے انوکھی عورت بن جاؤں گی۔ کیونکہ آج تک ایسی عورت کسی نے نہیں دیکھی ہو گی۔"

مجھے اس کی باتوں پر ذرا بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن مجھے اس کی خوشنودی منظور تھی۔ میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"اب یہ بتاؤ کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

پاروتی بولی۔ "میں ناگن ماتا کے مندر میں تین راتوں کا چلہ کاٹوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو چلہ کاٹ کر دیکھ لو۔ میں اتنی دیر اپنے دوست کے ہاں چلا جاؤں گا اس کا فلیٹ لوئر چیت پور روڈ پر ہے۔"

پاروتی نے میرے بازو کو تھام کر اپنا سر میرے ساتھ لگا دیا۔

"تم میرے سچے دوست ہو۔ بس میں آج رات ہی سے چلہ شروع کر دوں گی۔ جوگن میری مدد کرے گی۔"

میں نے اسے کہا۔

"ذرا ہوشیار رہنا۔ کہیں یہ اس جوگن عورت کی کوئی چال نہ ہو۔ کہیں یہ بھی شمشالی سپیروں کی کوئی پھوپھی خالہ نہ ہو۔"

پاروتی نے گردن اونچی کر کے کہا۔

"اب میں وہ بیوقوف بھولی بھالی پاروتی نہیں ہوں۔ میں شمشالی سپیروں کے پورے خاندان کو ختم کر سکتی ہوں۔ مجھے کوئی سپیرا ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔۔۔"

میں پاروتی کو مندر میں چھوڑ کر لوئر چیت پور روڈ اپنے پرانے دوست جان کے

Prepared By: S.Sohail Hussain

پاس آ گیا۔ وہ مجھے حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

"تم اتنی دیر کہاں غائب رہے؟"

میں نے کہا۔ "بمبئی میں تھا اور کہاں جاتا۔ بمبئی ایکٹر بنے گیا تھا۔ اتنی مدت مارا مارا پھرتا رہا۔ کام نہ ملا۔ واپس آ گیا۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟ یہاں کلکتے میں تو فضا بڑی خراب ہو رہی ہے۔ پاکستان بن گیا ہے۔ میں تو پاکستان چلا جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی پاکستان چلا جاؤں گا۔"

جان نے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ بمبئی وغیرہ کی طرف مت جانا۔ وہاں بھی فسادات شروع ہو گئے ہیں۔ پنجاب میں تو بڑے زبردست فسادات ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم یہاں سے رنگون چلے چلیں گے وہاں سے کسی سمندری جہاز میں بیٹھ کر کراچی پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ بالکل صحیح پروگرام ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کب پاکستان چلنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ تین راتیں چلہ پورا کرنے کے بعد میں پاروتی کو لے کر اس کے رشتے داروں کے پاس دلی پہنچا دوں گا اور جس طرح بھی ہو سکے گا خود دلی سے پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ اپنے دوست کو میں نے یہ سب بالکل نہیں بتایا تھا۔ اس لئے میں اس کی ہاں میں ہاں ملائے جاتا تھا۔

تین راتیں میں نے اپنے دوست کے فلیٹ پر گزاریں۔ تین راتیں پاروتی ناگن ماتا کے مندر میں چلہ کاٹتی رہی۔ اس نے مجھے کہہ دیا کہ میں اس دوران مندر میں نہ آؤں۔ مجھے مندر میں جانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی مندر کی گھٹی گھٹی تنگ فضا میں ہمیشہ مجھے دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے مندر تنگ گھٹے ہوئے اور حبس آلود ہوتے ہیں۔ تنگ کوٹھڑیاں تنگ راہ داریاں اور بچی بچی چھتیں اور فضا میں پھیلی ہوئی لوبان کی تیز بو ——— جب کہ مسلمانوں کی عبادت گاہیں فراخ

کشادہ اور کھلی ہوتی ہیں۔ اس سے دونوں قوموں کے کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تین راتوں کے بعد صبح کے وقت میں ناگن والے مندر میں گیا۔ پاروتی نے مجھے جس جگہ بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا تھا میں وہاں بیٹھ گیا۔ میں نے پاروتی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ پہلی نظر میں میں نے اسے بالکل نہیں پہچانا۔ اس نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ سر کے بال شانوں پر کھلے تھے۔ ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کا ہار تھا۔ قریب آئی تو میں نے اسے پہچانا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"چلہ کاٹ لیا پاروتی؟"

وہ میرے سامنے گھاس پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ویسے تو ہر وقت ایک خاص قسم کی خوفناک سی چمک رہا کرتی تھی مگر اس وقت اس کی آنکھیں ہلکی ہلکی سرخ بھی ہو رہی تھیں۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اس کا ہاتھ گرم تھا۔ کہنے لگی۔

"میرا چلہ کامیاب رہا۔"

"کیا مطلب؟ یعنی اب تم انسان سے ناگن اور ناگن سے انسان بن سکتی ہو؟"

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ پاروتی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تم مجھے بہت عزیز ہو۔ تم نے ہر مصیبت میں میرا ساتھ دیا ہے۔ میں تمہارے کردار کی عظمت سے بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ واقعی مسلمان کے کردار میں ایک خاص شرافت اور عظمت ہوتی ہے جس کا مجھے تمہارے ساتھ رہ کر تجربہ ہوا ہے۔ میں جانتی ہوں جب تم مجھے انسان سے سانپ اور سانپ سے واپس انسان بنتے دیکھو گے تو اسے بھی شعبدہ بازی ہی سمجھو گے۔ یقین کرو یہ شعبدہ بازی ہی ہو گی لیکن عام آدمی کے لئے یہ ایک حقیقت ہو گی۔ یہ علم جس کے منتروں کا جاپ کر کے میں نے انسان سے ناگن بن جانے کی طاقت حاصل کی ہے شیطانی علم ہے۔ شیطان اس علم کی مدد سے انسانوں کو گمراہ کرتا ہے اور خدا سے انہیں دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے یوں سمجھ لو کہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں اس علم کی طاقت کرنے کے ساتھ ہی شیطان کے گروہ میں شامل ہو گئی ہوں۔ اتنا ضرور ہے کہ میرے اندر جو انسانیت ہے اس کا احساس زندہ ہے اور ناگن بن کر بھی زندہ رہے گا۔"

میں نے پاروتی کی باتیں سن کر کہا۔

"پاروتی! تم کبھی کبھی سچائی کی باتیں کرتی ہو تم بہت تھوڑی ہندو ہو۔ زیادہ مسلمان ہو۔ پھر تم پوری مسلمان کیوں نہیں ہو جاتی؟"

پاروتی زمین کو تکنے لگی۔ پھر میری طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور بولی۔

"بہت تھکی ہے اب یہ وقت بھی آ جائے۔ لیکن ابھی مجھے شیطان کے ساتھ رہ کر اس کی شکتی کی مدد سے اپنے دشمنوں سے بدلہ لینا ہے۔ اپنے ماتا پتا کا سراغ لگانا ہے اس کے بعد مجھے لگتا ہے کہ میرا راستہ وہی ہو گا جس پر تم چل رہے ہو۔"

میرے دل میں پاروتی کے لئے مزید احترام کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اس لڑکی نے ظلم کی انتہا نہیں دیکھی تھی۔ جتنی زندگی اس نے بسر کی تھی ساری کی ساری دکھوں مصیبتوں اور درد و آلام سے بھری ہوئی تھی۔ ان مصیبتوں اور آفتوں نے پاروتی کو ایسا علم سکھا دیا تھا جس نے اس کے دل کے ایک کونے کو ضرور روشن کر دیا تھا۔ یہی روشنی ایک دن پاروتی کے سارے دل کو روشن کرنے والی تھی۔ یہ وہ عورت تھی جو مرنے کے لئے جنوبی بنگال کے جنگلوں میں اکیلی چھوڑ دی گئی تھی۔ جس کے جسم کو سانپوں نے کاٹ کاٹ کر زہر بنا دیا تھا مگر اس عورت کے اندر زندہ رہنے اور بہتر زندگی بسر کرنے کی جو تڑپ تھی اور اس تڑپ نے اس کے ارادوں کو جو طاقت دی تھی اسے کوئی بھی نہ مار سکا تھا۔ یہی وہ طاقت اور توانائی تھی جو پاروتی کو ایک نئی زندگی کی نئی منزل کی طرف لئے جا رہی تھی۔

میں نے پاروتی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"چلو اب انسان سے سانپ بن کر دکھاؤ۔"

پاروتی ایک لمحہ کے لئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے گھورتی رہی۔ اس

کی آنکھوں میں واقعی ایک ہی مقناطیسی کشش پیدا ہو گئی تھی۔

"یہاں نہیں۔۔۔ میرے ساتھ مندر کے پیچھے آؤ۔"

وہ مجھے لے کر مندر کے پیچھے آ گئی۔ یہاں چھوٹا سا تالاب تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں تالاب کی سطح تک جاتی تھیں۔ تالاب کے کونے میں ایک بستی تھی۔ اس بستی کے ساتھ اونچی اونچی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ دن کا وقت تھا مگر اس طرف دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ پاروتی نے ان جھاڑیوں کے درمیان مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"مجھے عورت سے سانپ بنتے دیکھ کر تم ڈر تو نہیں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "ڈروں گا شاید نہیں مگر حیران ضرور ہوں گا لیکن پہلے تم سانپ تو بنو۔"

پاروتی کہنے لگی۔

"ایک بات یاد رکھنا جس وقت میں ناگن کے روپ میں ظاہر ہو گی تو میں تمہاری بات تو سن لوں گی لیکن تم میری بات نہ سمجھ سکو گے کیونکہ میں اس وقت سانپوں کی زبان میں ہی بات کر سکوں گی۔"

"کیا سانپوں کی بھی کوئی اپنی زبان ہوتی ہے؟"

پاروتی مسکرائی۔

"سانپ ہلکی ہلکی سسکاروں اور دھیمی دھیمی پھنکاروں کی زبان میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ اگر ہم کچھ دیر اور ایک دوسرے کے ساتھ رہے تو میں تمہیں یہ زبان بھی سمجھا دوں گی۔۔۔ لو۔۔۔ اب مجھے ناگن کے روپ میں دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

میرے دل میں یہ خیال بھی تھا کہ پاروتی مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ یہ خیال بھی آ جاتا تھا کہ اس کے پاس کوئی شیطانی منتر آ گیا ہے اور شیطان کئی شکلیں بدل کر انسانوں کے سامنے ظاہر ہو جایا کرتا ہے ہو سکتا ہے یہ انسان سے سانپ بن جائے۔ میں

Prepared By: S.Sohail Hussain

بیٹھی اور بے یقینی کے عالم میں پاروتی کے سامنے بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جوگیوں کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور منہ ہی منہ میں کسی منتر کا جاپ شروع کر دیا۔

آج بھی جب میں یہ سطریں لکھتے ہوئے اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ جو کچھ دیکھا وہ واقعی وقوع پذیر ہوا ہو۔ میرا خیال ہے کوئی تین چار منٹ تک پاروتی منہ ہی منہ میں منتروں کا جاپ کرتی رہی۔ پھر اس کا جسم آگے پیچھے اور دائیں بائیں آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے منہ سے سسکاریوں ایسی آوازیں نکلنے لگیں۔ سچ کہہ رہا ہوں میں خوف زدہ ہو گیا۔ سوچا اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ یہ ہندو لڑکی کیا کہے گی کہ میں مسلمان کا بچہ ہو کر ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ بمشکل مزید ایک منٹ گزرا ہو گا کہ پاروتی کے حلق سے چیخ کی آواز نکلی اور وہ غائب ہو گئی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا کیونکہ جس جگہ پر وہ بیٹھی ہوئی تھی اب وہاں سیاہ رنگ کا ایک سانپ کنڈلی مارے "پھن کھولے بیٹھا جھوم رہا تھا۔ خوف کے مارے ایک بار تو میرا حلق خشک ہو گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ ایک عورت میری آنکھوں کے سامنے غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ سانپ آ گیا تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ دائیں بائیں پھن لہرا رہا تھا اور اپنی دوشاخہ زبان بار بار باہر نکال رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سنبھالا کہ ممکن ہے یہ پاروتی کے شیطانی منتروں کا اثر ہو اور ان منتروں نے میری نظر بندی کر دی ہو۔ کیونکہ بہرحال دنیا میں جادو ٹونا تو اپنی جگہ پر موجود ہے اور عملی عمل سے دوسروں کی نظر بندی بھی لوگ کرتے ہیں۔ میں نے ہمت کر کے سانپ کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"پاروتی! کیا یہ تم ہو؟"

میرے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھے ہوئے سانپ نے آگے پیچھے پھن کو یوں ہلایا جیسے کہہ رہا ہو۔ ہاں میں ہی پاروتی ہوں۔ میں نے گھبراہٹ میں کہا۔

"پاروتی انسانی شکل میں واپس آ جاؤ۔ مجھے یقین آ گیا ہے۔"

میں نے ابھی پلک بھی نہیں جھپکی تھی کہ میرے سامنے سانپ کی جگہ پاروتی بیٹھی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"جو کچھ تم نے دیکھا ہے یہ چلتر ہے۔ نرگ ودیا ہے جس کو تم شیطانی عمل کہا کرتے ہو۔"

وہ اٹھ کر میرے دائیں جانب آ کر بیٹھ گئی۔

"جانتے ہو یہ سب نظروں کی شعبدہ بازی ہے میرا یہ دشواش ہے کہ میں انسانی روپ میں ہی تھی لیکن دیکھنے والوں کو ناگن دکھائی دے رہی تھی۔ تمہاری جگہ اگر کوئی شدھا کا پاعمل یوگ بدھ ہوتا تو وہ مجھے انسانی روپ میں ہی دیکھتا مگر ہم تم دنیادار ہیں۔ موہ مایا کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم چیزوں کو ان کی اصلی شکل میں نہیں دیکھ سکتے۔"

میں نے محسوس کیا کہ پاروتی کی روح میں ایک نئی بیداری ایک نیا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم نے انسان سے ناگن بننے کی شکتی بہرحال حاصل کر لی ہے۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

پاروتی نے کہا۔ "میں اپنی اس شکتی سے اپنے ان دشمنوں سے بدلہ لینا چاہتی ہوں جنہوں نے مجھے اغوا کیا۔ میری زندگی کو جہنم بنایا اور میرے گھر کو تباہ کیا اور میرے ماتا پتا کو مجھ سے جدا کر دیا لیکن سب سے پہلے میں اپنے ماتا پتا کی تلاش میں دلی جانا چاہتی ہوں۔ وہاں لاہور نام کی ایک آبادی ہے جہاں کبھی میری خالہ رہا کرتی تھی۔ ہو سکتا ہے میرے ماتا پتا وہیں ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر ہم آج رات ہی دلی کی کوئی ٹرین پکڑ لیتے ہیں۔"

پاروتی کہنے لگی۔ "تمہارے پاس ٹکٹ کے پیسے ہوں گے؟ میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں بچا۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نے جیب میں سے ساری رقم نکال لی۔ یہ کل پندرہ روپے دس آنے تھے۔ اگرچہ اتنے پیسے اس زمانے میں بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ لیکن پاروتی نے کہا۔

"میرے اندر جو نئی طاقت پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ سے مجھے دوسری کئی چھوٹی چھوٹی طاقتیں بھی حاصل ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر میں سانپوں کی زبان بول سکتی ہوں اور سمجھ سکتی ہوں۔ میں سانپوں پر حکم چلا سکتی ہوں۔"

پاروتی مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"تم نے ضرور سن رکھا ہو گا کہ زمین کے اندر جو خزانہ دفن ہوتا ہے اس پر ایک سانپ بیٹھا ہوتا ہے جو خزانے کی حفاظت کرتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ کہانیوں میں پڑھا تھا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

پاروتی کہنے لگی۔ "میں اس خزانے کے سانپ پر بھی حکم چلا سکتی ہوں۔ میں اسے حکم دے سکتی ہوں کہ خزانے میں سے کوئی ہار کوئی قیمتی ہیرا یا سونے کی اشرفیاں مجھے لا کر دے اور وہ اسی وقت مجھے لا دے گا۔"

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"پاروتی! تم الف لیلیٰ کی کہانیوں کی باتیں کرنے لگی ہو۔ یہ سب خیالی باتیں ہیں۔"

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ مندر کے دروازے کی طرف چلاتے ہوئے بولی۔

"میرے ساتھ دریا پر چلو۔ وہاں ایک پرانے محل کا کھنڈر ہے۔ ماتا جی کہا کرتی تھیں کہ یہ کسی سورج بنسی خاندان کے راجہ کا محل ہوا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس محل کے کھنڈر میں کوئی خزانہ دفن ہو۔"

میں نے دل میں کہا کہ چلو یہ تماشہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ کلکتے کے شمال کی جانب دریائے ہگلی بہتا ہے جس کو وہاں دریائے ہگلی کہتے ہیں۔ ہم ٹرام کار میں بیٹھ کر دریا کی طرف چل دیئے۔

دریائے ہگلی کے کنارے ایک کھنڈر تھا جس کی شکستہ دیواروں پر گھاس اگ رہی تھی۔ ایک بھی چھت سلامت نہیں تھی۔ جگہ جگہ چھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ گلہریاں ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ یہ سورج غروب ہونے کا وقت تھا۔ کلکتہ شہر کے آسمان پر دن کی روشنی مغرب کی طرف سمٹتے ہوئے نارنجی رنگت اختیار کر رہی تھی۔ پاروتی میری ساتھ چلتی کھنڈر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہی کبھی راجہ کا محل تھا۔"

"اب تو یہاں سوائے اینٹ پتھر اور سوکھی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں کہاں سے خزانہ ملے گا۔"

پاروتی بولی۔

"ایسی جگہوں پر ہی خزانے ہوا کرتے ہیں چلو۔ کھنڈر کے اندر چلتے ہیں۔"

ہم کھنڈر کی چار دیواری میں آ گئے۔ یہاں کافی جھاڑ جھنکاڑ تھا۔

میں نے کہا۔ "یہاں کہیں سے کوئی سانپ بچھو نکل آیا تو میں تو مارا جاؤں گا۔"

پاروتی نے کہا۔

"میرے ہوتے ہوئے کسی سانپ بچھو کی مجال ہے کہ تمہیں کچھ کہے۔"

وہ جھک کر فضا میں کچھ سونگھتے ہوئے قدم قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جھاڑی کے پاس جا کر اس نے جلدی سے اندر ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نسواری رنگ کا سانپ بل کھا رہا تھا اور اس کی کھال پر اس رہا تھا۔ پاروتی سانپ کو اسی طرح پکڑے کھڑی رہی۔ جب سانپ نے کھال پر اتنے اتنے تھک کر گردن نیچے ڈال دی اور پاروتی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"منہ دوسری طرف کر لو۔"

میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ جب تھوڑی دیر بعد گردن گھما کر پاروتی کو دیکھا تو اس کے ہاتھ میں سانپ نہیں تھا۔ کہنے لگی۔

"اس کا گوشت کڑوا تھا۔"

میں نے اسے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خدا کے لئے آئندہ میرے سامنے یہ مکروہ حرکت نہ کرنا۔"

پاروتی نے میری بات کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور جھکے جھکے قدم قدم جھاڑیوں اور پتھر کے ڈھیروں میں آگے بڑھتی رہی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ وہ پتھروں کی ڈھیری کے پاس جا کر رک گئی۔ جھک کر پتھروں کو سونگھنے لگی۔ پھر کہنے لگی۔

"یہاں تو یہاں کوئی خزانہ دفن ہے۔ مجھے خزانے کے سانپ کی بو آ رہی ہے۔"

میں نے خیال کیا کہ یہ بھی نظر بندی کا کوئی کھیل ہو گا۔ آج کل کہاں دفن شدہ خزانے ملتے ہیں۔ میں نے کندھے سکیڑتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا۔

"اگر یہاں تمہیں خزانے کا شبہ ہے تو پھر خود ہی زمین کھودو۔ میں یہ مزدوری نہیں کر سکتا۔"

پاروتی مسکرانے لگی۔

"تمہیں زمین کھودنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تو پھر تمہیں جو خزانہ نظر آ رہا ہے وہ باہر کون لائے گا؟ تمہارا ابا؟"

"تمہیں ابھی تماشہ دکھاتی ہوں۔"

یہ سب کچھ مجھے اب تماشہ ہی لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے آپ بھی اسے تماشہ ہی خیال

کرنے لگے ہوں۔ لیکن ایک بات ضرور ہے۔ اس دنیا میں جہاں ہم آپ رہ رہے ہیں بعض اوقات ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں کہ انسانی عقل حیران کھڑی رہ جاتی ہے۔ ہم نے اپنی دنیا اور اس دنیا کے معمولات کو چند اصولوں اور ضابطوں میں تقسیم کر رکھا ہے جنہیں ہم حقائق کہتے ہیں۔ ہم ہر واقعے کو حقائق کے اصولوں پر پرکھنے کے عادی ہیں۔ لیکن جب کبھی ہم کوئی ایسا واقعہ دیکھیں یا اس کے بارے میں سنتے ہیں جو ہمارے ان ضابطوں اور حقائق کے خود ساختہ اصولوں کے منافی ہوتا ہے تو ہم حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں ایسے ایسے سربستہ راز ہیں کہ جن کی بابت ہمیں علم تو کیا ان کا وہم و گمان تک نہیں ہے۔ قدرت نے ہمیں بہت کچھ دے کر بہت کچھ ہم سے چھپا لیا ہے۔ ہم اپنی طرف سے قدرت کے اسرار کا ایک پردہ اٹھا کر بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے نیچر کو تسخیر کر لیا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ قدرت کی سٹیج پر ایک پردہ اٹھتا ہے تو پیچھے ایک پردہ گر بھی جاتا ہے۔ آج سمجھا جاتا تھا۔ کل کا جادو' کل کا طلسم آج کی سائنس بن کر ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ آج صرف جن بھوت غائب ہوتے ہیں۔ کیا معلوم کل انسان بھی غائب ہونا سیکھ جائیں اور جس طرح ٹیلیکس مشین میں ڈالی گئی تحریر ایک سیکنڈ میں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے دوسرے براعظم کے شہر میں لگی ٹیلیکس مشین میں ظاہر ہو جاتی ہے اس طرح ہو سکتا ہے کل انسان بھی اسی طرح ایک شہر سے غائب ہو کر دوسرے شہر میں پہنچ جائے۔

پاروتی پتھروں کے پاس بیٹھ گئی۔ میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ آسمان پر شام کی نارنجی روشنی آہستہ آہستہ قرمزی ہونے لگی تھی۔ پاروتی نے منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھا اور پھر اس کے منہ سے سسکاریوں کی آوازیں نکلنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سانپوں کی زبان میں خزانے کے سانپ سے مخاطب ہے۔ یہ بات آپ کو بھی بڑی عجیب لگے گی اور اس وقت مجھے بھی بڑی عجیب لگی تھی کہ ایک انسان سانپ سے باتیں کر رہا

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میں اب بھی یہی کہوں گا کہ سائنس کی بدولت وہ زمانہ بھی ضرور آجائے گا جب انسان جانوروں کی بولیوں اور جانور انسانوں کی زبان سمجھنے لگیں گے۔

پاروتی کوئی پندرہ سیکنڈ تک چھوٹی چھوٹی سسکاریوں کی کوڈ زبان میں کچھ بولتی رہی۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"میں نے تمہیں غلط نہیں کہا تھا۔ یہاں ایک خزانہ موجود ہے۔ میں نے خزانے کے سانپ سے کہا ہے کہ وہ میرے لئے خزانے میں سے کوئی بھی چیز منہ میں ڈال کر لے آئے۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"بھلا دیکھتا ہوں تمہارا خزانے والا سانپ زمین کے اندر سے کیا لاتا ہے۔"

میں بالکل صاف صاف بیان کروں گا۔ مجھے پاروتی کی باتوں پر آدھا یقین اور آدھا بے یقینی تھی۔ یا یوں سمجھ لیں کہ پورا پورا یقین بھی تھا اور پوری پوری بے یقینی بھی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی خیال آتا کہ ہو سکتا ہے ایسا ہو بھی جائے۔ اب تو مجھے پورا پورا یقین ہو گیا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز ممکن ہے۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"پتھر ہٹا کر سانپ کے لئے راستہ بنا دیتے ہیں۔"

پاروتی نے مجھے منع کیا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ سانپ اپنے لئے راستہ خود بنا لے گا۔"

پھر میری آنکھوں نے ایک سفید سانپ کو دیکھا جس کی جلد شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ پتھروں کے درمیان سے باہر نکل کر پاروتی کے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سانپ کے منہ میں سونے کی چھوٹی سی لڑی تھی جس میں ایک سرخ رنگ کا نگ چمک رہا تھا۔ پاروتی نے سونے کی لڑی سانپ کے منہ سے نکال کر اسے غور سے دیکھا۔ پھر سانپ کی زبان میں سی سی کر کے اس سے دو تین

باتیں کیں۔ سانپ جدھر سے آیا تھا ادھر ہی کو واپس چلا گیا۔ اس نے سونے کی لڑی مجھے دکھائی۔

"دیکھو۔ یہ سونے کی ہے۔ اس میں یہ قیمتی نگ بھی لگا ہوا ہے۔ یہ ضرور بیش قیمتی ہو گا۔"

سرخ رنگ کا قیمتی انگوٹھے کے سائز کا تھا اور شام کی روشنی میں اس میں سے شعاعیں نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"یہ تو ہمیں بازار میں لے جا کر بیچنا پڑے گا کہیں ہمیں پولیس چوری کے شبہ میں نہ پکڑ لے۔ اچھا تھا کہ تمہارا سانپ خزانے میں سے سونے کی اشرفیاں لے آتا۔"

پاروتی بولی۔

"سونے کی اشرفیاں بیچتے جاتے جب بھی لوگوں کو ہم پر شک پڑ سکتا تھا۔ اس لڑی کے بارے میں تو میں سنار سے کہہ سکتی ہوں کہ ہمارے خاندانی ہار کی ایک لڑی باقی رہ گئی ہے اسے بھی فروخت کرنا پڑ رہا ہے۔"

میں نے اسے کہا۔

"اب رات ہو رہی ہے ہم اس وقت کہاں اسے صرافہ بازار میں لے جا کر فروخت کرتے پھریں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم رات کی گاڑی سے اسے ساتھ ہی لے کر دلی چلتے ہیں۔ دلی جا کر اسے فروخت کر دیں گے۔"

"یہ خیال بھی ٹھیک ہے۔ ہمارے پاس دلی جانے کا ریل کا کرایہ تو موجود ہی ہے۔"

"بالکل"

پاروتی نے سونے کی لڑی مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اسے تم اپنے پاس سنبھال کر رکھ لو۔ چلو اب ریلوے سٹیشن پر چل کر دلی جانے والی گاڑی کا پتہ کرتے ہیں۔"

دریا کے علاقے سے نکل کر ہم بڑی سڑک پر آئے۔ وہاں سے ایک ٹیکسی پکڑی

Prepared By: S.Sohail Hussain

اور کلکتے کے ہوڑہ ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ دلی جانے والی گاڑی رات کے سوا نو بجے چلے گی۔ اس وقت ابھی شام کے سات ہی بجے ہوں گے۔ ہم نے دلی تک کے دو تھرڈ کلاس کے ٹکٹ خریدے اور پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے۔ کلکتے میں ابھی فضا اتنی خراب نہیں ہوئی تھی۔ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ پنجاب میں بہت خون خرابہ ہو رہا ہے اور جالندھر امرتسر میں سخت فسادات ہو رہے ہیں۔ مجھے اس لئے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی کہ میرے گھر والے لاہور شہر میں تھے اور لاہور پاکستان میں تھا۔ امرتسر میں ہمارے کچھ رشتہ دار ضرور تھے۔ کسی وقت ان کا خیال ضرور آ جاتا تھا۔ پھر سوچتا کہ وہ صدیوں سے وہاں آباد ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا اور وقت آنے پر وہ تسلی سے نکل جائیں گے۔

میں نے کینٹین کے کاؤنٹر سے دو گلاس چائے کے لئے۔ ایک گلاس پاروتی کو دیا۔ اور ہم دونوں پلیٹ فارم پر کاؤنٹر کے قریب ہی بنچ پر بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ پاروتی کے اندر ایک نئی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے اس نے خود ہی بتایا۔

"جب سے میرے اندر انسان سے ناگن بن جانے کی شکتی پیدا ہوئی ہے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اب مجھے سانپوں سے ڈسوانے اور سانپ کھانے کی عادت نہیں رہی۔ وہ حالت وہ کیفیت جو سانپ ڈسوانے کے بعد مجھ پر طاری ہوتی تھی اب اس کے بغیر بھی مجھ پر طاری رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کم از کم اس مکروہ عادت سے تو تمہارا پیچھا چھوٹا۔"

پاروتی نے کہا۔

"اور سنو اب مجھے بھوک بھی نہیں لگتی میرا مطلب ہے میں کچھ نہ بھی کھاؤں تو لگتا ہے میرے اندر کمزوری پیدا نہیں ہو گی۔ ایک طرح سے میرے اندر ایک سانپ کی ساری باتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ جانتے ہو سانپ صرف ایک بار کھاتا ہے اور پھر لمبے عرصے تک کچھ بھی نہیں کھاتا۔ میں بھی دن میں ایک بار کھانا کھا لوں تو پھر بھوک ہی

نہیں لگتی۔ اس وقت بھی مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

میں نے اسے کہا۔ "تمہارا تو پیٹ کا مسئلہ حل ہو گیا اب تمہارا کھانا بھی میں خود کھایا کروں گا۔"

پاروتی نے چائے کا گلاس اپنے پاس بنچ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میری ایک بات سنو۔ تمہیں ایک ضروری بات بتانا چاہتی ہوں۔ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ اس میں میری زندگی کا راز چھپا ہوا ہے۔"

پاروتی ایک لمحے کے لئے پلیٹ فارم کے فرش کو گھورنے لگی۔ پھر میری طرف نگاہیں اٹھائیں اور کہا۔

"میری زندگی اب بڑی لمبی ہو گی۔ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکو گے۔ میرے ایسی عورت ہو گئی برسوں تک سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسواتی رہی ہو اور سانپوں پر گزارہ کرتی رہی ہو جب وہ ناگن ماتا کا چلہ کاٹ کر انسان سے ناگن بننے کی طاقت حاصل کرتی ہے تو اس دنیا میں اس کی عمر بہت لمبی ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ عام انسانوں کے برخلاف کھانے پینے سونے اور دوسری انسانی ضرورتوں اور کمزوریوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اب مجھے بھوک نہیں لگتی۔ میں اگر چاہوں تو کھا پی لوں۔ نہ کھاؤں تو مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ میں سانپ کھانے سے بے نیاز ہو گئی ہوں۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارے ساتھ کوئی حادثہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ تم گاڑی کے نیچے آ سکتی ہو تم پر کسی مکان کی چھت گر سکتی ہے۔ فسادات میں تمہیں کوئی گولی مار سکتا ہے۔"

پاروتی نے جواب دیا۔

"تم نے بالکل ٹھیک سوال کئے ہیں۔ میرے ساتھ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس قسم کے حادثے گزر سکتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب میرے سر پر کسی مکان کی چھت گرے گی۔ جب میں کسی گاڑی کے نیچے آؤں گی اور جب بھی مجھے کوئی گولی

Prepared By: S.Sohail Hussain

مارے گا تو اس سے ایک سیکنڈ پہلے میں سانپ بن چکی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "لیکن سانپ کی شکل میں بھی تم مر سکتی ہو۔ پھت کرنے سے نکل جا سکتی ہو۔ گاڑی کے نیچے آنے سے تمہارے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ پستول کا فائر تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے۔ پھر تو تم مر جاؤ گی پھر کیسے زندہ رہ سکو گی؟"

پاروتی نے مسکرا کر کہا۔

"یہی وہ راز کی بات تھی جو میں تمہیں بتانے لگی تھی۔ سنو! اگر میرے ساتھ کبھی ایسا حادثہ پیش آ جائے اور میرے جسم کے ٹکڑے ہو جائیں تو تمہیں میری زندگی کی خاطر ایک کام کرنا ہو گا۔ تم میری سانپ کی لاش کے ٹکڑے اکٹھے کر کے کسی برتن میں بند کر دینا۔ کوہ ہمالیہ کے شمال میں وار بلنگ سے تین کوس اوپر کی طرف کیلاش پربت ہے۔ وہاں ایک شو مندر ہے۔ اس مندر کے پیچھے ایک تالاب ہے۔ میرے جسم کے ٹکڑے کسی ایسے برتن یا ڈبے میں بند کر کے جس کے اندر پانی نہ جا سکے اس تالاب میں ڈال دینا۔ چھ دن کے بعد اس برتن کو نکال کر کھولو گے تو میرے جسم کے ٹکڑے جڑ گئے ہوں گے اور میں زندہ ہو چکی ہوں گی۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اسے یاد تو اپنے پاس لکھ کر رکھ لینا یا اپنے ذہن میں اسے اچھی طرح یاد کر لینا کیونکہ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور سانپ کی شکل میں میری لاش کے ٹکڑے وہیں پڑے رہنے دیئے تو میں واقعی مر جاؤں گی۔"

قدرتی طور پر ایک سوال میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے کہا۔

"پاروتی! اس کا مطلب ہوا کہ مجھے تمہارا محافظ بن کر ساری زندگی تمہارے ساتھ رہنا پڑے گا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی؟"

پاروتی بولی۔ "جب تک تم میرے ساتھ ہو ٹھیک ہے مجھے تسلی ہو گی کہ اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ گزرا تو تم مجھے مرنے سے بچا لو گے۔ جب تم مجھ سے جدا ہو گئے تو پھر جو خدا کے گا وہی ہو گا۔ ہو سکتا ہے مجھے تمہارے ایسا کوئی اور دوست مل

جائے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ پھر ٹھیک ہے۔"

پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابھی تو تم اس وقت تک میرے ساتھ رہو گے جب تک میں ان سفاک لوگوں سے انتقام نہیں لے لیتی جنہوں نے میری زندگی برباد کی ہے۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"ہاں۔ اس وقت تک تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔"

پاروتی نے بے اختیار مجھے دعا دی۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ پاروتی نے کچھ عرصے سے بھگوان کی جگہ خدا کا نام لینا شروع کر دیا تھا۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کے اندر کوئی خاص تبدیلی پیدا ہو رہی ہو۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ وہ ہندو ازم اور ہندوؤں کے رسوم و رواج سے برگشتہ ہو رہی تھی۔ کچھ میری صحبت کا بھی اثر تھا۔

پیٹ فارم پر پندرہ بیس ہندو بنگالیوں کا ایک جلوس کانگریس کی جھنڈیاں لہراتا، بندے ماترم اور ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگاتا گزر گیا۔ پاروتی نے پوچھا۔

"کیا ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ کیا انگریز یہاں سے چلا گیا ہے؟"

لکھنؤ آ کر مجھے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا پورا علم ہو چکا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ جون جولائی کے دن تھے۔ ابھی 15 اگست کا تاریخی دن نہیں آیا تھا۔ اصولی طور پر ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس دوران شمالی ہندوستان خاص طور پر مشرقی پنجاب اور دلی میرٹھ مراد آباد وغیرہ میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ یہ ساری خبریں میں اخبار میں پڑھ لیتا تھا۔ ہندو سکھوں کو مسلمانوں کی علیحدہ مملکت پاکستان بن جانے کا سخت غصہ تھا اور انہوں نے مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کرنا اور ان پر اکا دکا قاتلانہ حملے شروع کر دیئے تھے۔

یہ ساری باتیں میں نے پاروتی کو بتائیں تو وہ بولی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"آخر مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے ہندو گھرانے میں جنم لیا ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ہندو بہت تنگ دل ہوتا ہے اور مسلمان سے تو وہ بیشتر سے نفرت کرتا آیا ہے۔"

میں نے پاروتی سے کہا۔ "اسی لئے تو مسلمانوں نے اپنے لئے علیحدہ وطن پاکستان بنایا ہے۔ میں نے بھی بچپن میں دیکھا ہے کہ ہم کبھی کسی ہندو کے گھر میں جاتے تھے تو ان کی عورتیں ہم سے دور بھاگ جاتی تھیں۔ کہتی تھیں اگر ہم کسی مسلمان سے چھو گئیں تو ہم بھرشٹ ہو جائیں گی۔ ہمیں سات بار گنگا میں اشنان کرنا پڑے گا۔"

پاروتی کہنے لگی۔

"خدا نے مسلمانوں کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ چلو اچھا ہوا کہ مسلمانوں کا وطن پاکستان بن گیا۔ خدا نے چاہا تو میں ایک بار پاکستان دیکھنے ضرور جاؤں گی۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ مسافروں میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہر کوئی ٹرین کی طرف دوڑا۔ پتہ چلا کہ ہوڑہ میل ہے اور یہی ٹرین ہمیں دہلی لے جائے گی۔ اس زمانے میں عورتیں بھی تھرڈ کلاس میں اپنی مردوں کے ساتھ بیٹھ جاتی تھیں۔ چنانچہ پاروتی بھی میرے ساتھ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئی۔

جس وقت ہم پلیٹ فارم پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اس وقت آسمان پر کالی گھٹائیں چھانے لگی تھیں۔ جب ٹرین کلکتہ کے ہوڑہ سٹیشن سے چلی تو بارش شروع ہو گئی۔ ایک بات کا مجھے بڑا اطمینان ہو گیا تھا کہ اب پاروتی نہ تو سانپوں سے ڈسوائے گی اور نہ ایسی اپنی خوراک بنائے گی۔ بلکہ اب تو وہ کھانے پینے سے بالکل ہی آزاد ہو گئی تھی۔ کہنے کو تو اس نے مجھے یہی کہا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دہلی تک کے سفر میں وہ کچھ کھانے پینے کو مانگتی ہے یا نہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کچھ کھائے پیئے بغیر وہ زندہ رہ سکے گی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قدرت کا نظام ایک سربستہ راز ہے۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ٹرین رات کے اندھیرے میں کلکتہ شہر کی جھلملاتی روشنیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی بھاگی جا رہی تھی۔ ڈبے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا آ رہی

تھی۔ کسی وقت بارش کی بوچھاڑ بھی اندر آ جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ والے بنگالی مسافر نے بارش سے بچنے کے لئے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔ سلیپر سیٹ پر کھڑکی کے نزدیک میں نے جو تھیلی کے تنگ والی سونے کی لوئی ہمیں لا کر دی تھی وہ میں نے اپنے پاس بڑی اچھی طرح سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔

کلکتے سے دہلی تک کا سفر بڑا لمبا سفر تھا۔

میں نے پاروتی سے کہا کہ میں اس کے سونے کے واسطے اوپر برتھ پر جگہ بناتا ہوں۔ وہ ہلکے سے تبسم کے ساتھ بولی۔

"مجھے سونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بھول گئے ہو کہ میں ——"

اور اس نے اپنے ہونٹ میرے کان کے پاس لا کر فقرہ مکمل کیا۔

"میں ناگن ہوں۔"

ٹرین نے مضافات کا کوئی چھوٹا سا سٹیشن چھوڑا تو ریل کی پٹڑیوں نے بہت شور مچایا۔ میں نے پاروتی سے کہا کہ مجھے تو ضرور نیند آ جائے گی۔ میں اپنے لئے جگہ بناتا ہوں۔ اوپر والے برتھ پر کسی مسافر کی گٹھڑیاں پڑی تھیں۔ میں نے انہیں بڑی احتیاط سے ایک طرف کر کے اتنی جگہ بنا لی کہ میں ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ سکتا تھا۔ میں واپس پاروتی کے پاس آ کر بیٹھ گیا کہ جب نیند آئے گی تو اوپر برتھ پر چڑھ کر سو جاؤں گا۔ پاروتی کھڑکی کے شیشے پر باہر سے گرتی بارش کے قطروں کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کسی وقت وہ مجھ سے ان جنگلوں کی بات کر لیتی جہاں سے گزر کر ہم آئے تھے۔ اسے وہ جنگل بہت یاد آ رہے تھے۔ ہم اسی طرح کبھی خاموش اور کبھی باتیں کرتے رہے۔ ڈبے میں دوسرے مسافر بھی اپنی اپنی باتوں میں لگے تھے۔ کچھ مسافر سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ٹرین کلکتے سے بہت آگے نکل آئی تھی اور اندھیرے میں بنگال کے سرسبز کھیتوں میدانوں اور ندی نالوں پر سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔

مجھے نیند آنے لگی تو میں نے پاروتی سے کہا۔

"میں اوپر برتھ پر سونے جاتا ہوں۔ تم کسی سٹیشن پر اترنا بالکل نہیں۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

وہ اس پر ہی۔

"اب مجھے اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں برتھ پر چڑھ کر لیٹ گیا۔ چلتی ٹرین میں مجھے بڑی جلدی نیند آ گئی۔ ایک دھچکے سے میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ ٹرین رک گئی ہے۔ میں نے سر نیچے کر کے دیکھا۔ پاروتی اپنی سیٹ پر اسی طرح بیٹھی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ اترا ہوا تھا باہر پلیٹ فارم پر بڑی روشنیاں تھیں۔ میں نیچے اتر آیا۔ پاروتی نے کہا۔

"آسن سول کا سٹیشن آیا ہے۔"

آسن سول سے صوبہ بہار کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہوڑہ ایکسپریس نے ہمیں شام کے وقت دلی پہنچا دیا۔ وہاں سے ہم تانگہ لے کر پاروتی کی خالہ کے گھر پہنچے تو وہاں بھی تالا لگا تھا۔ معلوم ہوا کہ دلی میں فسادات کے ڈر سے وہ لوگ کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔ پاروتی بولی۔

"اب کیا کریں؟"

میں نے کہا "واپس سٹیشن پر چل کر رات گزارتے ہیں صبح سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے؟"

ہم اسی تانگے میں واپس دلی سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ایک چوک میں اچانک ہندو بلوائیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور چھرے تھے۔ پاروتی نے کہا ہم ہندو ہیں۔ لکھنؤ جا رہے ہیں۔ ایک ہندو نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا

"یہ ہمیں مسلمان لگتا ہے۔ ہم اس کا معائنہ کریں گے۔"

میرا رنگ اڑ گیا۔ کیونکہ ان بلوائیوں سے میرا بچنا مشکل تھا۔

پاروتی بڑی جرات کر کے میرے آگے آ گئی۔ کہنے لگی۔

"یہ میرا پتی ہے۔ میں ناگ دیوتا کی سوگند کھاتی ہوں اگر تم نے میرے پتی کو ہاتھ لگایا تو ناگ دیوتا تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ہندو بلوائی ذرا ٹھٹک گئے۔ لیکن ایک ہندو نے للکار کر کہا۔

"یہ بھی مسلمان ہے۔ اس کو بھی مار ڈالو۔"

میں بھول گیا تھا کہ نکلتے سے چلتے وقت پاروتی نے ایک سانپ اپنی قمیض کے اندر چھپا کر رکھ لیا تھا۔ چونکہ اب اسے سانپ کھلانے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے یہ سانپ اس کی قمیض کے اندر محفوظ پڑا تھا۔ جیسے ہی بلوائی مجھے ہلاک کرنے کے لئے آگے بڑھا پاروتی نے اونچی آواز میں ناگ دیوتا کا کوئی منتر پڑھا اور قمیض کے اندر سے سانپ نکال کر بلوائیوں پر اچھال دیا۔ سانپ اور چور کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔ جیسے ہی سانپ بلوائیوں کے اوپر گرا وہ سر پر پاؤں رکھ کر ایک طرف کو بھاگے۔ پاروتی نے کوچوان کو آواز دی۔

"تانگہ یہاں سے نکال کر لے چلو۔"

مگر کوچوان وہاں سے خدا جانے جان بچا کر کہاں غائب ہو چکا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا "تانگے میں بیٹھو۔ جلدی کرو۔"

وہ تانگے میں بیٹھی۔ میں نے گھوڑے کی باگیں سنبھالیں اسے سانٹا رسید کیا گھوڑا

Prepared By: S.Sohail Hussain

ارادہ کا اور پھر سڑک پر سٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی تانگہ نہیں چلایا تھا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ تانگہ چلانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ کوچوان کو صرف بائیں لیک طرح سے سنبھالنی ہوتی ہیں۔ تانگے کو گھوڑا چلاتا ہے۔ اس کے باوجود ایک آدھ سڑک پر آ کر ہم نے تانگہ چھوڑ دیا۔ کیونکہ سڑک پر ٹریفک بھاری تھی اور یہاں جانے کا ارادہ تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"اگر میں وقت پر تم سانپ نکال کر ان پر نہ پھینکتیں تو میرا بچنا ناممکن تھا۔"

پاروتی نے بڑے پیار سے کہا۔

"تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر تو دیکھے۔"

رات کے نو دس بجے کا وقت ہو گا۔ دلی میں فسادات کی افواہ وارداتوں کے شروع ہو جانے سے سڑک بے رونق تھی۔ کسی وقت کوئی گاڑی تیزی سے گزر جاتی تھی۔ کوئی رکشا ٹیکسی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم سڑک پر چلنے لگے۔ آگے چوک آ گیا۔ یہاں ہمیں ایک رکشا مل گیا جس نے ہمیں ریلوے سٹیشن پہنچا دیا۔ ہم نے باقی ساری رات ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر گزاری۔ دن کی روشنی ہوئی تو میں نے پاروتی سے پوچھا کہ اب اس کا کیا پروگرام ہے۔ پاروتی کہنے لگی۔

"مجھے ماتا پتا کی بہت یاد آ رہی ہے۔ خدا جانے میرے بغیر ان کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔ میں صرف ایک بار ان سے مل کر انہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ اس کے بعد میں سنتالی پہاڑوں سے انتقام لینے بنگال کے جنگلی جنگلوں کی طرف نکل جاؤں گی۔ تمہاری مرضی ہے تم میرے ساتھ چلنا یا نہ چلنا۔"

میں نے کہا "مگر تمہارے ماتا پتا تو بھاگلپور میں ہیں اور ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ وہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

پاروتی کچھ سوچ کر بولی۔

"پتا جی کبھی کبھی اپنے بھائی کے ایک دوست کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ ان کا کلاس فیلو تھا اور اب بھاگلپور میں کسی سینما ہاؤس کا مالک ہے۔ اس کا نام کچھ ترپندر

کمار یا ترپل کمار قسم کا تھا۔ اگر ہم بھاگلپور جائیں تو اس آدمی کا پتہ مل سکتا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ بھاگلپور چلو گے؟"

میں نے دل میں عہد کیا ہوا تھا کہ اس بے یار و مددگار اور مصیبت زدہ لڑکی کو جب تک محفوظ ہاتھوں میں نہیں پہنچاؤں گا اس کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ بھاگلپور جانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے جیب سے رقم نکال کر گنی۔ چند ایک روپے ہی باقی رہ گئے تھے۔ اس رقم سے ہم ٹرین کے ذریعے بھاگلپور نہیں پہنچ سکتے تھے۔ پاروتی نے کہا۔

"کیوں نہ یہاں خرانے والا بازار میں لے جا کر بیچ دیں۔ اس سے ہمیں کافی رقم مل جائے گی۔ ہم نئے کپڑے اور نئے جوتے بھی خرید لیں گے۔"

میں بھی اس بار یا سونے کی لڑی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا "چلو دلی کے صرافہ بازار میں چلتے ہیں۔"

ہم نے وہیں سٹیشن سے صرافہ بازار کا پتہ معلوم کیا اور ٹرام میں بیٹھ کر چل پڑے۔ ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ تیسرے چوک میں جا کر ٹرام سے اتر جانا۔ پھر بائیں ہاتھ کو بازار میں مڑ گئے تو صرافہ بازار میں پہنچ جاؤ گے۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ تیسرے چوک پر ٹرام رکی تو ہم ٹرام سے اتر کر بائیں طرف بازار میں مڑ گئے۔ یہ ایک تنگ سا بازار تھا۔ سناروں کی کچی سی دکانیں تھیں۔ الماریوں میں زیورات سجے ہوئے تھے۔ پولیس بھی وہاں پر موجود تھی۔ ہم ایک دکان میں آ گئے۔ یہ ایک ہندو لالے کی دکان تھی۔ گدی پر ایک موٹا لالہ بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ پیچھے دیوار پر رام اور سیتا کی تصویر لگی تھی۔ ہمارے کپڑے معمولی سے تھے۔ لالہ جی نے پہلے تو ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے قمیض کے اندر سے سرخ عقیق والی سونے کی لڑی نکال کر اسے دی تو وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ سونے کی لڑی کے منکوں کو اس نے کسوٹی پر رگڑا۔ پھر عقیق

Prepared By: S.Sohail Hussain

کو جھٹک لگا کر اٹ پلٹ کر دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے لڑی ایک طرف رکھ دی اور پوچھا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملی ہے؟"

پاروتی نے کہا۔

"ہمارے حالات ٹھیک نہیں رہے۔ یہ میرا شادی کا ہار تھا۔ اس کی لڑیاں توڑ توڑ کر بیچتے رہے ہیں۔ یہ آخری لڑی رہ گئی تھی۔ اسے بھی بیچنے آئے ہیں۔"

لالہ نے پوچھا۔

"پہلی لڑی جہاں بیچی تھی اس نے کیا دیا تھا؟"

پاروتی نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"لالہ تم بیچ اس کا کیا دو گے؟"

لالہ جی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بڑا قیمتی ہیرا ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ لیکن وہ ظاہر کر رہا تھا کہ یہ معمولی سے ہار کی لڑی ہے۔ کہنے لگے

"پھر معمولی ہے۔ سونا ٹھیک ہے میں تمہیں اس کے پانچ سو روپے دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔"

پانچ سو روپے کی رقم 1947ء میں بہت کافی رقم ہوا کرتی تھی۔ پاروتی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ ٹھیک ہے۔ پاروتی بولی۔

"ٹھیک ہے لالہ جی یہ لڑی رکھ لیں اور ہمیں پانچ سو روپے دے دیں۔"

لالہ جی نے تجوری میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر ہمیں دے دیئے۔ یہ انگریزی کرنسی تھی۔ میں نے کہا۔

"اب تو ہندوستان آزاد ہو گیا ہے۔ کیا انگریزی نوٹ لوگ لے لیں گے؟"

لالہ جی بولے۔ "ہندوستان آزاد ضرور ہو گیا ہے مگر ابھی یہاں انگریزی نوٹ ہی چلتے ہیں جاؤ اب اپنا راستہ ناپو۔"

میں نے سو سو روپے کے پانچوں نوٹ اپنی قمیض کی جیب میں سنبھال کر رکھ

لئے۔ پاروتی نے کہا کہ اب سٹیشن پر چل کر معلوم کرتے ہیں کہ جھانسی کی گاڑی کب جائے گی۔ ہم صراف بازار سے نکلے اور چوک میں آ گئے۔ یہاں سے ہمیں نرائن کار میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن پہنچنا تھا۔ ہم سٹاپ پر نرائن کا انتظار کر رہے تھے کہ پولیس کے دو سپاہی ہمارے پاس آ گئے۔ ان میں ایک سکھ تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو بھئی تم؟"

میں نے اسے بتایا کہ ہم کلکتہ سے دلی آئے تھے یہاں ہمارے رشتے دار ہمیں نہیں ملے اب ان کی تلاش میں جھانسی جا رہے ہیں۔ سکھ سپاہی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"گوپال راس یہ تو جھانسی جا رہے ہیں۔"

دوسرا سپاہی جو ہندو تھا اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور کہنے لگا۔

"اور جو چوری کا مال تم ابھی ابھی بیچ کر آ رہے ہو اس کا پہلے حساب کتاب تو چکاؤ پھر ہمارے ساتھ تھانے۔۔۔۔"

میں اور پاروتی انہیں کہتے ہی رہ گئے کہ ہم نے جو سونے کی لڑی فروخت کی ہے وہ ہماری اپنی تھی۔ ہمارے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور ہمیں پکڑ کر تھانے لے آئے جو قریب ہی تھا۔ وہاں ایک موٹا سکھ تھانیدار بیٹھا تھا۔ اس نے بھی ہم پر چوری کا الزام لگایا اور میری جیب سے پانچ سو کے نوٹ نکال کر اپنے قبضے میں کر لئے اور حوالدار سے کہا۔

"ان کو حوالات میں بند کر دو۔ کل عدالت میں ان کا چالان پیش کریں گے۔"

صورت حال ایک دم سے پلٹ گئی تھی۔ کہاں ہم جھانسی جا رہے تھے اور کہاں ہمیں حوالات میں بند کیا جا رہا تھا۔ میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

"خدا کے لئے ذرا صبر کرنا۔ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ میں تھانیدار سے

Prepared By: S.Sohail Hussain

خود بات کرتا ہوں۔"

میں سکھ تھانیدار کو سمجھانے لگا کہ ہم چور نہیں ہیں۔ سونے کی لڑے میری بچی کی امانت ہی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو ہتھکڑی میں کھلی دی اور حوالدار سے کہا۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ بند کر دو انہیں حوالات میں۔"

حوالات سلاخوں والے دروازے کے باہر سنتری رائفل لئے کھڑا تھا۔ ہمیں اندر بند کرنے لگے تو پاروتی نے کہا۔

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

سکھ تھانیدار نے پاروتی کو کھلی دی اور فحش مذاق کیا۔ پاروتی کا میں نے چہرہ دیکھا۔ وہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"وہ سامنے باتھ روم ہے۔"

کونے میں غسل خانے کا دروازہ تھا۔ پاروتی غسل خانے میں چلی گئی۔ مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تھانے میں ایک سکھ تھانیدار تھا۔ ایک سنتری حوالات کے باہر کھڑا تھا اور دونوں سپاہی جو ہمیں پکڑ کے وہاں لائے تھے وہ ہمیں تھانیدار کے حوالے کر کے باہر چلے گئے تھے۔

میں حوالات کے فرش پر سلاخوں کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ پاروتی جو کہ غسل خانے میں نہیں گئی تھی۔ سکھ تھانیدار رجسٹر پر جو کچھ لکھ رہا تھا۔ چھت کا پنکھا چل رہا تھا۔ جب پاروتی کو غسل خانے میں گئے دس پندرہ منٹ ہو گئے تو سکھ تھانیدار نے چپڑاسی سے کہا۔

"لوئے شرابی! دیکھ لوئے! یہ تیری ماسی اندر کیا کر رہی ہے۔ کھول دے دروازہ۔"

چپڑاسی شرابی ساتھ والے کمرے میں سے نکل کر آیا اور اس نے جاتے ہی غسل خانے کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے کہا۔

"سردار جی اندر تو کوئی نہیں ہے۔"

سکھ تھانیدار نے چونک کر غسل خانے کی طرف دیکھا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ غسل خانہ خالی تھا۔ سکھ تھانیدار جلدی سے اٹھا اور غسل خانے کی طرف لپکا۔ ابھی اس نے دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ حوالات کا سنتری اس کی طرف دوڑا۔ چپڑاسی نے سکھ تھانیدار کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ بھی ایک طرف گر گیا۔

اب میں نے نسواری رنگ کے اس سانپ کو دیکھ لیا تھا جو اصل میں پاروتی کے روپ میں تھی۔ اس نے سکھ تھانیدار اور چپڑاسی دونوں کو ڈس لیا تھا۔ حوالات والا سنتری قریب جا کر تھانیدار پر جھکا تو پاروتی نے اسے بھی ڈس دیا۔ وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور باہر دروازے کی طرف دیکھتا رہا کہ کوئی دوسرا سپاہی تو اندر نہیں آ گیا کیونکہ کسی کے اندر آ جانے سے سانپ کی زندگی کو خطرہ تھا۔ وہ ضرور اسے مار ڈالتا۔ پاروتی نے ناگن بن جانے کے بعد ان تینوں کو کچھ اس طرح ڈسا تھا کہ ان کی آواز تک نہیں نکلی تھی۔ جیسے ان کے گلے بند ہو گئے ہوں۔

پاروتی سانپ کے روپ میں تیزی سے رینگتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ قریب آتے ہی اس نے انسانی شکل اختیار کر لی اور بولی۔

"حوالات کو تالا لگا ہے۔ اس کی چابی سنتری کی پیٹی سے لگی ہو گی۔ میں لاتی ہوں۔"

میں نے اسے کہا۔

"تھانیدار نے ہمارے پانچ سو کے نوٹ اپنی جیب میں رکھ لئے تھے وہ بھی نکال لانا۔"

پاروتی دوڑ کر تینوں بے ہوش یا مرے ہوئے آدمیوں کے پاس گئی۔ سنتری کی پیٹی میں سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اس کے بعد تھانیدار کی جیب میں سے پانچ سو کے نوٹ نکالے۔ بھاگ کر میرے پاس آئی۔ چوتھی چابی لگانے سے حوالات کا تالا کھل گیا۔ اس نے نوٹ میری قمیض کی جیب میں ڈالے اور بولی۔

"تھانے کے دروازے پر وہی دونوں سپاہی ہوں گے۔ پیچھے سے جاتے ہیں۔ پیچھے

Prepared By: S.Sohail Hussain

ضرور کوئی دروازہ ہو گا۔"

ہم ایک کمرے سے نکل کر تھانے کے پیچھے احاطے میں آ گئے۔ یہاں ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا اپنے بدن پر تیل کی مالش کر رہا تھا۔ ہم بڑے اطمینان سے اس کے قریب سے گزر گئے۔ سامنے احاطے کا چھوٹا دروازہ تھا۔ اس دروازے سے نکل کر ایک گلی میں آ گئے۔ گلی میں مکان کے باہر دو عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ بھاگنے سے انہیں شک پڑ سکتا تھا۔ ہم تیز تیز چلنے لگے۔ گلی آگے جا کر ایک طرف مڑ گئی۔ آگے پھر ایک گلی تھی۔ اس گلی نے ہمیں دوسرے بازار میں پہنچا دیا۔ ایک خالی رکشا قریب سے گزرا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا۔ وہ رکا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

"نئی دلی کی طرف چلو۔"

پاروتی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

"اب ہم ریلوے سٹیشن نہیں جا سکتے۔"

رکشا تیزی سے نئی دلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

نئی دلی وہاں سے کافی دور تھی۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہ کی۔ دلی اور نئی دلی کی تھوڑی بہت مجھے پہچان تھی۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے کہا۔

"ہمیں بارہ کھمبا پر اتار دینا۔"

بارہ کھمبا پر اتر کر میں نے رکشا کا کرایہ ادا کیا اور ایک طرف فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ پاروتی نے کہا۔

"ادھر تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "تم نے سکھ سپاہی کو کہا تھا کہ ہم جھانسی جا رہے ہیں۔ چنانچہ جب تھانے میں ہمارے فرار کا پتہ چلے گا اور سپاہیوں کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ ہم تین پولیس والوں کو ہلاک کر کے فرار ہوئے ہیں تو پولیس ہماری تلاش میں سیدھی ریلوے سٹیشن پہنچ جائے گی۔"

پاروتی کہنے لگی۔ "میں نے ان تینوں آدمیوں کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کیا

ہے جس سے وہ کچھ ایک گھنٹہ بے ہوش رہیں گے۔ وہ مریں گے نہیں۔"

میں نے کہا۔ "خواہ کچھ بھی ہو۔ بہرحال ہم چوری کے الزام میں پکڑے گئے تھے۔ پولیس نے ہمیں حوالات میں بند کیا تھا اور ہم حوالات توڑ کر بھاگے ہیں۔ یہ کوئی کم جرم نہیں ہے۔"

"پھر اب کیا کریں؟"

پاروتی کے اس سوال کے جواب میں میں نے کہا۔

"ہم جھانسی ضرور جائیں گے لیکن ٹرین دلی یا نئی دلی کے سٹیشن سے نہیں بلکہ آگرہ سے پکڑیں گے اور آگرہ تک ہم بس میں سفر کریں گے۔"

پہلے ہم نے سٹیشن پر ہی کر لیا تھا۔ اتنا زیادہ دیر دلی میں رکنا ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک دکاندار سے پوچھا کہ یہاں سے آگرہ کو بسیں کہاں سے چلتی ہیں۔ اس نے بتایا کہ بسوں کا اڈہ بستی نظام دین میں ہے وہاں سے ہمیں بس مل جائے گی۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور بستی نظام الدین کے لاری اڈے پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے آگرہ کو سیدھی کوئی بس نہیں جاتی۔ شہر کوسی اور متھرا کو بسیں چلتی ہیں۔ وہاں سے ہمیں آگرہ جانے والی بس مل جائے گی۔

میں اب بڑا چوکس تھا۔ پولیس کا سپاہی نظر آتا تو میں پاروتی کو لے کر فوراً ایک طرف ہو جاتا۔ لاری اڈے پر کافی رش تھا۔ دلی میں گڑبڑ شروع ہو جانے کی وجہ سے بعض لوگ شہر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ہمیں بھی کوسی جانے والی ایک لاری میں جگہ مل گئی۔ دوپہر کو لاری کوسی کے چھوٹے سے شہر میں پہنچی۔ یہاں ہم نے لاری اڈے پر ہی روٹی کھائی اور دوسری لاری میں بیٹھ کر متھرا کے شہر میں آ گئے۔ یہ ہندوؤں کا مشہور شہر ہے۔ یہاں بڑے مندر ہیں۔ یہاں فسادات تو نہیں ہو رہے تھے مگر فضا میں کافی تناؤ تھا۔ مسلمانوں کی بہت تھوڑی آبادی تھی جو سہمی ہوئی تھی۔ ہر طرف کانگریس کے جلوس نکل رہے تھے۔ گھروں پر آزادی کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ کانگریس کے جھنڈے تھے۔ کوسی میں بھی ہم نے یہی سماں دیکھا تھا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

متھرا سے ہمیں کوئی دو گھنٹے بعد آگرہ جانے والی اس ملی۔ اس اس نے ہمیں شام کے قریب آگرہ پہنچایا۔ آگرہ میں بھی ہندوؤں کے جلوس نکلے ہوئے تھے۔ ہندوستان زندہ باد، بھارت ماتا کی جے کے نعرے ہر طرف سنائی دے رہے تھے۔ اگرچہ یہاں مسلمان کافی تعداد میں آباد تھے مگر وہ کچھ خوف زدہ سے لگ رہے تھے۔ دو دن پہلے یہاں ایک محلے میں ہندوؤں نے چار مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا۔

پاروتی کہنے لگی۔

"ہندوؤں کو آزادی مل گئی ہے اب تم دیکھ لینا یہ مسلمانوں کا جینا حرام کر دیں گے۔ یہ تو پہلے ہی مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے اب تو آزاد ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"سٹیشن پر چل کر جھانسی والی گاڑی پکڑتے ہیں۔"

پاروتی نے میرے ساتھ لگ کر کہا۔

"تم گھبرانا بالکل مت۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہاری طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں اسے وہیں مار ڈالوں گی۔ اگر میں ناگن بن کر کسی کو پوری طرح سے ڈس دوں تو اس کا جسم اسی وقت پھٹ جائے گا۔"

ہم ابھی تک آگرہ کے لاری اڈے پر ہی بیٹھے تھے۔ وہیں ہم نے لی سٹال سے چائے کا ایک ایک گلاس لے کر پیا۔ ابھی سورج پوری طرح سے غروب نہیں ہوا تھا۔ دن کی روشنی ہلکی ہلکی سنہری ضرور ہونے لگی تھی۔ ہم لاری اڈے کے سائبان تلے بنچ پر بیٹھے تھے۔ دوسرے مسافر بھی ادھر ادھر اپنے اپنے سامان کو لئے بیٹھے تھے۔ ان مسافروں میں ایک گورے سانولے رنگ کا دبلا پتلا ادھیڑ عمر دیہاتی ٹائپ کا آدمی بھی تھا جو اپنی گٹھڑی سامنے رکھے فرش پر بیٹھا تھا۔ چائے کا گلاس اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا اور وہ اسے پھونکیں مار مار کر پی رہا تھا۔ اس مسافر کی طرف میرا دھیان اس لئے گیا کہ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیں گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک دو بار نظریں دوسری طرف کرنے کے بعد جب دوبارہ نظریں اس پر ڈالیں تو وہ مجھے اور پاروتی کو

گھورتا ہوا نظر آیا۔ نظریں ملتے ہی اس نے آنکھیں دوسری طرف کر لیں۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی متعصب ہندو ہے۔ اور اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور ایک ہندو عورت کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔ مگر میں نے پاروتی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ آگرہ سے آگے دھول پور اور گوالیار تک کوئی لاری نہیں جاتی تھی۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ آگرہ سے جھانسی تک ریل گاڑی میں سفر کیا جائے۔ ہمیں دلی پولیس کا زیادہ خطرہ بھی نہیں رہا تھا۔ ہم دلی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ چائے پینے کے بعد پاروتی کہنے لگی۔

"چلو ریلوے اسٹیشن پر چلتے ہیں۔ وہاں سے معلوم کرتے ہیں کہ جھانسی کو گاڑی کس وقت نکلتی ہے۔"

ہم نے تانگہ لیا اور متھرا کے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ میری نگاہ اس دیہاتی پر تھی جو ہمیں بار بار گھورتا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ متھرا کے بازاروں میں بھی ہندوستان کے آزاد ہونے کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ دکانوں پر کانگریس کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اس شہر میں ویسے بھی ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ تانگہ ایک آبادی سے گزرا جہاں خاموشی چھائی تھی۔ کوچوان ہندو تھا۔ کہنے لگا۔

"یہاں مسلمان رہتے ہیں۔ کل تک یہ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ آج خاموش ہیں۔ اب یہ ہمارے غلام ہیں بس۔ ہم ان کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ یہ یاد رکھیں گے۔"

میں نے آنکھیں بند کر کے دل میں دعا کی کہ یا اللہ یہاں کے مسلمانوں کو یہاں کے متعصب ہندوؤں سے بچانا۔ سٹیشن پر بھی کانگریس کے جلوس نکلے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا جھانسی کو جانے والی گاڑی رات کو جاتی ہے۔ ہم وہیں مسافر خانے میں ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہندو آزادی کی خوشی میں مٹھائی بانٹ رہے تھے۔ وہ ہمارے پاس بھی آئے۔ انہوں نے مجھے بھی ہندو سمجھ کر تھوڑی سی مٹھائی دی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک

Prepared By: S.Sohail Hussain

طرف سے ایک تانگہ آکر سٹیشن کے سامنے رکا۔ اس میں کچھ برقع پوش مسلمان خواتین دو مرد اور بچے سوار تھے۔ ابھی تانگہ رکا ہی تھا کہ چوک کی طرف سے ہندو غنڈوں کا ایک گروہ چھرے اور ڈنڈے لئے نعرے لگاتا نمودار ہوا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ گروہ تانگے کی طرف بڑھا۔ کچھ ان نے فوراً گھوڑے کو دوڑا دیا۔ ہندو غنڈے تانگے میں بیٹھی مسلمان عورتوں کو قتل کرنے کے لئے تانگے کے پیچھے دوڑے مگر خوش قسمتی ہوئی کہ تانگہ ان کی گرفت سے نکل گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"یہاں تو بلوہ شروع ہو گیا ہے۔"

وہ کہنے لگی "گھبراؤ نہیں میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔"

مگر اندر سے میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ پاروتی ناگن بن کر زیادہ سے زیادہ ایک دو حملہ آور ہندوؤں کو ہلاک کر سکتی تھی۔ وہ مجھے ہندوؤں کے ہجوم سے نہیں بچا سکتی تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی دیسائی آدمی جو لاری اڈے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا ایک طرف سے نکل کر ہمارے پاس آ رینگ گیا اور کہنے لگا۔

"ریلوے اسٹیشن پر ہندو غنڈوں کا حملہ ہونے والا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں میں آپ کو بچانے کے لئے آیا ہوں۔ میں گوالیار کا رہنے والا ہوں۔ یہاں آ کر میں بھی پھنس گیا ہوں۔"

پاروتی اور میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ہم مسلمان ہیں؟"

وہ بولا۔ "ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو پہچان لیتا ہے۔ آپ مجھ سے بحث نہ کریں۔ اگر زندگی پیاری ہے تو میرے ساتھ آ جائیں۔ یہاں رہے تو قتل ہو جائیں گے۔ سندر چوک میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی ہے۔ وہاں کتنے ہی مسلمان شہید ہو گئے ہیں۔"

پاروتی نے مجھ سے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ آدمی میرا ہمدرد ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ چلے چلنا چاہئے۔"

اس وقت میں بھی گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے ہندو غنڈوں کو مسلمانوں کے تانگے پر حملہ آور ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ہم اس دیسائی کے ساتھ چل پڑے۔ اس آدمی نے گٹھڑی بغل میں دبا رکھی تھی۔ وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے ہمیں کہہ دیا تھا کہ ہم زیادہ ادھر ادھر نہ دیکھیں۔ وہ ہمیں اسٹیشن کے عقب میں لے آیا۔ یہاں ایک طرف مکانوں کے پچھواڑے تھے اور ایک جانب کھیت تھے۔ ہم کھیتوں میں چلنے لگے۔ راستے میں ایک پیپل کا گھنا درخت آیا۔ جس کے تنے میں رام سیتا لچھمن کی مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور ایک سادھو بیٹھا پوجا پاٹھ کر رہا تھا۔ ہم اس کے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ کھیت ختم ہوئے تو ریلوے لائن آ گئی۔ ریلوے لائن کے پار میدان تھا۔ میدان میں سے گزرنے کے بعد وہ پراسرار دیسائی ہمیں مٹی کے ٹیلے کے پاس لے آیا۔ جہاں کسی حویلی کا ویران کھنڈر تھا۔ پراسرار دیسائی کہنے لگا۔

"یہاں ہم بالکل محفوظ ہیں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں تو جھانسی کی رات والی گاڑی پکڑنی ہے۔"

پراسرار دیسائی بولا۔ "رات کو میں خود تم لوگوں کے ساتھ سٹیشن پر جاؤں گا۔ مجھے بھی گوالیار جانا ہے۔"

پاروتی نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کیا کام کرتے ہو اور متھرا میں کیسے آئے ہو؟

دیسائی کہنے لگا۔ "میں بھی مسلمان ہوں۔ میرا نام عبداللہ ہے۔ میں گوالیار کے ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔ چوڑیاں پراندے چل پھر کر بیچتا ہوں۔ مہینے میں ایک بار چوڑیاں پراندے اور رنگدار دوپٹے خریدنے متھرا آتا ہوں۔ اور رات اسی کھنڈر میں بسر کرتا ہوں۔ اس بار آیا ہوں تو متھرا میں فسادات شروع تھے۔ لاری اڈے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ آپ لوگوں کو دیکھا۔ آپ کے چہرے مہرے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بھی مسلمان ہیں۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ اب ایسا ہے کہ ہم لوگ

Prepared By: S.Sohail Hussain

یہاں رات ہونے تک آرام کریں گے۔ میں نے پتہ کر لیا تھا گوالیار جانے کی گاڑی رات گیارہ بجے کے بعد جائے گی۔ اب تم لوگ یہاں بیٹھو میں ساتھ والے گاؤں سے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔"

پراسرار دیباتی ہمیں ویران حویلی کے کھنڈر میں بٹھا کر چلا گیا۔ اس کی گٹھڑی ہمارے پاس ہی پڑی تھی۔ ہم نے کھول کر دیکھا اس میں کانچ کی چوڑیاں اور رنگدار دوپٹے پڑے تھے۔

پاروتی نے پراسرار دیباتی کی گٹھڑی باندھ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"میری چھٹی حس کہتی ہے کہ اس آدمی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ آخر اس نے صرف تمہاری شکل دیکھنے سے کیسے اندازہ لگا لیا کہ تم مسلمان ہو؟"

تھوڑا بہت شک میرے دل میں بھی تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے فساد زدہ علاقے میں ہم دونوں کو ایک ہی طرف سے بیٹھا ہوا دیکھ کر قیاس لگایا ہو کہ ہم مسلمان ہیں اور چونکہ وہ خود مسلمان ہے اس لئے اسے ہم سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہو۔ جب میں نے اس خیال کا اظہار پاروتی سے کیا تو وہ بولی۔

"تم بہت سیدھے سادے آدمی ہو۔ میرے ساتھ رہ کر اتنی مصیبتیں اٹھانے کے بعد بھی تمہیں آدمی کی پہچان نہیں آئی۔ بہرحال ہمیں اس آدمی سے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

"وہ تو ہم ضرور ہوشیار رہیں گے۔"

پاروتی نے مجھے مشورہ دیا کہ میرے پاس جو رقم ہے وہ میں جیب سے نکال کر وہیں کھنڈر میں کہیں چھپا دوں۔ رات کو جاتی مرتبہ وہاں سے نکال لیں گے۔ اس کا یہ مشورہ مجھے پسند آیا۔ میں نے جیب سے رقم نکال کر دیکھی سو سو کے چار نوٹ اور اوپر کچھ ریزگاری اور کچھ روپے روپے کے نوٹ تھے۔ میں نے انہیں ایک رومال میں باندھ کر وہیں کونے میں ایک پتھر کے نیچے رکھ دیا۔ پھر ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

تھوڑی دیر کے بعد پراسرار دیسائی بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لفافہ تھا کہنے لگا۔
"متھرا شہر کے پرانے علاقے میں کرفیو لگ گیا ہے۔ یہ پوری کچوریاں میں قریبی
دکان سے لایا ہوں۔ وہاں ایک آدمی بتا رہا تھا کہ پرانے شہر میں ہندوؤں نے کئی
مسلمانوں کو شہید کر دیا ہے۔ ایک مسجد کو بھی آگ لگا دی ہے۔"
پاروتی ہندوؤں کی ذلت کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔
"مسلمانوں نے کئی سو سال تک ہندوؤں پر حکومت کی ہے۔ ہندو اب ہندوستان
کے مسلمانوں سے اس کا بدلہ لے رہے ہیں۔"
پراسرار دیسائی نے کہا "ہندو شروع ہی سے مسلمانوں کا دشمن رہا ہے۔ ہندوستان
کا کون سا ایسا شہر ہے جہاں ہولی اور شب برات کے موقع پر فساد نہیں ہوتے۔ ہندو تو
مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے۔"
اس دوران پراسرار دیسائی نے لفافے میں سے پوریاں، کچوریاں اور آلو کی بھاجی
نکال کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ یہ خاص ہندو کھانا تھا۔ جو مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا
تھا مگر اس وقت مجھے بڑی بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔ "کیا تم نہیں
کھاؤ گی؟"
مجھے معلوم تھا کہ ناگن بن جانے کی شکتی حاصل کر لینے کے بعد پاروتی کھانے پینے
اور سونے سے بیزار ہو چکی ہے۔ وہ بولی "مجھے بھوک نہیں ہے تم لوگ کھاؤ۔"
پراسرار دیسائی نے ایک کچوری پاروتی کو پیش کرتے ہوئے کہا۔
"بیٹی یہ کھا کر دیکھو۔ یہ تو خاص متھرا کا تحفہ ہے۔ یہ میں مسلمان کی دکان سے
لایا ہوں۔"
پاروتی نے مجبوراً کچوری لے کر کھائی۔ کچوریاں بڑی مصالحہ دار تھیں۔ میں تین
چار کھا گیا۔ میں نے دیکھا کہ پراسرار دیسائی صرف پوریاں کھا رہا ہے۔ کچوری کو اس
نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ جب میں نے اسے کچوریاں کھانے کو کہا تو وہ بولا۔
"مجھے حکیم جی نے کچوریاں کھانے سے منع کر رکھا ہے۔ مجھے شوگر کی بیماری

ہے۔"
پراسرار دیسائی یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ میں پانی لاتا ہوں۔ اس کے جانے کے بعد
میں نے پاروتی سے کہا۔
"ہم خوامخواہ اس پر شک کر رہے تھے۔ یہ تو بڑا نیک دل آدمی ہے۔"
پاروتی نے جمائی لی۔ میں نے کہا۔
"تمہیں تو نیند آ رہی ہے۔ یہ کیسے ہو گیا؟"
پاروتی نیند بھری آواز میں بولی۔
"معلوم نہیں۔ بڑی نیند آ رہی ہے۔"
اور وہ وہیں ایک طرف کو لڑھک گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا۔ وہ یا
تو سو رہی تھی یا بیہوش ہو گئی تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرا سر چکرایا اور
اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میرے آس پاس گھپ اندھیرا تھا۔
میرا سر ابھی تک بھاری تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں آنکھیں کھولنے کی
کوشش کی۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے پاروتی کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اب
مجھے اندھیرے میں دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں نہ پاروتی
تھی نہ ہی وہ پراسرار دیسائی تھا۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ زمین پر پوری اور
کچوریوں کے خالی پتے اور لفافہ پڑا تھا۔
اچانک مجھے خیال آیا کہ پراسرار دیسائی نے کچوریوں میں بیہوشی کی دوائی ملائی ہوئی
تھی۔ جس کی وجہ سے میں اور پاروتی بیہوش ہو گئے۔ وہ ضرور کوئی خاص قسم کا سانپوں
کا ماہر سپیرا تھا۔ جس نے پاروتی کو پہچان لیا تھا کہ اس عورت میں ناگن بن جانے کی
شکتی ہے۔ اسی لئے وہ ہمارے تعاقب میں لگ گیا تھا۔ اور ایک خاص منصوبہ بنا کر وہ
پاروتی کے بیہوش ہو جانے کے بعد اسے اٹھا کر لے گیا۔ ذرا میرا سر ہلکا ہوا تو میں کھنڈر
سے باہر نکل آیا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ دور دور تک اندھیرا اور سناٹا چھایا
ہوا تھا۔ مجھے اپنی چھپائی ہوئی رقم کا خیال آ گیا۔ میں دوڑ کر کھنڈر میں آیا۔ کونے میں

Prepared By: S.Sohail Hussain

پتھر ہٹا کر دیکھا۔ وہاں رومال میں بندھی ہوئی ساری رقم موجود تھی۔ نوٹ اور ریزگاری رومال میں سے نکال کر اپنے کرتے کی اندر والی خاص جیب میں رکھی اور سوچنے لگا کہ مجھے اس پراسرار دیسالی کو کہاں تلاش کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے اس نے سب جھوٹ بولا تھا کہ وہ گوالیار جا رہا ہے۔ اور وہاں گاؤں گاؤں پھر کر چوڑیاں اور عورتوں کے سنگھار کی چیزیں فروخت کرتا ہے۔ مجھے پراسرار دیسالی کی کٹیا یاد آ گئی۔ میں واپس کھنڈر میں گیا اور جھک کر پاؤں ادھر ادھر چلاتے ہوئے اندھیرے میں اسکی کٹیا تلاش کرنے لگا۔ وہ مجھے ایک طرف پڑی ہوئی مل گئی۔ میں اسے باہر لے آیا۔ اسے ایکبار پھر کھول کر دیکھا۔ ستاروں کی مدھم سی روشنی میں مجھے کٹیا میں سوائے کانچ کی چوڑیاں اور دوپٹوں کے اور کچھ بھی نہ ملا۔ میں نے کٹیا کو وہیں ایک طرف پھینک دیا اور سوچنے لگا کہ اس آدمی نے ہمیں دوپہر کے وقت پکوڑیاں کھلا کر بے ہوش کیا تھا اور اس وقت رات ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تو اب تک بے ہوش پاروتی کو لے کر کہیں کا کہیں نکل چکا ہو گا۔ ظاہر ہے پاروتی بے ہوش ہی ہو گی۔ ہوش میں آنے کے بعد تو وہ ناگن بن کر ایک سیکنڈ میں اس آدمی کو ہلاک کر سکتی تھی اور واپس بھی آ جاتی۔ اگر وہ اب تک کھنڈر میں واپس نہیں آئی تو اس کا مطلب ہے کہ یا تو وہ ابھی تک بے ہوش ہے یا اس آدمی نے اسے مزید بے ہوشی کی کوئی دوائی پلا دی ہو گی یا انجکشن لگا دیا ہو گا۔ اگر مجھے رات کے وقت ہوش آیا تھا تو یقیناً پاروتی کو بھی اس وقت ہی ہوش آیا ہو گا۔ اگر پراسرار دیسالی پاروتی کو مزید دوائی یا انجکشن لگا کر بے ہوش نہیں کر سکا تو پاروتی ضرور اب تک ناگن بن کر اسے ہلاک کر چکی ہو گی اور ممکن ہے کہ میرے پاس واپس کھنڈر میں چلی آ رہی ہو۔ مگر وقت کافی نکل گیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس وقت وہ آدمی بے ہوش پاروتی کو کسی لاری یا ریل گاڑی میں ڈال کر کہاں پہنچ چکا ہو۔ وہ لاری یا ریل گاڑی کے مسافروں کو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا تھا کہ یہ میری بیمار بیٹی ہے۔ بے ہوش ہو گئی ہے۔ اسے دوسرے شہر کے کسی خاص ہسپتال میں علاج کے لئے لے جا رہا ہوں۔

میں ایک دوراہے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف جاؤں۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ مجھے کھنڈر میں کچھ دیر رک کر پاروتی کا انتظار کر لینا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے اس نے ہوش میں آنے کے بعد ناگن بن کر پراسرار دیسالی کو ہلاک کر ڈالا ہو اور اب ناگن کے روپ میں یا عورت ہی کی شکل میں کھنڈر کی طرف واپس چلی آ رہی ہو تاکہ مجھ سے دوبارہ آ کر مل جائے اور مجھے اپنی روداد سنائے۔ پاروتی کے ساتھ جو گزری تھی وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بعد میں اب پاروتی نے مجھے سارا قصہ سنایا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں ماورائیت کی دنیا میں داخل ہو چکا تھا اور اب عقل کو حیران کر دینے والے واقعات سامنے آ رہے تھے۔ میں وہیں کھنڈر کے باہر ایک طرف بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ رات بڑی حبس آلود تھی ذرا سی ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ویسے بھی مجھے اس وقت فساد زدہ شہر کی طرف جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ شہر کے کس حصے میں کرفیو لگا ہے کہاں نہیں لگا ہوا۔ سوچا رات اسی کھنڈر میں گزارنی چاہیئے دن نکلے تو واپس لاریوں کے اڈے پر جا کر معلوم کروں گا کہ یہ پراسرار آدمی کون تھا۔ شاید وہاں ایک آدھ ایسا آدمی مل جائے جو اسے جانتا ہو۔ کیونکہ اب میرا جھانسی کی طرف جانا بیکار تھا۔ پاروتی کے بغیر میں جھانسی جا کر کیا کرتا۔

کسی نہ کسی طرح کبھی اونگھ کر کبھی اٹھ کر بیٹھتے ہوئے میں نے رات گزار دی۔ آسمان پر صبح کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تو میں کھنڈر سے نکل کر متھرا شہر کی طرف چل پڑا۔ جس طرف سے وہ آدمی ہمیں لے کر آیا تھا میں اسی راستے سے ہوتا ہوا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ یہاں دیکھا کہ سٹیشن کے باہر اور اندر سینکڑوں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے ہجوم کی شکل میں بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ متھرا شہر کے مسلمان ہیں جو بلوائی ہندو سکھوں سے کسی طرح جانیں بچا کر گھروں سے بھاگ کر سٹیشن پر آ گئے ہیں اور دوسرے شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

سڑکوں پر ہندوؤں کی ٹولیاں رام شری گیت گاتی گزر رہی تھیں۔ میں نے ایک رکشا والے سے کہا۔

"بھیا مجھے گوالیار والے لاری اڈے پر پہنچا دو۔"

وہ بولا۔ "دس روپے لوں گا۔"

میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا اور رکشے میں بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگا۔

"شہر کے اندر بلوہ ہو رہا ہے۔ باہر سے لے کر چلتا ہوں گا۔"

وہ شہر کے باہر والی سڑک پر سے ہوتا ہوا خدا جانے کون کون سے راستوں سے رکشا نکال کر آخر اسی لاری اڈے پر پہنچ گیا جہاں میں نے پہلی بار اس پراسرار آدمی کو دیکھا تھا۔ لاری اڈے پر بھی مسافروں کا کافی رش تھا۔ ظاہر ہے یہ سب مسلمان تھے جو جان بچا کر ہندوؤں کے متعصب ترین شہر متھرا سے جانیں بچا کر دوسرے شہروں کو بھاگ رہے تھے۔ میں اس جگہ پر آ گیا جہاں وہ پراسرار آدمی بیٹھا گلاس میں چائے پی رہا تھا۔ قریب ہی چائے کا کھوکھا تھا جہاں پان سگریٹ بھی بکتے تھے۔ اوپر ہندی اور اردو میں لکھا تھا۔ "ہمارا داس پان سگریٹ شاپ۔"

میں نے ہندو بن کر کھوکھے والے کو نمسکار کیا اور کہا۔

"مہاراج! کل یہاں ایک آدمی زمین پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے پاس ایک گٹھڑی بھی تھی۔ کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہ آدمی کون تھا۔"

میں نے یونہی اللہ توکل اس سے یہ سوال پوچھ لیا تھا کیونکہ لاری اڈے پر دن میں سینکڑوں آدمی چائے پینے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دکاندار کس کو یاد رکھ سکتا ہے۔ میری توقع کے خلاف کھوکھے والے ہندو لالے نے گلاس میں چمچ ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا کام ہے بھیا؟"

مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"مہاراج! بات یہ ہے کہ کل میں نے اسی لاری اڈے پر اس آدمی سے اپنی بچی کے لئے چاندی کی چار چوڑیاں خریدی تھیں۔ گھر جا کر معلوم ہوا کہ وہ تو لوہے کی چوڑیاں ہیں۔ ان پر چاندی کا پانی پھرا ہوا ہے۔"

کھوکھے والا ہنس کر بولا۔

"وہ بڑا نوسرباز چلتر باز ہے۔ بھیا تم مارے گئے۔ اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

میں نے لہجہ بڑا عاجزانہ بنا کر کہا۔

"مہاراج! وہ مجھ سے دھوکہ کر کے پچاس روپے لے گیا ہے۔ اگر آپ اس کا کوئی اتہ پتا بتا دیں تو میں اس سے ایک ایک پائی وصول کر لوں گا۔"

کھوکھے والا ایک گاہک سے بھی گفتگو کر رہا تھا۔ میری طرف تھوڑی دیر کے لئے متوجہ ہو کر بولا۔

"بھیا! اس کا نام رام داس ہے۔ وہ پہلے شہر کی گلیوں میں سانپوں کا تماشہ دکھایا کرتا تھا۔ یہ دھندا نہ چلا تو وہ اصلی نقلی چوڑیاں گلی گلی بیچنے لگا۔ مجھے اس کے ٹھکانے کا پتہ نہیں۔ تم ایسا کرو کہ یہاں سے کوسی پور کو جو سڑک جاتی ہے اس کے دسویں یا گیارہویں میل پر ایک اونچا ہوا کنواں آتا ہے۔ وہاں گنیش جی کا چھوٹا سا مندر ہے۔ اس کے پجاری سے رام داس کا پوچھ لینا شاید وہ تمہیں اس چلتر باز کا کوئی اتہ پتہ بتا دے۔"

میرے لئے یہ کافی سے زیادہ معلومات تھیں۔ میں نے لاری اڈے پر ہی چائے اور پوریوں کا ناشتہ کیا اور پوچھتا پوچھتا متھرا سے جو کوسی پور کو سڑک جاتی تھی اس پر آ گیا۔ یہ پھسلی پتلی سڑک تھی۔ دونوں طرف درخت تھے۔ ان کے پیچھے آبادیاں تھیں۔ دس گیارہ میل کا سفر تھا۔ میں نے ایک تانگہ کرا لیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ تانگہ سڑک پر ایک خاص رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ یہ تانگہ لاہور کے تانگوں کی طرح کا نہیں تھا بلکہ یکہ تھا جس پر سفر کرنا اپنے

Prepared By: S.Sohail Hussain

تپ کر سیت میں اگلے کے برابر تھا۔ لیکن سڑک پاتھ تھی اس لئے ہچکولے زیادہ نہیں لگ رہے تھے۔

دسویں گیارہویں میل کے درمیان اٹکا ہوا کنواں آگیا۔ یہ ایک بڑا سا گول کنواں تھا جس پر چھت ڈالی ہوئی تھی۔ ایک طرف سے اس کا منہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ وہاں گدی بچھا کر ایک ہندو لالہ بیٹھا لوگوں کو پانی پلاتا تھا۔ قریب ہی برگد کے گھنے درخت کے پہلو میں چھوٹا سا مندر تھا۔ مندر کے باہر کئی ایک پنڈھاری جوگی جسم پر راکھ مل کر بیٹھے سنگھ دھونی رما رہے تھے۔ عورتیں ان کی جلوہ پوری سے سیوا کر رہی تھیں۔ ان میں سے دو ایک سادھو بالکل ننگے تھے۔ میں مندر کے پجاری کا پوچھ کر اس کے پاس پہنچا۔ میں نے وہاں اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا۔ پجاری کی توند واقعی بہت موٹی اور مٹکے کی طرح پھولی ہوئی تھی۔ وہ پیتل کی تھالی پاس رکھے مورتی کے پاس بیٹھا پوجا کرنے والوں سے پیسے وصول کر کے انہیں گینڈے کا ایک ایک پھول دیتا جاتا تھا۔ جب میں نے اسے ذرا فارغ دیکھا تو اس کے پاس جا کر ہندوؤں کی طرح نمسکار کیا اور کہا۔

"مہاراج! میں گوالیار سے آیا ہوں۔ رام داس چوڑی والے کو ملنا چاہتا ہوں میرے پتا جی سخت بیمار ہیں۔ رام داس چوڑی والے کے بارے میں سنا ہے کہ اس کے پاس جوڑوں کے درد کی بڑے اچھی دوائی ہے۔ مجھے اس کا پتہ بتا دیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہو گی۔"

پجاری نے گول گول آنکھیں گھما کر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر مورتی کے اوپر رتن جوت کے پھولوں کا ہار چڑھاتے ہوئے کہا۔

"اسی رام داس کا پوچھتے ہو جو بگی ابھی ہے؟"

بگی سے اس کا مطلب پہیے سے تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں مہاراج اسی رام کا پوچھ رہا ہوں۔"

پجاری نے کہا

"اس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ تو ہے نہیں۔ کبھی کبھار ادھر سے گزرتا ہے۔ تم ایسا کرو

بھیا۔ یہاں سے اتر کی طرف جاؤ۔ آگے سڑک کی بائیں جانب مڑ جانا۔ رانی کی حویلی آئے گی۔ وہاں تانگیوں کے کچھ جھونپڑے ہیں۔ رام داس تمہیں وہیں ملے گا۔"

میں نے پجاری کو دھنیاد کہہ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور سڑک پر آ کر شمال کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ حبس کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو گیا۔ وہیں درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ ایک سواریوں والا یکہ ادھر سے گزرا تو اس میں سوار ہو گیا اور کوچوان سے کہا۔

"بھیا جی! مجھے رانی کی حویلی کے پاس اتار دینا۔"

دیہاتی ٹائپ کی سواریوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ خدا جانے رانی کی حویلی میں کون سی پراسرار بات تھی۔ یکہ ٹک ٹک کرتا سڑک پر رواں تھا۔ میں اگلی سیٹ پر دو سواریوں کے درمیان سٹ کر بیٹھا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد مجھے بائیں جانب ویران سے علاقے میں کچھ درختوں کے درمیان ایک پرانی عمارت نظر آئی۔ یکے والے نے یکہ روک دیا اور کہا۔

"وہ سامنے رانی کی حویلی ہے بھیا۔"

میں یکے سے اتر کر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف چلا جن کے درمیان پرانی عمارت نظر آ رہی تھی۔ پجاری نے کہا تھا کہ اس حویلی کے پاس کچھ جھونپڑیاں ہیں وہیں پراسرار دیہاتی یعنی رام داس آتا جاتا ہے۔ حویلی کھنڈر بن چکی تھی۔ بارش اور دھوپ نے شکستہ دیواریں سیاہ کر دی تھیں۔ بڑے دروازے کے دونوں پٹ غائب تھے۔ اور دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچی گھاس اگ رہی تھی۔ میں حویلی کے قریب سے گزرا تو اندھیری ڈیوڑھی میں سے ایک کالی بلی نکل کر درختوں کی طرف بھاگ گئی۔

حویلی کے پیچھے مجھے نیم کے درختوں کے نیچے تین چار جھونپڑیاں دکھائی دیں۔ قریب گیا تو ایک بوڑھا آدمی جھونپڑی کے باہر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ ذرا پرے دو عورتیں برتن دھو رہی تھیں۔ یہ لوگ خانہ بدوش قسم کے تھے۔ میں نے بوڑھے کو نمسکار کیا۔ اس نے بھنویں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"کیا بات ہے یہ کس سے ملتا ہے؟"

میں نے رام داس کا نام بتایا تو بوڑھے نے حویلی کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں حویلی میں دیکھو۔ وہ کل آیا تھا۔ حویلی میں تھوڑی دیر رہا۔ پھر چلا گیا۔ کیوں کیا بات ہے؟ رام داس تو سپیرا ہے۔ اس سے تمہیں کیا کام پڑ گیا بابو؟"

میں نے کہا۔ "بس ایک ضروری کام پڑ گیا تھا۔ کچھ معلوم ہے وہ کدھر گیا ہو گا؟"

بوڑھے نے سر ہلایا۔ "کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ اکیلا آیا تھا یا اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی؟"

بوڑھا حقے سے نارئیل پی رہا تھا۔ بولا۔

"کیا تھا۔ عورت اس کے پاس کہاں سے آئے گی؟"

میں نے سوچا کہ حویلی کے کھنڈر میں چل کر دیکھنا چاہئے شاید وہاں پاروتی کا کوئی سراغ مل جائے۔ میں حویلی کی طرف چل پڑا۔ حویلی جتنی باہر سے خستہ حال تھی اس سے زیادہ اندر سے بوسیدہ اور ویران تھی۔ میں صرف اس یقین میں اس کے پاس گیا تھا کہ پراسرار دیسائی اگر یہاں آیا تھا تو پاروتی بھی بے ہوشی کی حالت میں اس کے پاس ہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی کھوج مل جائے۔ حویلی کی کوٹھریوں میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کسی کوٹھری کا دروازہ سلامت نہیں تھا۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتی تھیں۔ میں بڑے غور سے جائزہ لیتا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں آ گیا۔ یہاں ایک دالان تھا۔ فرش اکھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف برآمدہ تھا۔ پیچھے دو کوٹھریاں نظر آئیں جن میں سے ایک کا دروازہ غائب تھا۔ دوسری کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ دروازہ کھولا تو اندر سے لوبان کی تیز خوشبو آئی۔ کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ دروازہ کھولنے سے دالان کی تھوڑی سی روشنی اندر پڑی۔ کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ کوٹھری میں مٹی کے دو مٹکوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ مٹکے درمیانے سائز کے تھے اور ان کے منہ کپڑا لپیٹ کر بند کئے ہوئے تھے۔ میں ایک مٹکے کے پاس آ کر اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ مٹکے کے منہ پر کپڑا خوب کس کر باندھا گیا تھا۔ اس کے گرد رسی باندھ کر اسے مزید مضبوط کر دیا گیا

تھا۔ میں نے مٹکے کو ہلایا کہ کہیں اس کے اندر کوئی پرانا بزرگ نہ ہو۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ میں دوسرے مٹکے کے پاس آ گیا۔ اسے بھی ہلا جلا کر دیکھا۔ اندر سے مٹکے خالی لگتے تھے۔ اگر اندر کوئی شے ہوتی تو ہلانے جلانے سے ضرور آواز پیدا ہوتی مگر کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں کوٹھری سے نکل کر واپس دالان میں آیا تو مجھے سیڑھیوں میں دو آدمیوں کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ دونوں آدمی باتیں کرتے اوپر آ رہے تھے۔ وہاں چھپنے کے لئے سوائے مٹکوں والی کوٹھری کے اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں دوڑ کر کوٹھری میں آ گیا۔

کوٹھری میں اوپر چھت کے ساتھ چھوٹی سی پرچھتی بنی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور اچھل کر پرچھتی پر چڑھ کر اس کے اندر سمٹ سمٹا کر چھپ کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ دونوں آدمی دالان میں سے گزر کر اوپر حویلی کی چھت کی طرف چلے جائیں گے۔ مگر وہ سیدھے اسی کوٹھری کی طرف آئے جس کی پرچھتی میں میں چھپا ہوا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ دالان کی روشنی میں دو آدمیوں کو دیکھا جنہوں نے سروں پر گیروے صافے باندھ رکھے تھے۔ کندھوں پر سپیروں والے جھولے لٹک رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بین تھی۔ دونوں سپیرے لگ رہے تھے۔ وہ کوٹھری کے اندر آ کر مٹکوں کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔

"دروازہ تو بند کر دو۔"

دوسرے سپیرے نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے سے دالان کی روشنی جو اندر آ رہی تھی رک گئی اور کوٹھری میں اندھیرا چھا گیا۔ میں بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ مجھے ڈر بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر ان لوگوں کو میری موجودگی کا علم ہو گیا تو خدا جانے میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ دونوں سپیرے بچے لگتے تھے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کوٹھری میں کیا کرنے آئے ہیں۔ اندھیرے میں اب وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اتنے میں ایک سپیرے نے دوسرے سے کہا۔

"ارے گنگوا دیا تو جلا لے۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

پھر ماچس کی تیلی جلانے کی آواز آئی۔ کوٹھری میں جلتی ہوئی دیا سلائی کی روشنی ہو گئی۔ سپیرے نے چراغ نکال کر سامنے رکھ لیا تھا۔ اس نے چراغ روشن کر دیا۔ میں سانس روکے یہ ساری کارروائی خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جس سپیرے نے چراغ جلایا تھا وہ بین کو کپڑے سے صاف کرنے لگا۔ دوسرے سپیرے نے پہلے ایک تھیلے کا منہ کھولا۔ اندر ہاتھ ڈالا تو سانپ کی پھنکار کی آواز نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ اس نے ہاتھ تھیلے سے باہر نکالا تو ایک کالے رنگ کا سانپ اس کی کلائی سے لپٹا ہوا تھا۔ اسی طرح اس نے دوسرے تھیلے کا منہ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا اور اس میں سے بھی سانپ نکال لیا۔ پھر دونوں سانپوں کو اس نے زمین پر چھوڑ دیا۔ دونوں سانپ زمین پر آتے ہی کنڈلی مار کر ایک دوسرے کے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ پہلے سپیرے نے بین بجانی شروع کر دی۔ دوسرا سپیرا رومال سے دونوں سانپوں کو چھیڑنے لگا۔ دونوں سانپوں نے پھنکارتے ہوئے اپنے پھن کھول دیئے اور بین کی آواز یا بین کے ادھر ادھر لہرانے پر جھولنے لگے۔ سانپ جھومتے ہوئے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ لگ جاتے۔ کبھی ایک سانپ دوسرے سانپ کے گرد چکر لگانے لگ جاتے۔ یہ کھیل کوئی دس پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ مجھے چھتی میں گھس کر بیٹھے بیٹھے پسینہ آنے لگا تھا۔ اب میں پہلے سے زیادہ خوف زدہ تھا کیونکہ پکڑے جانے کی صورت میں یہ لوگ مجھ پر سانپ چھوڑ سکتے تھے اور وہاں میری لاش کو بھی کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

جب سانپوں کو نچانے اور رجھانے کا کھیل ختم ہوا اور سپیرے نے بین بجانی بند کر دی اور دوسرے سپیرے نے سانپوں کو اٹھایا اور باری باری اپنے اپنے تھیلوں میں بند کر کے اوپر کپڑا لپیٹ دیا۔ پھر دونوں جلتے ہوئے دیئے کے پاس بیٹھ گئے اور بیڑیاں نکال کر پینے لگے۔ ایک سپیرے نے کہا۔

"بھئی بھائی! رام داس قسمت کا بڑا دھنی نکلا۔ سنا ہے ناگن ماتا کی کوئی ناگن عورت اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔"

دوسرے سپیرے نے بیڑی کا کش لگا کر کہا۔

"سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر یقین نہیں آیا۔ کہاں رام داس چور اچکا سپیرا اور کہاں ناگن ماتا کی ناگن عورت——"

پہلے سپیرے نے کہا۔

"ارے رام داس تو میشور میں اہلیا بائی کی چھتری والی سلوہ میں چلہ کاٹ رہا ہے کہ ناگن عورت کی شکتی اس میں آ جائے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے کبھی یقین نہیں تھا کہ اس ویران حویلی کی پرچھتی میں چھپے چھپے گوہر مراد مل جائے گا اور پراسرار دیہاتی سپیرے اور پاروتی کا سراغ معلوم ہو جائے گا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔ مگر اس کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھ کر دوسرے سپیروں کی باتیں کرتے رہے اور پھر دیا بجھا کر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ وہ دروازہ بند کر گئے تھے۔ میں پرچھتی سے نیچے اترا اور سوچنے لگا کہ یہ میشور کہاں ہے جہاں اہلیا بائی کی چھتری والی سلوہ ہے کیونکہ پاروتی کی تلاش میں اب مجھے وہاں جانا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

Prepared By: S.Sohail Hussain

گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ کم بخت گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ میں بیٹھا رہا۔ آخر شام کے کوئی سات یا سات بجے گاڑی آئی۔ گاڑی میں بہت زیادہ رش تھا۔ دلی میں ابھی فسادات شروع ہو چکے تھے۔ وہاں سے اور آس پاس کے علاقوں سے مسلمان بھاری تعداد میں بمبئی کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ میں بھی ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ متھرا سے کھنڈوہ تک کا بڑا لمبا سفر تھا۔ راستے میں گوالیار آیا۔ جھانسی آیا۔ بھوپال آیا۔ ہوشنگ آباد آیا۔ اس طرح سفر کرتے کرتے گاڑی ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد دوسرے دن رات کے ایک بجے جا کر کہیں کھنڈوہ پہنچی۔ اس طرف حالات بڑے پرسکون تھے۔ مشرقی پنجاب دلی اور متھرا کے مقابلے میں یہاں کافی امن امان تھا۔ اگرچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے کی یہاں بھی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ مجھے ہندوستان اور اس کی آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میں تو پاروتی کی تلاش میں وہاں آیا تھا اور اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خدا کرے جہاں میں جا رہا ہوں وہ مل جائے۔ سٹیشن پر سے ہی میں نے کھرگون اور میشور شہر کے بارے میں معلوم کیا کہ وہاں سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ مجھے ساری معلومات مل گئیں۔ مجھے کھنڈوہ سے بس میں سفر کر کے کھرگون اور وہاں سے میشور پہنچنا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

میں وہیں مسافر خانے میں ایک طرف پڑ کر سو گیا۔ صبح کافی دن چڑھے آنکھ کھلی۔ ریلوے کے ریفریشمنٹ روم کے غسل خانے میں جا کر نہایا۔ سٹیشن کی کینٹین پر آ کر تھوڑا بہت کھایا پیا اور پوچھ گچھ کرتے کرتے اس لاری اڈے پر آ گیا جہاں سے کھرگون اور میشور کو بسیں جاتی تھیں۔ یہ پرانی قسم کی کھڑکھڑا ٹائپ کی لاریاں تھیں ان کی چھتوں پر بھی مسافر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک بس کھرگون قصبے کی طرف جا رہی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ آدھ گھنٹے بعد کھرگون پہنچا۔ وہاں سے ایک دوسری بس پکڑی اور دریائے نربدا کے کنارے پر آباد میشور پہنچ گیا۔

یہ ریاست ملکر کا ایک بڑا قصبہ تھا۔ شہر نہیں تھا۔ کچے پکے مکان تھے۔ آبادی

میں حویلی سے نکلا اور متھرا کو جانے والی سڑک پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے ایک سواریوں والے یکے میں بیٹھ کر متھرا شہر واپس آ گیا۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میشور دھام کا شہر کہاں ہے جہاں اہلیا بائی کی چھتری والی سمادھ ہے۔ یہ معلومات مجھے ریلوے سٹیشن سے ہی مل سکتی تھیں۔ چنانچہ میں متھرا کے ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔ وہاں انکوائری سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ پہلے مجھے کھنڈوہ جانا پڑے گا۔ وہاں سے کھرگون جانا ہو گا۔ کھرگون میں دریائے نربدا کے کنارے سے ریاست ملکر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ ریاست کی سرحد پر پہلا شہر میشور آتا ہے۔ اسی شہر کے باہر ایک پہاڑی پر اہلیا بائی کی چھتری والی سمادھ ہے۔ یہاں ایک پرانا قلعہ بھی ہے۔ ریلوے کے انکوائری کلرک نے بتایا کہ کھنڈوہ جانے والی گاڑی شام کو پیچھے دلی سے آئے گی۔ جتنی معلومات کی مجھے ضرورت تھی وہ مجھے مل گئی تھیں۔ سب سے پہلے مجھے کھنڈوہ جانا تھا۔ ست پڑا کے جنگلاتی علاقے میں واقع یہ شہر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں وہیں سٹیشن پر ہی بیٹھ گیا۔ دوپہر کا کھانا بھی سٹیشن پر ہی کھایا۔ سٹیشن پر اب قدرے امن امان تھا۔ فسادات کی وجہ سے شہر کے جو مسلمان خاندان گھر بار چھوڑ کر سٹیشن پر آ گئے تھے وہ دوسرے شہروں کو جا چکے تھے۔

سٹیشن پر بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی۔ ٹکٹ والی کھڑکی کھل گئی۔ میں نے متھرا سے کھنڈوہ تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا اور جس پلیٹ فارم پر گاڑی کو آنا تھا وہاں آ کر

Prepared By: S.Sohail Hussain

ٹیلوں پر اور ٹیلوں کے دامن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ قصبہ اپنے پرانے قلعوں اور محلوں اور حویلیوں کے کھنڈرات کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور سارا سال سیاح یہاں آتے رہتے ہیں۔ میں نے الیاباتی کی سلوہ کا ایک آدمی سے پوچھا اس نے دور ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"وہ چھتری دیکھ رہے ہو بابو۔ بس وہی الیاباتی کی چھتری والی سلوہ ہے۔"

یہ سلوہ ایک پہاڑی پر واقع ہے اور راستہ درختوں کھیتوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ میں اسی وقت سلوہ کی طرف چل پڑا۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر بنے ہوئے مکانوں کی چھتیں نیچی تھیں۔ کہیں کہیں سرخ کھپریل کی ڈھلوان چھتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں پیدل چلا جا رہا تھا کھیت ختم ہوئے تو جنگلی جھاڑیاں شروع ہو گئیں۔ پھر درختوں کے جھنڈ آ گئے۔ ان کے آگے دریائے نربدا بہہ رہا تھا۔ اس دریا کو وہاں نربدا ندی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دریا کا پاٹ ہمارے پنجاب کی کسی بڑی نہر جتنا ہی تھا۔ اوپر ایک پل بنا ہوا تھا۔ ایک طرف گھاٹ بھی تھا جہاں سے کشتیاں دوسرے کنارے پر جاتی تھیں۔ میں پل پر سے ہو کر دریا کے دوسرے کنارے پہنچا۔ وہاں سے اس پہاڑی کی چڑھائی شروع ہو جاتی تھی جس کے اوپر الیاباتی کا سلوہ تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر سلوہ کی چھتری دکھائی دے رہی تھی۔

پہاڑی چھوٹی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے میں میں اوپر پہنچ گیا۔ یہ سلوہ وہاں کے لوگوں کے مطابق راجہ بھوج کی بیوی کا تھا مگر اس کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ یہ صدیوں پرانی عمارت تھی۔ عمارت کی ایک جانب چھوٹا سا میوزیم بھی تھا جہاں شیشے کے شو کیسوں میں نوادرات رکھے ہوئے تھے۔ سیاح ان کی تصویریں اتار رہے تھے۔ میں بہت تھک ہو کر چل پھر رہا تھا۔ اگر پراسرار دیسائی سپیرا یہاں موجود تھا تو وہ مجھے دیکھ کر وہاں سے فرار بھی ہو سکتا تھا اور پاروتی جس حالت میں بھی اس کے ساتھ تھی وہ اسے اپنی ساتھ بھگا کر لے جا سکتا تھا۔ میں سیاحوں کے درمیان چہرہ چھپانے کی کوشش کرتا ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں سوائے غیر ملکی سیاحوں اور دو ایک گارڈز کے اور کوئی

کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ اگر پراسرار سپیرا رام داس یہاں آ چکا ہے تو وہ کہاں ہو گا؟ یہاں کوئی جگہ ایسی ہے کہ جہاں وہ پاروتی کی طاقت حاصل کرنے کے لئے چلہ کاٹ رہا ہے؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور ان کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بہرحال مجھے پراسرار سپیرے کو ہر حالت میں تلاش کرنا اور اس کے قبضے سے پاروتی کو آزاد کرانا تھا۔ میں عمارت کی پچھلی طرف آ گیا۔ یہاں پہاڑی کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا گلی نما راستہ سلوہ کی عمارت کے شمال کی طرف کسی قلعے کے کھنڈر کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے کی دونوں جانب پتھر کی مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ساری کی ساری مورتیاں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ ان کی شکلیں غیر انسانی تھیں۔ ایک مورتی کی پتھر کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ میرے دل میں اس مورتی کو توڑنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ میں وہیں رک گیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا کہ وہاں کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ یہ تنگ راہداری ساری خالی پڑی تھی۔ میں نے مورتی کی زبان کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا مگر وہ تو پتھر کی تھی۔ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلی۔ فرش پر ایک جگہ پتھر پڑا تھا۔ میں نے پتھر اٹھا لیا۔ سوچا سب سے پہلے اس کافر مورتی کی زبان توڑتا ہوں۔

میں نے پتھر زور سے مورتی کی زبان پر مارا۔ مورتی کی زبان اس ضرب سے تھوڑی سی ٹوٹ گئی۔ میں دوسری ضرب لگانے لگا تو اچانک مورتی کے پاؤں کے نیچے پتھر کی دیوار کی ایک سل اپنی جگہ سے گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ پہلے تو میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر غور سے اس چوکور روشندان کی طرح کے سوراخ کو دیکھنے لگا جو دیوار میں فرش سے تھوڑا اوپر نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے جھک کر سوراخ کے اندر دیکھا۔ اندر سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں اور وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے نیچے کوئی تہہ خانہ ہو جہاں پاروتی بے ہوش یا قید میں پڑی ہو۔ یہ خیال قدرت کی طرف سے میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے اللہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

تھام لیا اور سوراخ میں داخل ہو کر دیوار کو پکڑ پکڑ کر دو تین سیڑھیاں نیچے اتر گیا۔ جیسے جیسے نیچے اتر رہا تھا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا تھا۔ سیڑھیاں بھی نیچے اترتی جا رہی تھیں۔ میں نے ہمت نہ ہاری۔ دل کو مضبوط کیا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھا اور ساری سیڑھیاں اتر گیا۔ میرے پاؤں فرش کے ساتھ ٹکرائے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ واقعی مجھے اپنے ہاتھ بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں ٹٹول کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اندھیرے میں جتنی آنکھیں کھول سکتا تھا کھول کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر مجھے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ سوچا خوامخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ مجھے واپس چلے جانا چاہئے۔ اوپر دیکھا۔ سیڑھیوں کے اوپر جو روشندان تھا جو کور سوراخ تھا وہ شاید اپنے آپ بند ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس میں سے دن کی روشنی اندر نہیں آ رہی تھی۔ میں واپس جانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف مڑنے لگا تو مجھے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے سسکی بھری ہو۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر میں اندھیرے میں تہہ خانے کی دیوار کے ساتھ لگ کر وہیں کھڑا رہا۔ اچانک دوسری بار پھر سسکی بھرنے کی آواز آئی۔ میں نے سانس روک لیا اور اپنے کان آواز پر لگا دیئے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سسکی کی آواز کس کی ہو سکتی ہے۔ تیسری بار سسکی کی آواز سسکار میں بدل گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جیسے کوئی سی سی کر رہا ہو۔ پھر سسکاروں کے درمیان پھنکار کی آواز سنائی دی۔

دہشت کے مارے مجھے پسینہ آ گیا۔

یہ یقیناً کوئی زہریلا سانپ تھا جس نے اندھیرے میں مجھے دیکھ لیا تھا اور اب سسکارتا پھنکارتا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں تیزی سے اندازہ لگا کر سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ میں اسی وقت مجھے کسی کے گہرا سانس بھرنے اور کسی کو پکارنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ پاروتی کی آواز تھی۔ میں نے فوراً بلند آواز میں کہا۔

"پاروتی! تم کہاں ہو؟"

اس اندھیرے تہہ خانے کی ہیبت یقیناً اوپر تھی۔ کیونکہ میری آواز نے کافی گونج پیدا کی تھی۔ دوسری جانب سے مجھے پاروتی نے کمزور اور نحیف آواز میں میرا نام لیا۔

"انور! انور! یہاں آؤ!"

اب میں آپ کو بتاتے رہتا ہوں کہ میں نے پاروتی کو اپنا نام انور بتایا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ میرا نام نہیں ہے۔ محبت، جنگ اور پردیس میں آدمی کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

پاروتی کی آواز نے مجھے ایک دم شیر دل بنا دیا۔ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

"تم کہاں ہو؟"

پاروتی کی آواز آئی۔

"آ جاؤ۔ آ جاؤ۔ تہہ خانے میں۔۔۔"

وہ رک رک کر بول رہی تھی جیسے اسے بڑی کوشش کر کے بولنا پڑ رہا ہو۔ آواز بھی کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آگے کوئی دوسرا تہہ خانہ بھی تھا۔ میں دیوار کو ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ دیوار ختم ہو گئی۔ میں وہیں بیٹھ کر ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا۔ نیچے ایک اور سیڑھی تھی۔ میں سیڑھیاں اتر گیا۔ یہ پتھر کی سیڑھیاں تھیں اور چار پانچ ہی تھیں۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو آگے پتھریلا فرش تھا۔

پاروتی کی سسکار کی آواز برابر آ رہی تھی اور میں اسی آواز کی سمت آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اندھیرے تہہ خانے کے فرش پر پاؤں کے بل بیٹھا تھا۔ میں نے آواز دی۔

"پاروتی! تم کہاں ہو؟ میں تہہ خانے میں پہنچ گیا ہوں۔"

ایک لمبی سسکار کے ساتھ پاروتی کی کمزور اور رکتی ہوئی آواز آئی۔

"میں پٹاری میں بند ہوں۔ میں ناگن کی شکل میں ہوں۔"

میرے خدایا۔ بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا

Prepared By: S.Sohail Hussain

اور اندھیرے میں دیوار کو تلاش کر کے اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ میرے پاؤں فرش پر رکھی کسی چیز سے ٹکرائے۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور ہاتھوں کو بڑھا کر ٹٹولا۔ یہ پتھری تھی جس کے اوپر پتھر کی سل رکھی ہوئی تھی۔

"پاروتی! کیا اسی پتھری میں تم قید ہو؟"

"ہاں" پاروتی نے آہ بھر کر کہا۔

میں نے سل کو ہٹا دیا۔ پتھری کے اندر ہاتھ ڈالا۔ میری انگلیاں ایک سانپ کے لجلجے جسم سے ٹکرائیں۔ ساتھ ہی پاروتی کی آواز آئی۔

"تو انورا خدا نے تمہیں میری مدد کے لئے بھیج دیا۔ مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔ جلدی کرو۔ سپیرا آگیا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے سانپ کو جو اصل میں پاروتی ناگن کے روپ میں تھی پتھری میں سے نکال کر اپنی کلائی کے گرد لپیٹا اور اندھیرے میں دیوار کا سہارا لئے راہ بناتا پہلے ایک تہہ خانے سے نکلا پھر دوسرے تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر حویلی میں سے باہر روشنی میں آگیا۔ تنگ گلی بالکل خالی تھی۔ میں نے دن کی روشنی میں پاروتی کو دیکھا۔ وہ سنوالی رنگ کے سانپ کے روپ میں تھی اور نڈھال نظر آ رہی تھی۔ اس کا پھن سمٹا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے پاروتی کہ میں عین وقت پر آگیا۔ میں اسی دن سے تمہاری تلاش میں تھا جب سے تم رانی کی حویلی میں سے غائب ہوئی ہو؟"

پاروتی کہنے لگی۔ "یہ میری تم سے محبت ہے جس نے مجھے اتنی طاقت عطا کر دی ہے کہ میں ناگن بن کر بھی تم سے انسانی آواز میں بات کر سکتی ہوں۔ ورنہ شروع میں مجھے بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ اب یہاں سے نکل چلو۔"

میں نے اسے کہا۔

"تم انسانی شکل میں واپس کیوں نہیں آ جاتیں۔ تم تو عورت سے ناگن اور ناگن سے عورت بن سکتی ہو۔"

ناگن پاروتی نے سرد سسکار بھر کر کہا۔

"میری یہ طاقت اس سپیرے نے ختم کر دی ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم اب کبھی انسانی شکل میں واپس نہ آ سکو گی۔"

پاروتی کی آواز آئی۔

"یہ ساری باتیں تمہیں پھر کسی وقت بتاؤں گی پہلے یہاں سے بھاگ چلو۔ اور مجھے چھپا لو۔"

ناگن پاروتی سانپ کی شکل میں فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ لمبی نہیں تھی۔ میں نے اسے قمیض کے اندر ڈال کر قمیض کے بٹن بند کر لئے۔ ناگن پاروتی میری کمر کے گرد لپٹ گئی تھی۔ وہاں سے الیاباقی کی سادھو والی عمارت کی طرف آنے کی بجائے میں پتھر کی مورتیوں والی گلی میں آگے چل پڑا۔ آگے ایک پرانے قلعے کا کھنڈر نظر آ رہا تھا۔ وہاں سے اونچائی پر بنی ہوئی پتھریلی سیڑھیاں پہاڑی کے پیچھے جا رہی تھیں۔ میں ان سیڑھیوں پر سے نیچے اترنے لگا۔ اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لگتا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ میں جس مقصد کی خاطر میشور آیا تھا وہ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اب وہاں میرا کوئی کام نہیں تھا۔

پاروتی نے قمیض کے اندر سے پوچھا۔

"یہ کونسی جگہ ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ ہم اس وقت کھنڈرہ سے کافی دور دریائے نربدا کے کنارے آباد میشور ہام کے شہر میں ہیں اور سپیرے نے اسے پہاڑی پر واقع الیاباقی کی سادھو کے کھنڈر کے ایک تاریک تہہ خانے میں قید کیا ہوا تھا۔ پاروتی نے کمزور آواز میں کہا۔

"میرے خدا نے مجھے بچا لیا۔ انورا تمہارا خدا اب میرا خدا بھی ہے۔ میں نے ہندوؤں کے بھگوان کو چھوڑ دیا ہے۔"

میرے لئے یہ بڑی خوشی کی بات تھی۔ میں نے اسے کہا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"خدا تمہیں سیدھی راہ پر ضرور لے آئے گا۔ تم مظلوم اور بے گناہ عورت ہو۔"

میں ساتھ ساتھ پہاڑی پر بنی ہوئی بے ترتیب سیڑھیاں بھی اترتا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ تمہیں اس ذلیل سپیرے نے ناگن بنایا ہے۔ اگر تم اپنی مرضی سے ناگن بنی ہو تو انسانی روپ میں کیوں نہیں آتیں؟"

پاروتی نے نفرت بھری آواز میں کہا۔

"میری روح تھکی ہوئی ہے انورا ابھی مجھ سے خدا کے لئے کچھ نہ پوچھو۔ سب سے پہلے مجھے کسی جگہ تھوڑا سا دودھ لے کر پلاؤ۔ مجھ پر سپیرے کے منتروں کا بہت شدید اثر ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں دودھ کا بندوبست کرتا ہوں۔"

پہاڑی سے نیچے اترنے کے بعد میں اس جانب چلنے لگا جدھر میشور نامی قصبے یا چھوٹے شہر کی آبادی نظر آ رہی تھی۔ خود مجھے بھی بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں آبادی کے ایک چھوٹے سے بازار میں آ گیا۔ یہاں دکانیں کھلی تھیں۔ ایک جگہ مجھے ایک دکان کے باہر ویشنو بھنڈار لکھا ہوا نظر پڑا۔ یہ چھوٹا سا ویشنو ہوٹل تھا جہاں صرف دال سبزیاں ہی پکتی تھیں۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ ہوٹل ایک دکان کی طرح کا تھا۔ اندر تین چار میزیں بچھی تھیں۔ میں کونے والی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اپنے لئے چاول اور سبزی منگوائی اور پاروتی کے لئے دودھ کا ایک کپ بھی منگوایا۔ ہوٹل کے ملازم نے مجھ سے پوچھا۔

"صاحب آپ کھانے کے ساتھ دودھ پئے گا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں یہ میری ضرورت ہے۔"

نوکر ایک تھالی میں ابلے ہوئے چاول اور سبزی ڈال کر لے آیا۔ ساتھ ایک کپ میں دودھ لا کر اس نے میز پر رکھ دیا۔ دکان میں صرف ایک گاہک اس وقت بیٹھا کھانا

کھا رہا تھا جس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے دودھ کا کپ نیچے فرش پر میز کے قریب ہی رکھا اور پاروتی سے آہستہ سے کہا۔

"میں نے دودھ کا کپ نیچے رکھ دیا ہے۔"

اور موقع دیکھ کر پاروتی کو قمیض کے اندر سے نکالا اور چپکے سے نیچے میز کے پاؤں کے پاس رکھ دیا۔ پاروتی کے سانپ نے اپنا منہ کپ میں ڈالا اور دودھ پینا شروع کر دیا۔ میں چاول کھانے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ جتنی دیر تک پاروتی ناگن دودھ پیتی رہی ہوٹل کا کوئی ملازم ادھر نہ آیا۔ جب دودھ کا کپ خالی ہو گیا تو میں نے ایک ہاتھ نیچے ڈال کر سانپ کو اٹھایا اور اپنی قمیض کے اندر ڈال کر خاموشی سے چاول کھانے میں مصروف ہو گیا۔ سانپ اپنے آپ میری کمر کے گرد لپٹ گیا۔ پاروتی کی آواز آئی۔

"اب مجھے اپنے اندر کچھ توانائی محسوس ہونے لگی ہے۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس وقت میں تم سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ نوکر ادھر آ رہا ہے۔"

ہوٹل کا ملازم میرے پاس آ کر بولا۔

"صاحب کچھ اور چاہئے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔۔۔"

ملازم ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"صاحب دودھ کا کپ کہاں چلا گیا؟"

میں نے جلدی سے نیچے فرش سے کپ اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

"لے جاؤ۔ میں نے دودھ پی لیا ہے۔"

نوکر حیران ضرور ہوا کہ آخر مجھے دودھ پینے کے بعد خالی کپ فرش پر رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے کھانا کھا کر ہاتھ دھوئے۔ ہوٹل والے کو بل ادا کیا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ پاروتی نے میری قمیض کے اندر سے پوچھا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"کیا بیت پڑنے لگا ہے؟ مجھے بارش کے پانی کی خوشبو آ رہی ہے۔"

سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے۔ میں نے موقع دیکھ کر پاروتی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہاں لوگ ہیں۔ کچھ دیر کے لئے خاموش رہو۔"

وہ چپ ہو گئی۔ بوندا باندی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ میں سیدھا بسوں کے اڈے پر آ گیا۔ یہاں سے بس میں بیٹھا اور کھنڈوہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ اس دوران بس راستے میں دو دفعہ رکی۔ میں بس سے اتر کر تھا جگہ دیکھ کر پاروتی سے دو چار باتیں کر لیتا۔ وہ بار بار یہی کہتی کہ جس طرح بھی ہو سکے اس علاقے سے نکل چلو۔ سپیرا ضرور ہماری تلاش میں ہو گا۔ کھنڈوہ میں بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ یہ بوندا باندی سارا رستہ جاری رہی تھی۔ ریلوے سٹیشن پر آ کر میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ یہاں میرے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے پاروتی سے پوچھا کہ اب ہمیں کس طرف جانا چاہئے۔ وہ بولی۔

"یہاں سے مجھے ناگ پور لے چلو۔ وہاں چل کر تمہیں بتاؤں گی کہ میرے لئے مجھ پر جو منتر پھونکا ہوا ہے اس کا توڑ کیا ہو گا اور میری طاقت کیسے واپس آئے گی۔"

ناگ پور کو گاڑی دو گھنٹے بعد جاتی تھی۔ یہ وقت میں نے وہیں سٹیشن پر گزارا۔ مجھے ٹرین کا ایک ہی ٹکٹ لینا تھا۔ میں ٹکٹ لے کر ٹرین میں بیٹھ گیا۔ ناگ پور وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ ٹرین نے دوسرے روز مجھے ناگ پور پہنچایا۔ سٹیشن کے پاس ہی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں میں نے ایک کمرہ لے لیا۔ یہاں میں نے قمیض کے اندر سے ناگن پاروتی کو نکال کر پلنگ پر رکھ دیا۔ وہ نسواری رنگ کے سانپ کی شکل میں تھی۔ کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ یہاں ایک بار پھر اس نے دودھ منگوا کر پیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے کہ اس کی طاقت اسے واپس مل جائے۔

ناگن پاروتی نے کہا۔

"اس شہر کے جنوب میں ایک شمشان گھاٹ ہے جہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ تم وہاں جا کر پتہ کرو کہ وہاں کسی مردے کو کب جلایا جائے گا۔ میں اس

کمرے میں ہی رہوں گی۔"

میں نے اسے تاکید کی وہ کسی جگہ چھپ کر بیٹھے۔ اس کے بعد میں ہوٹل سے نکلا اور شہر کے جنوب کی طرف نکل گیا۔ پوچھتا پوچھتا میں شمشان گھاٹ پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ رات کو ایک مردے کو جلایا جائے گا۔ میں نے واپس آ کر پاروتی کو بتا دیا۔ وہ کہنے لگی۔

"مجھے ساتھ لے کر رات کے وقت شمشان گھاٹ چلنا ہو گا۔"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں ہوٹل کے کمرے میں ہی رہا۔ جب رات ہو گئی تو میں پاروتی کو قمیض کے اندر چھپا کر شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہلے سے ایک مردے کو جلایا جا رہا تھا۔ چتا میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دو آدمی لمبی لمبی سلاخوں سے جلتی ہوئی لکڑیوں کو ہلا جلا رہے تھے۔ میں نے پاروتی کو اپنی کلائی پر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ گردن اٹھا کر چتا کے شعلوں کو تک رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"جب یہ دونوں آدمی جلتی ہوئی لاش کے قریب سے چلے جائیں تو مجھے چتا کے پاس لے چلنا۔"

میں شمشان گھاٹ میں ایک جگہ اندھیرے میں درختوں کے پیچھے بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ آدمی کب چتا سے الگ ہوتے ہیں۔ چتا کے شعلے آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگے تھے۔ تب دونوں آدمی وہاں سے چلے گئے۔ پاروتی بھی میری کلائی سے لپٹی چتا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"آگ کو مدھم ہو لینے دو۔"

کوئی ایک گھنٹے بعد چتا کی آگ صرف انگاروں کی شکل میں باقی رہ گئی۔ پاروتی نے کہا۔

"اب مجھے چتا کے پاس مردے کے سرہانے کی طرف لے چلو۔"

میں چتا کے پاس مردے کے سر کی جانب کوئی دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا۔ پاروتی کہنے لگی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔ پتا کے پاس جاؤ اور وہاں سے تھوڑی سی راکھ کسی
تھیلے میں رکھ کر لے آؤ۔"

وہاں کوئی برتن وغیرہ تو تھا نہیں۔ راکھ گرم تھی۔ میں نے پاروتی کو وہیں زمین پر
رکھ دیا اور اندھیرے میں جھک کر ایک گرا ہوا درخت کا چوڑا پتا اٹھایا اور جھک کر چلتے
ہوئے پتا کے پاس آ گیا۔ یہاں آگ کی بڑی گرمی تھی۔ جس طرح سے بھی ہو سکا میں
نے پتا کی تھوڑی سی راکھ پتے پر رکھی اور پاروتی کے پاس لے آیا۔ پاروتی بولی۔

"اسے زمین پر رکھ دو۔"

میں نے راکھ والا پتا زمین پر رکھ دیا۔ ہمارے اردگرد اندھیرا اور خاموشی تھی۔
صرف پتا کے آس پاس انگاروں کی ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ پاروتی نے جو سانپ
کی شکل میں تھی راکھ والے پتے کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ میں اندھیرے
میں ایک طرف بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ تک وہ راکھ کے گرد چکر لگاتی
رہی۔ اس کے بعد اس نے پھن کھول دیا اور راکھ کے پاس منہ لے جا کر زور سے
پھنکاری ماری۔ راکھ اڑ کر اس کے جسم پر پڑی۔ پاروتی راکھ میں لوٹ پوٹ ہونے لگی۔
پھر وہ رینگتی ہوئی میرے پاس آئی اور انسانی آواز میں بولی۔

"مجھے میری طاقت واپس مل گئی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ ناگن سے انسانی شکل میں واپس آ گئی۔

پاروتی انسانی شکل میں میرے سامنے کھڑی تھی۔
اندھیرے میں وہ مجھے پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔
"خدا کا شکر ہے کہ تم انسانی شکل میں واپس آ گئیں۔"
وہ اپنے کھلے بالوں کو باندھتے ہوئے بولی۔
"اب میں اس قسم کے سپیروں سے بڑا محتاط رہتا ہو گا۔ یہ کوئی معمولی سپیرا
نہیں تھا۔ اس کے پاس منتروں کی زبردست طاقت تھی۔"
میں نے کہا۔ "تمہیں ناگن بن کر ہوٹل میں میرے ساتھ جانا ہو گا۔ میں نہیں
چاہتا کہ ہوٹل والوں کو معلوم ہو جائے کہ میرے ساتھ ایک عورت بھی ہوٹل میں آئی
ہے۔"

پاروتی کہنے لگی۔ "تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ میں ناگن کی شکل میں ہی تمہارے
ساتھ جاؤں گی۔"

دوسرے لمحے پاروتی نے دوبارہ ناگن کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے اسے قمیض
کے اندر چھپایا اور ہوٹل میں واپس آ گیا۔ کمرے میں آ کر میں نے دروازے کو اندر
سے چٹخنی لگائی۔ بتی جل رہی تھی۔ میں نے پاروتی کو نکال کر پلنگ پر رکھ دیا۔ وہ اسی
وقت اپنی اصلی شکل میں واپس آ گئی۔ میں اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے
لگی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"تم نے میری خاطر بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تم نے میرے ساتھ دوستی کا پورا حق بھایا ہے مگر اب میں نہیں چاہتی کہ تم میری خاطر اپنے آپ کو کسی مصیبت میں ڈالو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تمہیں تمہارے شہر میں پہنچا کر میں واپس جنگل کے جنگلوں کی طرف نکل جاؤں۔ میں اکیلی ہی سنتالی سیوؤں سے انتقام لوں گی۔ تمہیں اب میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ہاں تو میرا بھی یہی دل کرتا تھا کہ واپس اپنے شہر اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے پاس پاکستان چلا جاؤں۔ پاکستان بن چکا تھا میں نئی اسلامی مملکت کی خوشیوں میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن پاروتی کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا تھا اسے اکیلا چھوڑنے کو دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"پاروتی! میں تو کسی بھی وقت تم سے الگ ہو کر اپنے نئے وطن پاکستان جا سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو کم از کم تمہیں سنتالی سیوؤں کے حملے سے میں چھوڑ کر واپس جاؤں۔"

پاروتی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں اورا تمہیں اپنے ماں باپ سے بچھڑے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ اور اب تو آزاد اسلامی ملک پاکستان بھی بن چکا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم پاکستان اپنے ماں باپ کے پاس چلے جاؤ اور نئے اسلامی ملک پاکستان کی ترقی کے واسطے کام کرو۔"

میں نے اسے کہا کہ میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ ہمارا نیا اسلامی ملک پاکستان بن گیا ہے [illegible] وہیں جا کر اپنے نئے ملک کی ترقی اور خوشحالی کے واسطے جو کچھ بھی کر سکتا ہوں کروں مگر تمہیں اکیلا چھوڑنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس کے جواب میں پاروتی کہنے لگی۔

"تم میری فکر نہ کرو۔ میں اب اکیلی نہیں ہوں۔ میرے پاس خدا کی دی ہوئی ایک طاقت بھی ہے جو مصیبت کے وقت میرے کام آئے گی۔"

"مگر جس طرح اس پراسرار روحانی سپیرے نے تمہیں اپنے قبضے میں کر لیا تھا اسی طرح کوئی اور طاقتور سپیرا بھی تمہیں اپنے پھندے میں پھنسا سکتا ہے۔ پھر تم کیا کرو گی؟"

پاروتی نے کہا۔

"اب ایسا نہیں ہو گا۔ کم از کم کسی انسان سپیرے میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اب مجھے قابو کر سکے۔ یہ تو کوئی دیوتا ہی ایسا کر سکتا ہے اور میں ہندوؤں کے دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتی۔ کوئی دیوتا وغیرہ نہیں ہوتے۔"

میں نے کہا۔

"پاروتی! اگر تم دیوی دیوتاؤں اور مورتی پوجا وغیرہ کو نہیں مانتی ہو تو پھر تم اسلام قبول کیوں نہیں کر لیتی؟"

پاروتی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میرے اندر ایک زبردست تبدیلی آ چکی ہے۔ ہو سکتا ہے میں اندر سے مسلمان ہو گئی ہوں لیکن میں زبان سے اس کا اعتراف ایک خاص وقت آنے پر کروں گی۔ اب تم سو جاؤ مجھے تو نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں جاگ کر تمہاری حفاظت کروں گی۔"

پاروتی صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ صبح ہوٹل کا کوئی ملازم وغیرہ آئے تو خود دروازہ نہ کھولے۔ مجھے جگا دے۔ میں واقعی سخت تھک چکا تھا اور مجھے نیند آ رہی تھی۔ پاروتی نے بتی بجھا دی۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور پھر گہری نیند سو گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب پاروتی مجھے کندھے سے ہلاتے ہوئے جگا رہی تھی۔ ساتھ ہی میں نے دروازے پر دستک دینے کی آواز سنی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پاروتی نے کہا۔ "کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

"میرا خیال ہے ہوٹل کا ملازم ہو گا۔ تم باتھ روم میں جا کر چھپ جاؤ۔"

پاروتی باتھ روم میں چلی گئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر ہوٹل کا ملازم لڑکا چائے کا گلاس لئے کھڑا تھا۔ کہنے لگا

"صاحب جی! آپ کے لئے چائے لایا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ صبح صبح چائے پیتے ہیں۔ آپ شہر کے بڑے ہیں؟"

میں نے چائے اس سے لے لی اور کہا

"میرا ناشتہ اوپر ہی لے آنا اور سنو۔ دودھ کا گلاس بھی ناشتے میں ناشتے پر لانا۔ میں ضرور پیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے صاحب!"

لڑکا چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی اور پاروتی کو آواز دی۔

"باہر نکل آؤ۔ لڑکا چلا گیا ہے۔"

پاروتی غسل خانے سے نکل کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"تمہارے پاس اگر کچھ پیسے بچے ہوں تو بازار سے میری لئے ایک نئی سوتی ساڑھی اور اپنے لئے قمیض پتلون لے آؤ۔ تمہارے کپڑے بھی پرانے ہو گئے ہیں۔"

میں نے جیب سے پیسے نکال کر گنے۔ ابھی ڈیڑھ پونے دو سو روپے موجود تھے۔ میں نے کہا۔

"پیسے تو ہیں مگر میرا خیال ہے ہمیں تھوڑی کنجوسی سے کام لینا چاہئے۔ ابھی پاکستان بھی پہنچنا ہے اور یہ بڑا لمبا سفر ہے۔"

پاروتی نے کہا "اس کی تم فکر نہ کرو۔ ضرورت پڑنے پر پیسوں کا انتظام ہو جائے گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔ پاروتی سے چائے کا پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے اب کسی شے کی حاجت نہیں رہی۔ اگر چاہوں تو پی سکتی ہوں۔ ناشتے پر تم نے دودھ منگوایا ہے۔ وہ پی لوں گی۔ میں چائے پیتا رہا۔ پاروتی

میرے سامنے بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس راستے سے ہو کر پاکستان جاؤں گا۔ میں نے کہا۔

"سیدھا راستہ تو یہی ہے کہ یہاں سے دلی، دلی سے میرٹھ، الہ آباد اور جالندھر لدھیانہ سے ہوتا ہوا امرتسر اور پھر وہاں سے سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ جاؤں گا۔"

پاروتی نے کہا۔

"مگر پنجاب میں تو بڑے فسادات ہو رہے ہیں۔ تم نے خود ہی تو مجھے بتایا تھا کہ مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین کے جو قافلے پاکستان کو جاتے ہیں ان پر ہندو سکھوں کے جتھے حملے کر رہے ہیں اور مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر دوسرا تو کوئی راستہ نہیں ہے۔"

اس وقت میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ میں بمبئی سے کسی بحری جہاز کے ذریعے بھی پاکستان پہنچ سکتا ہوں۔ لیکن قسمت میں جو لکھا تھا اور جو رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات آگے چل کر میرے ساتھ پیش آئے انہیں بھی تو کوئی نہیں مٹا سکتا تھا۔ پاروتی نے گردن اٹھا کر کہا۔

"لیکن میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں گی۔ میرے ہوتے ہوئے تم پر کوئی ہاتھ اٹھا کر تو دیکھے۔ ایسا بدلہ لوں گی کہ ساری عمر نہیں بھولے گا۔"

اس رات ناگ پور کے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہم نے طے کر لیا کہ پاروتی مجھے پاکستان پہنچانے کے بعد واپس جنوبی بنگال کے جنگلوں میں اپنے دشمن شنتالی پیروں سے انتقام لینے کے لئے واپس چلی جائے گی اور میں پاکستان اپنے گھر بار والوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت مجھے اس حقیقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مشرقی پنجاب میں کس قدر ہولناک حالات ہیں اور ہندو سکھ کتنے وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ انڈیا کے اخباروں میں مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں صحیح طور پر شائع نہیں ہوتی تھیں۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

چونکہ پاروتی کو اب کسی بھی پیرے کا خوف نہیں رہا تھا اور اس کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو چکی تھی کہ کوئی بھی دنیاوی طاقت رکھنے والا پیرا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اس لئے اس نے میرے ساتھ انسانی شکل میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن ہم سٹیشن پر آ گئے۔ ہاں پورے ہندوستان کے بالکل وسط میں واقع ہے اور یہاں سے حیدرآباد دکن اور مدراس سے آنے والی ساری گاڑیاں آتی ہیں اور یہ بہت بڑا جنکشن ہے اس لئے ہمیں کوئی ایک گھنٹے بعد دلی جانے والی گاڑی مل گئی۔ یہ شہر دلی سے بہت دور ہے۔ ہم جس ریل گاڑی میں سوار ہوئے وہ جبل پور، الہ آباد، کانپور، لکھنؤ، شاہجہان پور، بریلی اور مراد آباد سے ہوتی ہوئی کوئی تیسرے دن رات کے دس بجے دلی پہنچی۔ میں تو ٹرین میں سفر کرتے کرتے تھک آ گیا۔ راستے میں کوئی ہنگامہ خیز واقعہ پیش نہ آیا۔ پاروتی نے بڑے سکون اور خاموشی سے سفر طے کیا۔

دلی سے ہمیں مشرقی پنجاب کے لئے ٹرین تبدیل کرنی تھی۔

معلوم ہوا کہ صبح صبح ایک گاڑی جالندھر امرتسر جا رہی ہے۔ مجھے لاہور جانا تھا۔ انکوائری کلرک نے بتایا کہ چونکہ پاکستان بن گیا ہے اور پاکستان مسلمانوں کا ایک آزاد ملک ہے اس لئے انڈیا سے کوئی گاڑی لاہور نہیں جاتی۔ صرف جالندھر یا زیادہ سے زیادہ امرتسر تک گاڑیاں جاتی ہیں۔ پاروتی نے مجھے کہا۔

"امرتسر تک کے دو ٹکٹ لے لو۔ آگے دیکھا جائے گا۔ وہاں سے شاید لاہور کے لئے کوئی لاری وغیرہ مل جائے۔"

مجھے یہاں کے اس وقت کے خونیں حالات کا بالکل علم نہیں تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ ہم نے دلی سے امرتسر تک کے دو ٹکٹ لے لئے اور وہیں پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ گئے۔ گاڑی کے چلنے میں ابھی پوری رات پڑی تھی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور گاڑی نے صبح پانچ بج کر دس منٹ پر روانہ ہونا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"تم تو نیند اور کھانے پینے سے بے نیاز ہو چکی ہو مگر مجھے تو بھوک بھی لگتی ہے۔

نیند بھی آتی ہے۔ مجھ سے یہاں ساری رات نہیں بیٹھا جائے گا۔"

"تو پھر کیا کریں؟ تم ہی بتاؤ۔"

میں نے مشورہ دیا۔

"کیوں نہ شہر میں چلتے ہیں۔ چاندنی چوک کے کسی مسلمان ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ پھر وہیں چائے پئیں گے اور واپس آ جائیں گے۔"

پاروتی کو میرا مشورہ پسند آیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"مگر تم نے ہی کہا تھا کہ دلی میں بھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ یہاں بھی مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ کر بعد آگ لگا رہے ہیں۔"

میں رک گیا۔

"یہ تو ہے۔ لیکن آخر ایسا بھی کیا ہے۔ ہم دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ اگر حالات اچھے ہوئے تو چاندنی چوک میں کھانا کھائیں گے حالات خراب ہوئے اور دکانیں ہوٹل بند ہوئے تو واپس آ جائیں گے۔"

پاروتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ چلو۔"

دلی سٹیشن کے باہر مجھے محسوس ہوا کہ وہ رونق نہیں ہے کچھ ویرانی ویرانی سی تھی۔ لوگ بھی کم نظر آ رہے تھے۔ زیادہ تر ہندو سکھ پولیس کے سپاہی دکھائی دے رہے تھے۔ پاروتی نے بھی اس فرق کو محسوس کیا اور بولی۔

"دلی سٹیشن کے باہر تو لگتا ہے کرفیو لگا ہوا ہے۔"

میں چاندنی ہوٹل کے مسلمان ہوٹل میں کھانا ضرور کھانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"کرفیو نہیں لگا ہوا۔ ویسے رات کو آج کل لوگ کم ہی نکلتے ہیں۔"

ایک ٹیکسی والے نے کہا کہ چاندنی چوک کے دس روپے لوں گا۔ میں نے کہا بھائی دس روپے تو بہت زیادہ ہیں۔ دو چار روپے کی بات کرو۔ وہ بولا۔ "بھائی صاحب وہاں پیدل جا کر تو دکھائیں۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں ٹیکسی کے اندر بیٹھ گیا۔

"چلو بھائی دس روپے ہی لے لینا۔"

پاروتی پہلے ہی ٹیکسی میں سوار ہو چکی تھی۔ ٹیکسی چاندنی چوک کی طرف چل پڑی۔ سٹیشن سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی محسوس ہوا کہ یہ وہ دلی شہر نہیں ہے جہاں آدھی آدھی رات تک لوگ سیریں کرتے تھے۔ سڑکیں تقریباً خالی تھیں۔ کوئی کوئی گاڑی یا تانگہ گزر جاتا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"کیا یہاں کرفیو لگا ہے؟"

ڈرائیور نے کہا۔ "کرفیو تو نہیں لگا۔ کل تک لگ جائے گا کیونکہ سبزی منڈی میں ہنگامہ خیز ہوا ہے۔"

اس نے رک کر ہم سے پوچھا کہ ہم مسلمان ہیں؟ میں نے کہا۔

"الحمدللہ ہم مسلمان ہیں۔"

ٹیکسی ڈرائیور بھی مسلمان تھا کہنے لگا۔

"بابو جی! دلی میں ہندو سکھوں نے مسلمانوں کا بڑا قتل عام کیا ہے۔ مسلمانوں نے بھی اٹ کر مقابلہ کیا اور کر رہے ہیں مگر ہندو سکھوں کے ساتھ ان کی اپنی پولیس اور فوج ہے۔ مسلمان پولیس سے تو ایک ہفتہ پہلے اسلحہ لے لیا گیا تھا۔ آپ کہاں سے آ رہے ہیں بابو جی؟"

میں نے کہا۔ "ٹانک پور سے۔"

"میری مانیں بابو جی! آپ چاندنی چوک نہ جائیں واپس سٹیشن پر چلے چلیں۔ چاندنی چوک میں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بھائی اگر وہاں کرفیو نہیں لگا تو کوئی بات نہیں ہو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور بڑے غور سے سڑک پر دائیں بائیں اور سامنے دیکھتا ہوا گاڑی چلا رہا تھا۔ بولا۔

"اچھا بابو جی! جو اللہ کو منظور۔"

میں نے کہا۔ "زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے واقعی کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ مجھے معلوم نہیں ٹیکسی کن سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی جب چاندنی چوک کے قریب پہنچی تو ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف لے جا کر کھڑی کر دی۔ سڑک خالی تھی۔ سامنے چوک بھی خالی خالی تھا۔ کچھ دکانیں ضرور کھلی ہوئی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور جو مسلمان تھا کہنے لگا۔

"بابو جی! واپس چلے چلیں۔ عورت بھی ساتھ ہے۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

میں نے دور سے دکانوں کی روشنی دیکھ کر اس سے پوچھا۔

"کیا وہ چاندنی چوک ہے؟"

وہ بولا۔ "ہاں جی۔ مگر وہاں جو دکانیں آپ کو کھلی نظر آ رہی ہیں وہ ہندوؤں کی دکانیں ہیں۔"

میں اور پاروتی ٹیکسی سے باہر نکل آئے۔ میں نے ڈرائیور کو دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی ہم تو چاندنی چوک کے کسی مسلمان ہوٹل میں کھانا کھانے آئے ہیں۔ اب تو کچھ کھا پی کر ہی واپس جائیں گے۔ تم بے شک واپس چلے جاؤ۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کرایہ لے کر جیب میں رکھا اور بادل نخواستہ ٹیکسی سٹارٹ کر کے واپس چلا گیا۔ پاروتی کہنے لگی۔

"اگر وہاں کوئی مسلمان ہوٹل کھلا ہوا نہ ملا تو ہم واپس سٹیشن کس طرح پہنچیں گے یہاں تو کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔"

میں نے کہا۔ "دیکھا جائے گا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔"

ہم چلنے لگے تو پاروتی نے میرا بازو تھام کر مجھے روک لیا اور بولی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"میرا خیال ہے مجھے انسانی شکل میں تمہارے ساتھ نہیں جانا چاہئے۔ میں ناگن بن کر تمہارے ساتھ ساتھ سڑک پر چلتی رہوں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کم از کم میں تمہاری مدد تو کر سکوں گی۔"

میں نے کہا "اور اگر تمہیں دیکھ کر کسی نے تمہیں اینٹ پتھر سے کچل دیا تو پھر کیا ہو گا؟"

اس نے کہا "میں اندھیرے میں چلوں گی۔ ویسے بھی میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔"

یہ کہہ کر دوسرے لمحے پاروتی میرے پاس کھڑی کھڑی غائب ہو گئی۔ میں نے جھک کر سڑک پر دیکھا پاروتی نسواری رنگ کے سانپ کی شکل میں کنڈلی مار کر بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم آگے آگے چلو۔ میں اندھیرے میں تمہارے ساتھ ساتھ چلتی رہوں گی۔"

میں چاندنی چوک کی طرف چل پڑا۔ چوک میں بڑی بے رونقی تھی۔ اکثر دکانیں بند تھیں۔ دو چار دکانیں کھلی تھیں۔ ان دکانوں کے باہر تین پولیس والے رائفلیں پاس رکھے سٹولوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں دو سکھ تھے۔ ظاہر ہے تیسرا سپاہی ہندو ہی ہو گا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا تھا کہ دلی کی مسلمان پولیس سے اسلحہ لے کر انہیں مہاجر کے گھروں کو بھیج دیا گیا ہے۔ میں فٹ پاتھ پر جگت سینما کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے بائیں جانب دیکھا۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر پاروتی بھی سانپ کی شکل میں فٹ پاتھ پر رینگتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ میں نے جھک کر کہا

"اس سے تو بہتر تھا کہ تم انسانی شکل میں میرے ساتھ چلتیں۔"

مجھے پاروتی کی آواز آئی۔

"تم خاموشی سے چلتے چلو۔ ادھر کس طرف جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے یاد ہے جگت سینما کے ساتھ والی سڑک پر مسلمانوں کا ایک ہوٹل ہے۔ شاید مغل ہوٹل اس کا نام ہے۔ وہیں جا رہا ہوں۔"

میں پولیس والوں کے سامنے سے کچھ فاصلے پر سے گزرا تو سکھ سپاہی نے آواز دے کر پوچھا۔

"کون ہو بھئی؟ کدھر جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "سردار جی ہوٹل میں چائے پینے جا رہا ہوں۔"

"اچھا وقت نکالا ہے تم نے چائے پینے کے لئے۔" سکھ سپاہی نے طنزاً کہا "جاؤ چائے پیو اور اگر بچ جائے تو ہمارے لئے بھی چائے لیتے آنا۔"

پاروتی مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر اندھیرے میں تھی۔ کہنے لگی۔

"لگتا ہے ادھر کوئی خطرہ ہے۔"

میں نے کہا "اب میں واپس تو جانے سے رہا۔"

اور میں چوک میں سے گزر کر جگت سینما کے پہلو والی چھوٹی سڑک کی طرف آ گیا۔ جگت سینما بند تھا۔ سڑک ویران تھی۔ سڑک پر صرف ایک ہی شیڈ لیمپ روشن تھا۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا ایک دکان کے اوپر مغل ہوٹل لکھا تھا۔ یہی وہ ہوٹل تھا جو مجھے یاد رہا تھا مگر افسوس کہ ہوٹل بند پڑا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا

"پاروتی! ہوٹل تو بند پڑا ہے۔ میرا خیال ہے واپس سٹیشن پر چل کر ہی چائے پیتے ہیں۔"

"اچھا خیال ہے۔ چلو۔ واپس چلو۔"

واپسی پر میں پولیس کے سپاہیوں کے پاس سے گزرنے لگا تو سکھ سپاہی نے طنز کی۔

"پی آئے چائے؟"

میں نے کہا "سردار جی ہوٹل تو بند ہے۔"

دوسرا سپاہی جو یقیناً ہندو تھا کہنے لگا

"وہ ہوٹل تو مسلمان کا ہوٹل ہے۔ تم کون ہو بھئی کیا مسلمان ہو؟"

میں نے کہا "ہاں! میں مسلمان ہوں۔"

تینوں سپاہی سٹول پر سے اٹھ کر میرے قریب آ گئے۔ انہوں نے ایک طرح سے

Prepared By: S.Sohail Hussain

مجھے گھیرے میں لے لیا۔ سکھ سپاہی نے میری گردن پکڑ کر کہا۔

"مجھے لگتا ہے تم یہاں ہندوؤں کی دکانوں کو آگ لگانے آئے تھے۔ کیوں لوسے بتا پیچھے کہاں آگ لگا کر آئے ہو؟"

میں نے سکھ سپاہی کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا۔

"میں کوئی آگ واگ لگانے نہیں آیا۔ میں تو مغل ہوٹل میں کھانا کھانے آیا تھا۔"

میں نے ایک طرف نظر گھما کر دیکھا۔ پاروتی مجھ سے کوئی پندرہ فٹ کے فاصلے پر سٹول کے پیچھے اندھیرے میں فٹ پاتھ پر موجود تھی اور ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ سکھ سپاہی میرے ہاتھ جھٹکنے سے غصے میں آگیا۔ اس نے میری گردن دبوچ لی اور بولا۔

"چل لوئے تھانے۔"

دوسرے سپاہی بھی مجھے تھپڑ مارنے لگے۔ سکھ سپاہی مجھے گھسیٹنے لگا۔ اس کے بعد مجھے ساتھ کی پھٹکار کی آواز آئی اور جس سکھ سپاہی نے مجھے گردن سے دبوچ رکھا تھا اور مجھے گھسیٹ کر لئے جا رہا تھا اس کی گرفت اچانک میری گردن پر ڈھیلی پڑ گئی اور وہ دھڑام سے فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ دوسرے سپاہی اس کو اٹھانے لگے تو ایک ایک کر کے وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ پاروتی کے ساتھ نے اپنا کام کر دیا تھا۔ مجھے پاروتی کی آواز آئی۔

"اب یہاں سے بھاگ چلو۔ میری فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

تینوں سپاہی فٹ پاتھ پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ چوک خالی ہونے کی وجہ سے کسی نے یہ ڈرامہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میں سڑک پر جس طرف سے آیا تھا اس طرف دوڑ پڑا۔

میں فٹ پاتھ پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پاروتی ضرور پیچھے رہ گئی ہو گی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سانپ آدمی سے زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ جب میں چوک سے کافی آگے نکل گیا تو میں دوڑنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگا۔ میں نے چلتے چلتے اپنی دائیں بائیں جانب دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے سانپ کہیں نظر نہ آیا۔ مگر سانپ نے مجھے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سانپ کو اندھیرے میں بھی نظر آ جاتا ہے۔ مجھے پاروتی کی آواز آئی۔

"فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

میں نے تیز تیز چلتے ہوئے ایک نظر پیچھے گردن موڑ کر دیکھا۔ چاندنی چوک میں بالکل خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے پاروتی سے پوچھا۔

"تم نے ان کو مار تو نہیں دیا؟"

پاروتی نے جواب دیا۔

"دو آدمی تمہیں تھپڑ مار رہے تھے۔ ایک سکھ تمہیں گھسیٹ رہا تھا۔ میں انہیں کیسے زندہ چھوڑ سکتی تھی۔ میں نے انہیں ڈس کر پورا زہر ان کے خون میں شامل کر دیا۔ اب تک تو ان کے جسم پانی بن کر بہہ گئے ہوں گے۔"

میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ مگر پاروتی انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی جب سے اس نے سنا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندو اور سکھ مل

Prepared By: S.Sohail Hussain

کر مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے گھروں کو آگ لگا رہے ہیں وہ ہندو سکھوں کی دشمن
ہو گئی تھی۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتی تھی کہ ہندو اور سکھ بنیادی طور پر بزدل ہوتے ہیں۔
اس لئے وہ ظالم ہوتے ہیں اور ظلم کرتے ہوئے وہ گھٹیا سطح پر اتر آتے ہیں۔ اس کے
مقابلے میں مسلمان ایک بہادر اور کشادہ دل قوم ہے۔ مسلمان دشمن کو معاف بھی کر
دیتا ہے اور عورتوں بوڑھوں اور بچوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔

اس قسم کی باتیں پاروتی کے ذہن میں پیدا ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ خدا اسے
سیدھی راہ پر لا رہا تھا۔ میں اب تیز تیز نہیں چل رہا تھا۔ دوڑتے اور تیز تیز چلنے سے
میں تھک گیا تھا اور سانس بھی چڑھ گیا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر ایک بند دکان کے چبوترے پر
بیٹھ گیا۔ پاروتی بھی اندھیرے میں سے نکل کر رینگتی ہوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔

"یہاں کوئی سواری بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اور مجھے سٹیشن کا راستہ معلوم نہیں
ہے۔"

پاروتی سانپ نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔"

"تمہیں اتنی جلدی کیسے معلوم ہو گیا؟"

پاروتی کی آواز آئی۔

"سانپ جس راستے سے ایک بار گزر جاتا ہے وہ راستہ اسے ہمیشہ کے لئے یاد رہ
جاتا ہے۔"

مجھے سڑک پر دور سے ایک تانگہ آتا نظر آیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"شاید یہ تانگہ خالی ہے۔ میں اسے روکتا ہوں۔"

وہ کہنے لگی۔ "اگر خالی نہ بھی ہوا تو تم اس پر سوار ہو جانا کم از کم اس طرح
سے تو نکل جائیں گے۔"

تانگہ قریب آیا تو وہ خالی تھا۔ میں نے ہاتھ دیا۔ کوچوان نے تانگہ روک دیا۔

کہا۔

"صرف سٹیشن تک جاؤں گا بابو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی سٹیشن پر ہی جانا ہے۔"

میں جلدی سے تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگہ خالی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اس سے پہلے
میں نے پاروتی سانپ کو اٹھا کر اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ دلی ریلوے سٹیشن کے
سامنے ایک باغ ہوا کرتا تھا۔ تانگہ اس باغ کے قریب پہنچا تو میں نے کوچوان کو پیسے
دیئے اور وہیں اتر پڑا۔ میں ایک طرف اندھیرے میں آ گیا۔ میں نے پاروتی کو قمیض
کے اندر سے نکال کر کہا۔

"پاروتی! میرا خیال ہے اب تمہیں سانپ بن کر میرے ساتھ سفر کرنے کی کیا
ضرورت ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی انسانی شکل میں آ جاؤ۔ کم از کم ایک دوسرے سے سب
کے سامنے بات تو کر سکیں گے۔"

پاروتی اسی وقت انسانی شکل میں آ گئی۔ ہنس کر بولی۔

"تم تو اب اپنے ماں باپ کے پاس پاکستان جا رہے ہو۔ وہاں میں نہیں ہوں گی تو
کس سے باتیں کرو گے؟ خیر وہاں تو تمہارے گھر والے ہوں گے بہن بھائی ہوں گے۔
تم تو مجھے بھول جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں پاروتی! ایسی بات نہیں ہے۔ ہمارا اتنا عرصہ ساتھ رہا ہے۔
اور پھر ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست بھی ہیں۔ میں تو تمہیں پاکستان جا کر ضرور
یاد کیا کروں گا۔ ہو سکتا ہے تم مجھے بھول جاؤ۔"

ہم آہستہ آہستہ ریلوے سٹیشن کی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ پاروتی نے
اداس آواز میں کہا۔

"نہیں انورا میں بھی تمہیں نہیں بھلا سکوں گی۔ تم نے میرے اندر پیار کی جو
جوت جگا دی ہے وہ ہمیشہ روشن رہے گی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اگرچہ مجھے بھی پاروتی سے ایسا ہی پیار ہو چکا تھا مگر

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں پیار محبت کے نقشے بنا کر اس تصویر میں مزید رنگ نہیں بھرنا چاہتا تھا۔ آخر ایک روز مت جانا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم بھی میرے ساتھ پاکستان چلی چلو۔ وہاں تمہیں بہادر، احسان نواز اور کشادہ دل لوگ ملیں گے۔ تم بڑی خوش رہو گی۔"

پاروتی نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہو سکتا ہے میں کبھی نہ کبھی تمہیں ملنے پاکستان آ جاؤں۔ میں اب بھی یہی کہوں گی کہ مجھے مسلمانوں کے ملک پاکستان جا کر بڑی خوشی ہو گی۔ تم مجھے اپنا پتہ دیتے چلنا۔ میں تمہیں ملنے کم از کم ایک بار پاکستان ضرور آؤں گی۔"

میں نے اسے کہا۔

"میں تمہیں امرتسر میں اپنا ایڈریس ضرور لکھوا دوں گا۔ بلکہ یاد کرا دوں گا۔"

پاروتی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم مجھے اپنا ایڈریس بتانا چاہے نہ بتانا مگر میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ تمہاری خوشبو مجھے تمہارے پاس لے آئے گی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں۔ سانپ اگر ایک بار کسی کے لباس یا اس کے جسم کی بو کو سونگھ لے تو وہ سات سمندر پار کر کے بھی اس شخص کے پاس پہنچ جاتا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ریلوے سٹیشن کی عمارت کے اندر آ گئے۔ یہاں عجیب ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر بھی بہت کم مسافر نظر آ رہے تھے۔ زیادہ تر ہندو سکھ ہی تھے۔ پولیس کے سپاہی بھی سکھ ہی تھے۔ پاروتی اور میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹرین کا کچھ پتہ نہیں تھا کب روانہ ہو گی۔ پاروتی نے دلی کی وحشت زدہ فضا کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نہ کہ ہندو اور سکھ ہندوستان کے مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ انہیں موقع ملا تو وہ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ دیکھ لو۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہو

رہا ہے۔ خدا مسلمانوں کو اس قوم سے محفوظ رکھے۔"

میں نے کہا۔

"مشرقی پنجاب میں بھی مسلمانوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔"

پاروتی نے فکر مند ہو کر کہا۔

"میں تمہیں انبالہ کا پاسپورٹ کرا کر ہی واپس آؤں گی۔ تمہیں امرتسر میں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔"

"جو میرے خدا کو منظور۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

رات کے دو اعلیٰ بجے کہیں امرتسر جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر لگی۔ وہ پہلے ہی مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ میں اور پاروتی ایک ڈبے میں کسی نہ کسی طرح گھس کر بیٹھ گئے۔ کافی انتظار کروانے کے بعد ٹرین روانہ ہوئی۔ ٹرین جس وقت انبالے پہنچی تو صبح ہو چکی تھی۔ میں نے انبالے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر برقعہ پوش مسلمان عورتوں کو ایک ہجوم کی شکل میں اپنے بال بچوں اور مردوں کے ساتھ بے کسی کے عالم میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ یہ انبالے کے مسلمان مہاجرین تھے جو شاید کسی سپیشل ٹرین کے انتظار میں تھے۔

انبالے سے ہماری گاڑی چلی تو راستے میں کوئی سٹیشن ایسا نہ تھا جہاں مسلمان مہاجرین سینکڑوں کی تعداد میں بے سروسامانی کے عالم میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ مشرقی پنجاب شروع ہوا تو کھیتوں پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں کہیں دھواں اٹھتا نظر آ جاتا تھا۔ ظاہر ہے یہ مسلمانوں کے گھر تھے جنہیں نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ گاڑی جالندھر سٹیشن پر رکی تو پلیٹ فارم پر ہر طرف سکھ ہی سکھ نظر آ رہے تھے جو تلواریں، بندوقیں لئے پھر رہے تھے۔ پاروتی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ سے کہا۔

"یہاں تو حالات بہت خراب ہیں۔"

جالندھر سے ٹرین چلی تو ایک جگہ ریلوے لائن کے ساتھ کٹی ہوئی بے شمار لاشیں ادھر ادھر پڑی تھیں۔ کھیتوں میں گھروں کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ یہاں مسلمانوں کے کسی

Prepared By: S.Sohail Hussain

قافلے پر سکھوں کے جتھے نے حملہ کر دیا تھا۔ ٹرین امرتسر شہر کے مضافات میں داخل ہو چکی تھی۔ اس شہر کے گلی کوچوں بازاروں سے میں اچھی طرح واقف تھا۔

ٹرین امرتسر کے پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔

پلیٹ فارم پر ہندو سکھ کرپانیں اور اسلحہ لئے دندناتے پھر رہے تھے۔ وہ ہر ڈبے میں داخل ہو کر پوچھتے۔ یہاں کوئی مسلمان تو نہیں ہے؟ وہ سکھ کرپانیں ہاتھوں میں لئے ہمارے ڈبے میں بھی آ گئے۔ ایک سکھ نے پوچھا۔

"یہاں کوئی مسلمان تو نہیں ہے؟"

مسافر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک مسافر نے کہا۔

"سردار جی! یہاں مسلمان کا کیا کام ہے۔"

سکھ نے میری طرف گھور کے دیکھا۔

"تم مجھے مسلے لگتے ہو۔ نکل تو باہر۔"

پاروتی نے کہا۔

"یہ میرا پتی ہے میں ہندو ہوں۔ میرا نام پاروتی ہے۔"

سکھ نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

"ابھی اس کے نتھنے دیکھ کر پتہ چل جائے گا کہ یہ ہندو ہے کہ مسلہ"

دونوں سکھ مجھے کھینچتے ہوئے ڈبے سے باہر لے آئے۔ پاروتی بھی باہر نکل آئی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

"یہ میرا پتی ہے۔ میں ہندو ہوں۔ ہم مسلمان نہیں ہیں۔"

وہاں تین چار اور سکھ آ گئے۔ ان کے پاس بھی تلواریں تھیں۔

"چلو لے اس کو اندر لے جا کر دیکھو مسلمان ہے کہ ہندو۔"

وہ مجھے سامنے والے کمرے میں لے گئے۔ دوسرے لمحے ان پر یہ راز کھل گیا کہ میں مسلمان ہوں۔ پاروتی بھی دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ یہ پلیٹ فارم پر ریلوے کا کوئی دفتر تھا۔ بالکل خالی پڑا تھا۔ دونوں سکھوں نے مجھے پکڑ کر فرش پر گرا دیا۔ ایک

سکھ کے پاس کرپان تھی۔ اس نے کرپان میری گردن پر پھال چھالی۔ میں تڑپ کر اس کے نیچے سے نکل گیا۔ دوسرے سکھ نے تلوار والا ہاتھ اٹھایا کہ ایک ہی وار سے میری گردن الگ کر دے مگر اب پاروتی میری مدد کو وہاں پہنچ چکی تھی۔

پاروتی نے سکھ پر چھلانگ لگا دی۔ اور اسے اپنے ساتھ لئے دوسری طرف گرا لیا۔ میں نے دوسرے سکھ کے کرپان والے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ اس دوران پاروتی پہلے سکھ کی گردن میں ناخن چبھو کر اسے ہلاک کر چکی تھی۔ پاروتی نے دوسرے سکھ کی گردن پر دونوں ہاتھ زور سے مارے اور اپنی انگلیوں کے ناخنوں سے اس کی گردن نوچنے لگی۔

بس اتنا ہی کافی تھا۔ خدا جانے اس کے ناخنوں میں ایسا ہلاکت خیز زہر کہاں سے آ گیا تھا۔ دوسرا سکھ وہیں دہرا ہو کر بے حس ہو کر منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ اب باہر سے سکھوں کے اندر آ جانے کا زبردست خطرہ تھا۔ پاروتی نے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

"ان کی لاشیں اس طرف کر دو۔ جلدی کرو۔"

ہم نے دونوں سکھوں کی لاشوں کو میز کے نیچے دھکیل دیا۔ باہر سے دوسرے سکھ لڑکوں کی آواز آئی۔

"باہر نکلو تمام سکھ۔ اندر کیا کر رہے ہو؟"

میں نے پاروتی سے کہا۔

"اب کیا کریں؟"

پاروتی کا خیال تھا کہ باہر سکھ ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے اور وہ یہ کہتی ہوئی مجھے لے کر باہر نکل جائے گی کہ میرا خاوند ہندو ہے۔ تمہارے ساتھیوں کو پتہ چل گیا ہے مگر سکھ باہر ہمارے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ دیوار میں دروازہ تھا۔ میں نے اسے کھولا تو وہ غسل خانہ تھا۔ غسل خانے میں بھی ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ پاروتی نے اسے کھولا۔ دوسری طرف احاطہ تھا جہاں گائے بندھی تھی۔ ہم تیزی سے نکل کر احاطے میں آئے اور دوڑتے ہوئے سٹیشن کی عقبی سڑک پر نکل گئے۔ یہاں چھوٹے سے بلیچے میں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی جس کو سکھوں نے توڑ پھوڑ دیا تھا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہمیں پلیٹ فارم پر سکھوں کے نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید انہیں اپنے
ساتھیوں کی ہلاکت کا پتہ چل گیا تھا۔ پاروتی نے کہا۔
"کسی طرف کو بھاگ چلو۔ میں تمہیں دشمنوں کے اتنے ہجوم سے نہیں بچا سکوں
گی۔ بھاگو۔"

ہم نے دوڑتے ہوئے سڑک پار کی۔ سامنے لکڑیوں کا ٹال تھا۔ اس کی بغل سے
ایک راستہ کھیتوں کی طرف جاتا تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے کھیتوں میں آ گئے۔ یہاں فصل
کھڑی تھی۔ ہم نے فصل کے درمیان جو پگ ڈنڈی تھی اس پر جتنی تیزی سے بھاگ
سکتے تھے بھاگنا شروع کر دیا۔ کھیت ختم ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا میدان آ گیا جہاں خالی
تانگے کھڑے تھے۔ ہم وہاں سے بھی بھاگتے ہوئے گزر گئے۔ آگے کسی احاطے کی اونچی
دیوار آ گئی۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے ریالٹو سینما کے عقب میں آ گئے۔
یہ سینما میرا جانا پہچانا تھا۔

وہاں آ کر ہم املی کے درخت کے نیچے بے دم سے ہو کر گر پڑے۔ پاروتی کا
سانس اتنا نہیں پھولا تھا مگر میرا سانس بہت پھول گیا تھا۔ بعد میں پاروتی نے مجھے بتایا
کہ ناگن ہونے کی وجہ سے اس کا دم زیادہ نہیں پھولا تھا۔ جب ذرا میرے اوسان
بحال ہوئے تو میں نے پاروتی سے کہا کہ ہمیں اب سٹیشن کی طرف ہرگز نہیں جانا
چاہیے۔

اس نے پوچھا۔
"تم اس شہر سے واقف ہو۔ یہ کونسا علاقہ ہے اور یہاں سے پاکستان کی سرحد کس
طرف ہے کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ تمہیں جتنی جلد ہو سکے پاکستان کی سرحد کے اندر
پہنچا دوں۔"

میں نے کہا۔
"ہم سکھوں سے کافی دور نکل آئے ہیں۔ مگر پاکستان کو جو سڑک جاتی ہے اس پر
ایک بہت بڑا گوردوارہ ہے۔ شہر کی جو حالت دیکھ رہا ہوں اس کے پیش نظر وہاں میرا خیال

کہ نقصان ممکن نہیں لگتا۔"
"ہم سڑک چھوڑ کر کھیتوں کھیت بارڈر کی طرف چلتے ہیں۔ ابھی دونوں ملک نئے
نئے آزاد ہوئے ہیں بارڈر پر کوئی فوج وغیرہ نہیں ہو گی۔"

اس کا یہ مشورہ بڑا اچھا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم یہاں سے خالصہ کالج کی
طرف چلتے جائیں تو آگے کھیتوں کھیت چھ جرنیل کا گوردوارہ پار کر کے اسی طرح کھیتوں
میں چلتے لاہور پہنچ سکتے ہیں۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ امرتسر شہر مسلمانوں
سے خالی ہو چکا ہے اور جس طرف ہم جانے والے ہیں اس طرف سکھ جتھے کھیتوں
میں کئی مسلمانوں کو قتل کر چکے ہیں اور ان کی لاشیں وہیں پڑی ہیں۔ اور سکھ آس
پاس کے کھیتوں میں چھپے ہوئے مسلمانوں کو تلاش کر رہے ہیں۔

میں نے پاروتی کو ساتھ لیا اور کھیتوں میں خالصہ کالج کی طرف چل پڑا۔ فضا میں
ایک دہشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہر کی طرف دو تین جگہوں سے دھواں اٹھ
رہا تھا۔ میں نے پاروتی کو دھوئیں کے بادل دکھاتے ہوئے کہا۔
"یہ مسلمانوں کے مکان جل رہے ہیں۔"

کھیت میں فصل اونچی تھی۔ فصل ختم ہوئی تو بائیں جانب کچھ فاصلے پر امرتسر کے
دائم گنج کی آبادی کے مکان دکھائی دیئے۔ ان مکانوں پر بھی ایک سکوت طاری تھا۔
آگے کھیت میں کسی فصل کی دیوار آ گئی۔ ہم اس دیوار کی اوٹ میں چل رہے تھے۔ یہ
کھیت ختم ہوا تو آگے چھوٹا سا چھپڑ آ گیا۔ یہاں کئی ہوئی دو انسانی لاشیں پڑی تھیں۔
پاروتی نے میرا بازو تھام لیا۔ یہ مسلمانوں کی لاشیں ہی ہو سکتی تھیں۔ اور آگے گئے تو
کھیتوں میں جگہ جگہ انسانی لاشیں پڑی تھیں جن کا خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ پاروتی
کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

اچانک ایک طرف سے آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ ہم وہیں بیٹھ
گئے۔ فصل ہمارے چہروں تک آتی تھی۔ ہم نے چار پانچ سکھوں کو بلمیں اور تلواریں
لئے دائم گنج کی آبادی کی طرف دوڑتے دیکھا۔ ہم وہیں دبک کر بیٹھے رہے۔ جب سکھ

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ہم پھر پچھ ہرنے کی طرف تیز تیز قدموں کے ساتھ چلنے لگے۔ خالصہ کالج کی عمارت بائیں جانب پیچھے رہ گئی تھی۔ کھیتوں میں ایک طرف تین چار مکان تھے۔ ادھر سے ایک بوڑھا آدمی ہمیں دیکھ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر اس طرح ہلانے لگا جیسے ہمیں رک جانے کا اشارہ کر رہا ہو۔ پاروتی نے کہا

"یہ بوڑھا کیا کہہ رہا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ بھی ہو ہمیں رکنا نہیں چاہئے۔"

ہم تیز تیز چلتے گئے۔ بوڑھا کھیت میں سے گزر کر ہمارے سامنے آ گیا وہ سکھ نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اونچی آواز میں کہا

"السلام علیکم!"

میں وعلیکم السلام کہہ کر رک گیا

"کیا تم مسلمان ہو؟"

بوڑھے کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر جسم کمزور تھا۔ سر پر اس نے صافہ باندھ رکھا تھا۔ کہنے لگا

"ہاں بیٹا میں مسلمان ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بھی مسلمان لگے۔ سکھوں نے یہاں مسلمانوں کو بہت قتل کیا ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کسی مسلمان کا خون نہیں بہنے دوں گا۔ بستی میں جو کوئی بچا کھچا مسلمان ملا اسے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا۔ بیٹا اس طرف آ چلو آگے بڑا خطرہ ہے۔ جلدی کرو۔ سکھوں کا جتھہ ادھر کو آ رہا ہے۔"

ہم پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے۔ ایک مسلمان کو دیکھا تو کچھ حوصلہ ہوا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ ہمیں کھیتوں میں جو مکان تھے اس طرف لے گیا۔ راستے میں وہ بولتا جا رہا تھا۔

"امرتسر میں مسلمانوں پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہندو سکھوں نے ڈوگرہ فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا بڑا خون بہایا ہے۔ جلدی چلو بیٹا۔"

وہ ہمیں ایک مکان میں لے گیا۔ مکان خالی پڑا تھا۔ کہنے لگا

"میں رام سنگھ ہیں ہل چلی کی دکان کرتا تھا۔ سکھوں نے حملہ کیا تو یہاں آ کر چھپ گیا۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں باہر جا کر معلوم کرتا ہوں کہ سکھوں کا جتھہ ادھر تو نہیں آ رہا۔ ہاں دروازہ اندر سے بند کر لینا۔"

یہ کہہ کر وہ بوڑھا مکان سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔

"یہ تو کوئی فرشتہ ہمیں مل گیا ہے۔ نہیں تو ہمیں سکھوں کے جتھے نے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔"

یہ مکان کا چھوٹا سا کمرہ تھا جو بالکل خالی تھا۔ صرف ایک پرانی چارپائی دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی تھی۔ بوڑھے کو گئے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ باہر کچھ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز قریب آئی تو میں نے دروازے کے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ وہی بوڑھا آدمی جو ہمیں مکان میں چھوڑ کر گیا تھا دو سکھوں کے ساتھ کسی بات پر جھگڑتا ہوا کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں سکھوں میں سے ایک سکھ کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔

"ایک عورت بھی ساتھ ہے۔ جوان عورت ہے میں زیادہ پیسے لوں گا۔"

تلوار والے سکھ نے جھومتے ہوئے اسے گالی دی۔

"لوئے تجھ جا لالہ نہیں تو تیری گردن اڑا دوں گا۔ جتنے پیسے دیئے ہیں ٹھیک ہیں۔"

بوڑھا کہنے لگا۔

"سردار! بڑی مشکل سے گھیر کر دونوں مسلمان مرد عورت کو لایا ہوں۔ دس روپے ہی دے دو۔"

دوسرے سکھ نے اسے فحش گالی دے کر ہاکی اٹھائی تو وہ بوڑھا جو اصل میں ہندو

Prepared By: S.Sohail Hussain

تھا اور جس کا بھیم اس آبادی کے بچے کھچے مسلمانوں کو گھیر کر لایا تھا وہاں سے چلا گیا۔

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے گھبراہٹ میں پاروتی سے کہا۔

"پاروتی! ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ وہ بوڑھا ہندو تھا۔ اس نے سکھوں کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ سکھ ہماری طرف آ رہے ہیں۔"

اتنے میں سکھوں نے دروازے کو زور سے دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ سکھوں نے دروازے پر ہاکی اور لاٹھی برسانا شروع کر دیں۔ کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی روشندان تھا۔ دروازہ ٹوٹنے لگا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"پاروتی! کچھ کرو۔ لگتا ہے اب بچنا مشکل ہے۔"

پاروتی نے مجھے دروازے سے ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

"تم ادھر ہو جاؤ۔"

میں کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دروازے کی چٹخنی اکھڑ گئی۔ دروازہ کھل گیا اور دونوں سکھ چیخیں مارتے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ اس دوران پاروتی ناگن کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ جیسے ہی دونوں سکھ اندر آئے اور میری طرف بڑھے پاروتی کے سانپ نے ان دونوں کو اچھل کر ڈس لیا۔ یہ کچھ ایسے سانپ کا زہر تھا کہ دونوں سکھ اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے۔ ناگن پاروتی نے ایک غلطی کی وہ پھنکارتا ہوا پھن پھیلا کر ان کے سامنے آ گئی۔

جس سکھ کے ہاتھ میں تلوار تھی اس میں ابھی کچھ سکت باقی تھی دوسرا سکھ گر چکا تھا۔ پہلے سکھ نے گرتے گرتے تلوار والا ہاتھ سانپ پر مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے تلوار پاروتی کو لگی اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا سکھ بھی ڈھیر ہو گیا۔

ایک لمحے کے لئے تو میں جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہا۔ پاروتی ناگن کے روپ میں تھی اور اس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ دونوں ٹکڑے فرش پر پڑے تھے۔ لوہے

والے کڑے کا پھن سکڑ گیا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر پاروتی ناگن کے دونوں ٹکڑے اٹھائے۔ گردن سے ذرا نیچے تلوار نے سانپ کو کاٹ دیا تھا۔ خون ذرا سا بھی نہیں بہا تھا۔ میں نے سانپ کے دونوں ٹکڑے جیب میں ڈالے اور کھلے دروازے سے نکل کر باہر آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں دوڑ کر مکان کے پیچھے چلا گیا۔ پیچھے باجرے کا کھیت تھا۔ ایک پگڈنڈی بازار کی جانب جو علاقہ تھا اس طرف جا رہی تھی۔ مگر اب مجھے اس طرف نہیں جانا تھا۔ مجھ پر ایک بھاری ذمے داری عائد ہو چکی تھی۔ مجھے پاروتی کی زندگی پھر سے واپس لانے کے لئے کوہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے میں واقع کیلاش پربت جانا تھا۔ میں نے وہیں سے اپنا رخ اس سڑک کی طرف کر لیا جو امرتسر شہر کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے جالندھر اور جیسا نہ انبالے کی طرف جاتی تھی۔

اردو فینز ڈاٹ کام

Prepared By: S.Sohail Hussain

میرا خیال تھا کہ میں جس چھوٹی سڑک پر جا رہا ہوں یہ جالندھر لدھیانے کی طرف
ہی جاتی ہو گی۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔ یہ کچی سڑک امرتسر کی جیل کے قریب جا کر
دائیں جانب ایک برساتی نالے کے پل کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نالے کے پل پر سے
گزر کر دوسری طرف آیا تو میرے سامنے کمپنی باغ کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ امرتسر
جیل کی طرف میں پہلی بار آیا تھا۔ سڑک اور کھیتوں پر ایک دہشت طاری تھی۔ کہیں
کہیں سوائے ملٹری کے سپاہیوں کے اور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ میں ان سے بھی
چھپ کر آگے نکل گیا۔ صرف اس ڈر سے کہ اگر انہوں نے پکڑ کر میری تلاشی لی اور
میری جیب سے کٹا ہوا سانپ نکلے گا جس کو وہ زمین پر پھینک کر کچل ڈالیں گے اور پھر
ثلیہ میں پاروتی کی زندگی بھی نہیں بچا سکوں گا۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ یہ
ساری ملٹری ہندو ڈوگرہ اور ہندو گورکھوں کی ملٹری ہے انہیں جب معلوم ہوا کہ میں
مسلمان ہوں تو وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہندو ملٹری نے بھی امرتسر میں ہندو
سکھوں کے ساتھ مل کر سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا تھا۔ امرتسر کے کمپنی باغ کی ایک
ایک سڑک میری دیکھی ہوئی تھی۔ یہاں سے مجھے جالندھر لدھیانے کی طرف جانے والی
جی ٹی روڈ کا راستہ بھی آتا تھا۔ میں باغوں باغ جی ٹی روڈ پر نکل جانا چاہتا تھا۔ امرتسر شہر
کی طرف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اوپر سے شام ہو رہی تھی۔ میں کمپنی باغ
والی مل روڈ کی طرف جانے کی بجائے اس سڑک پر آ گیا جو ریالٹو سینما اور پوسٹ آفس

کی عمارت کے آگے سے ہو کر بڑے ہسپتال کی طرف جاتی تھی۔ یہ کمپنی باغ کی مشرقی
سڑک تھی۔ بالکل خالی پڑی تھی۔ میں کپڑوں سے ہندو ہی معلوم ہوتا تھا۔ مجھ سوری
کی پگڑی تھی اور ماتھے پر ہندوؤں کی طرح میں نے ایک لال بندی بھی لگائی ہوئی تھی۔
یہ اگست 1947ء کے آخری دن تھے۔ فضا میں بڑا حبس تھا۔ کمپنی باغ کے درخت
شام کے اندھیرے میں دھندلے ہو رہے تھے۔ ریالٹو سینما والی سڑک جس پر میں جا رہا
تھا دور تک خالی پڑی تھی۔ میں ریالٹو سینما سے ذرا پہلے چوک میں سے کمپنی باغ کی
طرف ہو گیا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ آگے ملٹری نہ ہو۔ کمپنی باغ ویران پڑا تھا۔ میں
الیگزینڈرا گراؤنڈ میں سے ہوتا ہوا کمپنی باغ کے اس حصے میں آ گیا جہاں اس کا رام باغ
والا گیٹ تھا۔ یہاں سے میں چھوٹی نہر پر چڑھ گیا۔ یہ چھوٹی سی نہر دو موسمی کی طرف
سے آتی تھی اور کمپنی باغ کو سیراب کرتی تھی۔ نہر کے کنارے چلتا چلتا میں دو موسمی پر
جا کر بائیں جانب ہسلی کے اوپر چلنے لگا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا کافی گہرا ہو
گیا تھا۔ یہ ہسلی دراصل اسی نالے کی چھت تھی جس میں سے نہر کا تازہ پانی امرتسر کے
دیوان صاحب والے تالاب میں جا کر گرتا تھا۔

آگے ریلوے لائن آ گئی۔ میں ہسلی سے اتر کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے
لگا۔ میرا رخ جالندھر لدھیانے کی طرف تھا مگر میں وہاں تک پیدل نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی
ریل گاڑی بھی ملنی مشکل تھی۔ کیونکہ اس وقت پاکستان سے ہندو سکھ شرنارتھیوں سے
بھری ہوئی ٹرینیں ہی آتی تھیں اور ان کا بھی کوئی وقت نہیں تھا کہ کب آ جائیں۔
ویسے بھی ان میں بیٹھنا خطرناک تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کو مجھ پر
مسلمان ہونے کا شک پڑ جائے۔ میں اللہ توکل ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔
امرتسر کے چالیس کنوئیں بھی گزر گئے۔ اس کے بعد رات کا اندھیرا پوری طرح چھا
گیا۔

یہ فسادات کی خون آلود رات تھی۔ ہر طرف وحشت طاری تھی۔ اگست کی حبس
آلود رات کی فضا میں آگ اور خون کی بو رچی ہوئی تھی۔ ریلوے لائن سے دور ایک

Prepared By: S.Sohail Hussain

گھروں میں لگی ہوئی آگ نظر آئی۔ ست سری اکال کے نعرے بھی سنائی دیئے۔ میں موت کے منہ میں چلا جا رہا تھا۔ خیال آیا کہ یہاں کسی جگہ چھپ کر رات گزار دینی چاہیئے۔ صبح کی روشنی میں آگے چلوں گا تاکہ معلوم تو ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ لیکن پھر سوچا کہ رات کے اندھیرے میں تو میں پھر بھی خطرناک علاقے سے گزر جاؤں گا۔ دن کی روشنی میں سکھوں کے ہتھے آ گیا تو پاروتی کے ساتھ میں بھی ختم ہو جاؤں گا۔

میرے پاس اتنے پیسے موجود تھے کہ میں بڑی آسانی سے کیلاش پربت پہنچ سکتا تھا۔ کیلاش پربت پہنچنے کے لئے مجھے جالندھر سے انبالے جانا تھا جہاں سے گاڑی بدل کر مراد آباد اور پھر گورکھپور کی طرف نکل جانا تھا۔ اس کے آگے شمال کی جانب ہمالیہ کی پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں میں ہی کیلاش پربت نام کی ایک پہاڑی تھی۔ یہ سب کچھ مجھے پاروتی نے سمجھا دیا ہوا تھا۔ اس پہاڑی کے دامن میں کوئی مندر تھا۔ مندر کے صحن میں ایک تالاب تھا۔ اس تالاب میں مجھے پاروتی ماتا کے جسم کے ٹکڑے کسی ڈبے میں بند کر کے چھ دن تک رکھنے تھے۔ ساتویں دن پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں نے آپس میں جڑ جانا تھا اور پاروتی نے ساتپ کے روپ میں پھر سے زندہ ہو جانا تھا۔

یہ بڑا لمبا سفر تھا مگر جان کا خطرہ صرف مراد آباد تک ہی تھا۔ اخبارات کے ذریعے معلوم ہوتا تھا کہ آگے گورکھپور کے علاقے میں اتنے زیادہ فسادات نہیں ہو رہے۔

بہرحال مجھے کسی نہ کسی طرح کیلاش پربت پہنچنا ہی تھا۔ سوال یہ تھا کہ جالندھر انبالے تک کیسے پہنچا جائے۔ پاروتی کے ساتھ امرتسر کی طرف سفر کرتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں شہروں میں ہندو سکھ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے تھے اور ان شہروں میں ایک بھی مسلمان نہیں بچا تھا۔ سب سے پہلے مجھے جالندھر پہنچنا تھا۔ میں وہاں تک پیدل نہیں جا سکتا تھا۔ ریلوے لائن کے ساتھ چلتے چلتے میں تھکا تو نہیں تھا مگر

اندھیرے میں میرے پاؤں بار بار پتھروں پر پڑ رہے تھے۔ وہاں کوئی روشنی وغیرہ بالکل نہیں تھی۔ دونوں جانب اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔

میں نے غلطی کی جو شام کے وقت اس طرف نکل آیا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں کسی باغ میں کسی جگہ درختوں میں چھپ کر رات گزار دیتا۔ بار بار یہی افسوس ہو رہا تھا مگر اب واپس کسی باغ بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ شہر میں کرفیو لگ گیا ہو۔ چلتے چلتے مجھے ایک طرف کھیتوں میں کچھ فاصلے پر جھلملاتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔

میں رک کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ کسی گھر کی روشنی نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر گھر کی روشنی ہوتی تو اس کے ساتھ دو تین اور روشنیاں بھی ضرور نظر آتیں۔ یہ ایسی روشنی تھی جیسے کسی نے درختوں کے اندھیرے میں کوئی چراغ جلا رکھا ہے۔

میرے قدم بے اختیار اس روشنی کی طرف اٹھ گئے۔ میں اونچی ریلوے لائن سے نیچے اتر کر روشنی کی طرف کھیتوں کھیت چل پڑا۔ چھ سات کھیتوں میں سے گزرنے کے بعد میں اس روشنی کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ بڑے گھنے سیاہ تاریک درخت ہیں۔ ان کے نیچے ایک جگہ چراغ جل رہا ہے۔ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا دوسری طرف سے درختوں کے پاس آ گیا۔ میں نے ایک جھونپڑی دیکھی جس کے آگے چوکور مٹی کا چبوترا تھا۔ چبوترے کی اینٹوں پر دیا روشن تھا۔ جھونپڑی کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس پر کوئی بوریا بھی نہیں لٹک رہا تھا۔ وہاں کوئی آدم زاد بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں چبوترے کے قریب آ کر رک گیا۔ مجھے ایک جانب دیئے کی مدھم روشنی میں ایک کنوئیں کی چرخی نظر آئی۔ یہاں ایک کنواں بھی تھا۔ شاید یہ کوئی ٹکیہ تھا۔ فسادات کی وجہ سے یہاں جو جنگ درویش وغیرہ رہتے تھے وہ یا تو قتل ہو گئے تھے اور یا بھاگ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ جھونپڑے کے اندر دیکھنا چاہیئے۔ اگر جھونپڑا خالی ہوا تو یہاں بڑے آرام سے میں رات بسر کر سکوں گا۔

جیسے ہی میں جھونپڑے کی طرف بڑھا پیچھے سے کسی مرد کی بھاری آواز آئی۔

"کون ہے تو؟"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دیئے کی روشنی میں مجھے ایک آدمی نظر آیا جس کا سر منڈا ہوا تھا۔ بدن پر درویشوں والا سیاہ لمبا کرتہ اور تہمد تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے پنجابی میں بات کی تھی۔ میں نے پنجابی میں ہی جواب دیا۔

"مسافر ہوں۔ پیاس لگی تھی پانی پینے آ گیا ہوں۔"

"یہاں بیٹھ جا میں تمہیں پانی پلاتا ہوں۔"

چبوترے پر صف بچھی ہوئی تھی۔ میں صف پر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی جھونپڑی کے اندر گیا اور میرے لئے کسی مٹکے میں سے مٹی کے آبخورے میں پانی بھر کر لے آیا۔

اس نے آبخورہ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے پانی پیا اور آبخورہ صف پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں راستہ بھول گیا تھا۔"

میں اسے یہ بتاتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ میں مسلمان ہوں یا ہندو ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ پراسرار فقیر ہندو ہے یا مسلمان ——— اس لئے میں نے گول مول بات کہہ دی تھی۔ وہ میرے سامنے صف پر بیٹھ گیا۔ اس نے کرتے کی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر کھولا۔ اسے میری طرف بڑھا کر کہا۔

"سگریٹ پیتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "جی نہیں شکریہ!"

"لے لو۔ میں جانتا ہوں تم سگریٹ پیتے ہو اور نہیں۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ تم مسلمان ہو یا ہندو ہو تو اپنے گھر ہو گے۔ یہاں بے فکر ہو کر بیٹھو۔ سگریٹ لگاؤ۔"

سگریٹ کڑوا اور سخت تھا۔ مجھے پہلے ہی کش کے ساتھ کھانسی آ گئی۔ وہ آدمی بولا۔

"گلے کو اتنا خراب کیوں مار رکھا ہے؟ میرے پاس تو تمہیں یہی تمباکو ملے گا۔"

تمباکو سگریٹ اس زمانے میں دنیا کا سب سے گھٹیا سگریٹ تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں تمباکو کی بجائے سڑکوں کی مٹی اور گھاس بھری ہوئی تھی۔ مجھے دوسرا کش لگانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس آدمی نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے نام بتایا تو وہ ہنس کر بولا۔

"مسلمان ہو۔ موت سے چھپتے پھر رہے ہو گے۔"

میں اس کی اس بات پر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک اور مقناطیسی کشش تھی کہ میں زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ سکا۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور کہا۔

"مجھے آپ بھی مسلمان لگتے ہیں۔"

"ہاں میں بھی مسلمان ہوں۔ مگر تمہاری طرح موت سے چھپتا نہیں پھرتا۔"

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ رات کے وقت یہاں آتے ہیں یا دن کے وقت بھی آتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "رات اور دن میں کیا فرق ہوتا ہے؟ میں دن کے وقت بھی اسی جگہ رہتا ہوں رات کو بھی یہیں رہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آپ کے چاروں طرف ہندو سکھ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ آپ کسی قافلے کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟"

وہ بولا۔ "کیا پاکستان میں کوئی اور خدا ہے؟ اگر خدا نے مجھے بچانا ہے تو یہاں بھی بچا لے گا۔ یہاں بھی وہی خدا ہے۔"

اس آدمی کی باتیں میری سمجھ سے بالا تھیں۔ میں نے کہا۔

"مجھے انبالے جانا ہے۔ کیا یہاں آگے کسی جگہ سے مجھے انبالے جانے والی کوئی

Prepared By: S.Sohail Hussain

گاڑی مل سکے گی؟"

وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ پھر بولا۔

"تمہیں آگے کرتار پورے کے سٹیشن سے ہی چاند مرا لہلے جانے والی کوئی گاڑی مل سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"مگر ساری گاڑیاں پاکستان سے آنے والے ہندو سکھ شرنارتھیوں کی ہیں۔ اور میں مسلمان ہوں۔ مجھے وہاں جان کا خطرہ ہے۔"

"جان کا خطرہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ آدمی کو کہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں جان کا خطرہ ہے اور کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں بھی جان کا خطرہ ہے۔ تم کس خطرے کی بات کر رہے ہو؟"

یہ پراسرار آدمی پھر معرفت کی باتیں کرنے لگا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھیں۔ میں نے کہا۔

"اچھا آپ یہ بتائیں کہ کرتار پورے کا سٹیشن یہاں سے کتنی دور ہے؟"

وہ کہنے لگا۔ "رات یہاں پڑے رہو۔ صبح بتا دوں گا۔ تم کو بھوک لگی ہو گی۔ تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ مجھے صبح زہر لگتے ہیں اور صبحوں کی خدمت کرنا تو بہت ہی زہر لگتا ہے۔ مگر تم مجھ پر مصیبت بن کر نازل ہو گئے ہو تو تمہیں کچھ نہ کچھ کھلانا ہی پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ جھونپڑی میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں تھالی تھی جس میں گرم گرم کابلی چنوں کا پلاؤ تھا۔ پلاؤ میں سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ خدا جانے اندر کونسی دیگ پک رہی تھی کہ جہاں سے وہ گرم گرم پلاؤ نکال کر لے آیا تھا۔

"لو کھاؤ۔"

اس نے تھالی میرے ہاتھوں میں تھما دی۔

"اب تمہارے لئے پانی بھی اندر سے لانا پڑے گا۔ بڑی مصیبت ہے۔"

میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ جب میں کھانا کھا چکا تو اس نے مجھ سے کہا۔

"تمہیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں رات کو سکھ آ کر تمہیں مار نہ ڈالیں اس لئے تم جھونپڑی میں جا کر سو جاؤ۔ میں باہر سو جاؤں گا۔"

جھونپڑی میں ایک بھنگا چارپائی پڑی تھی جس پر نہ کوئی بستر تھا نہ کچھ۔ باہر سے اس آدمی کی آواز آئی۔

"تکیے کی جگہ بے شک باہر سے ایک اینٹ لے جاؤ۔"

خدا جانے یہ بات اس آدمی نے طنز کے انداز میں کہی تھی یا واقعی وہ چاہتا تھا کہ میں اینٹ کا سرہانہ بنا کر سوؤں۔ بہرحال میں نے جھونپڑی کے حبس اور گرمی میں رات کاٹ دی۔ صبح اٹھا تو وہ آدمی چبوترے کی صف پر ایک طرف بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"نہانا ہے تو کنوئیں پر بوتے نکال کر نہا لو۔"

میں نے صرف منہ ہاتھ ہی دھویا۔ پھر میں اس کے پاس آ کر صف پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کرتار پورہ یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"دس بارہ میل تو ہو گا۔ سوچ لو۔ پیدل چلو گے تو راستے میں تمہیں سکھ مار ڈالیں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا میں تمہارے لئے چائے لاتا ہوں۔"

وہ جھونپڑی کے پیچھے درختوں میں چلا گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں ٹین کا ٹرے تھا جس میں چائے کی چینک، دو پیالیاں اور ایک بند پڑا تھا۔

"یہ لو ناشتہ کر لو۔ میں تو صرف چائے پیوں گا۔"

میں بڑا حیران ہو رہا تھا کہ یہ شخص گرم گرم چائے کہاں سے لے آیا ہے۔ پیچھے

Prepared By: S.Sohail Hussain

درختوں میں مجھے تو کوئی چائے کی دکان نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر اس نے چولہے پر ہی بنائی تھی تو اتنی جلدی وہ چائے نہیں بنا سکتا تھا جتنی جلدی وہ چائے لے کر آیا تھا۔ رات کو بھی جھونپڑے سے وہ کالی چائے کا پاؤ لے آیا تھا۔ میں نے جھونپڑی میں بھی کی روشنی میں اچھی طرح دیکھا تھا وہاں کوئی پاؤ کا ڈبہ وغیرہ نہیں تھا۔ پانی کا مٹکا بھی نہیں تھا۔ میں نے بند کے ساتھ چائے پی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم اپنا لے کیا لینے جا رہے ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"وہاں میرے کچھ رشتے دار پھنسے ہوئے ہیں۔ انہیں نکالنے جا رہا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ سگریٹ کا کش لگا کر بولا۔

"جھوٹ بولنے سے تمہیں کیا مل گیا ہے؟"

میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور کہا۔

"کیا پاکستان سے آنے والی ہندو سکھوں کی ریفیوجی ٹرین کرتار پورے سٹیشن پر ہے؟"

"کیوں نہیں ٹھہرے گی۔ یہ شرنارتھیوں کی بلائیں تو جگہ جگہ اتر رہی ہیں۔"

ابھی دھوپ زیادہ تیز نہیں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ گرمی ہونے سے پہلے پہلے کرتار پورے کے جتنا نزدیک پہنچ سکتا ہوں پہنچ جاؤں۔ میں اس آدمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملانے لگا تو اس نے اپنا ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔

"ٹھیک ہے۔ ہاتھ ملانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تم جاؤ۔ نہیں تو سکھ آ جائیں گے۔ سکھ آ گئے تو میں تو بڑے آرام سے مر جاؤں گا۔ تم بڑا شور مچاؤ گے۔"

میں وہاں سے آگے روانہ ہو گیا۔

میں کھیتوں کھیت چلتا ایک بار پھر ریلوے لائن پر آ گیا۔ ریلوے لائن پر چلنا زیادہ محفوظ تھا۔ اور اس طرح میں راستے سے بھٹک بھی نہیں سکتا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ اردگرد بڑی ویرانی تھی۔ کھیتوں میں کوئی آدمی

نظر نہیں آتا تھا۔ دور دور کہیں کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں موت کا خوف طاری تھا۔ مجھے لائن پر کچھ دور ریلوے کا سگنل دکھائی دیا۔ یہ کوئی سٹیشن تھا۔ میں چلا جا رہا تھا کہ جھاڑیوں میں مجھے ایک انسان کی لاش نظر آئی۔ میں ذرا آگے گیا تو لائن کے آس پاس کتنی ہی کی بچی لاشیں دکھائی دیں۔ پرانے کپڑے اور سامان بکھرا پڑا تھا۔ میں ڈر کر ریلوے لائن سے نیچے اتر آیا اور جھاڑیوں سے بچ کر چلنے لگا۔

کیکر کے درخت پر میں نے دو چھ چھ سات سات مہینوں کے معصوم بچوں کی ننگی لاشیں لٹکی دیکھیں تو میں مارے خوف کے تیز تیز چلنے لگا۔ یہ مسلمان مہاجرین کا کوئی قافلہ ہو گا جس پر سکھوں نے حملہ کر کے مسلمان مہاجروں کو قتل کر دیا تھا اور ان کے بچوں کے سینے میں برچھیاں مار کر ان کی لاشیں درختوں سے لٹکا دی تھیں۔ وہاں عورتوں کی کئی ہوئی لاشیں بھی تھیں۔ یہ ساری عورتیں ادھیڑ عمر اور بوڑھی تھیں۔ ظاہر ہے جوان عورتوں کو اغوا کر لیا گیا ہو گا۔

آج اتنی مدت کے بعد جب میں اس دل ہلا دینے والے منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ہمارے بزرگوں نے کتنی قربانیاں دی تھیں پاکستان کے لئے اور ہم نے پاکستان کو کس حال تک پہنچا دیا ہے۔ مجھے اپنے پیچھے ریل کے انجن کی سیٹی سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دن کی روشنی میں دور سے ایک ٹرین آتی دکھائی دی۔ چھوٹا سا سٹیشن تھوڑی دور تھا۔ اس کے پلیٹ فارم کا جنگلا مجھے نظر آ رہا تھا۔ مجھے جان کا خوف بھی تھا۔ میں اس ٹرین پر بھی سوار ہونا چاہتا تھا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ مجھے اس چھوٹے سے سٹیشن کا نام یاد نہیں رہا۔ میں ایک طرف چھپ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ پاکستان سے آنے والی ہندو سکھ شرنارتھیوں کی ٹرین تھی۔ چھت پر بھی لوگ اپنا سامان لادے بیٹھے تھے۔ لوگ اترنے لگے۔ ان میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنا سامان اتار رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پاکستان سے جو ہندو سکھ انڈیا آ رہے تھے وہ اپنا سامان بھی ساتھ لا رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ رواداری مسلمان کے خون میں شامل ہے۔ وہ معاف کرنا بھی جانتا

Prepared By: S.Sohail Hussain

"میں نے بھی پنجابی میں کہا۔

"کل میں لاہور سے آ رہا ہوں۔"

"وہاں کہاں رہتے تھے؟" سکھ نے پوچھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اسے مجھ پر کچھ شک ہو رہا ہے کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ خدا جانے شاید میری شکل پر لکھا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں لاہور کی ایک ایک گلی ایک ایک بازار سے واقف تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کونسے محلے میں ہندوؤں کی اور کونسے محلے میں سکھوں کی آبادی زیادہ ہے۔ میں نے کہا۔

"مستی گیٹ میں ہمارا مکان تھا۔ مسلمانوں نے اسے آگ لگا دی۔ میرے ماتا پتا بھی میرے ساتھ ہی نکلے تھے۔ سٹیشن کی طرف جاتے ہوئے وہ مجھ سے بچھڑ گئے۔"

سکھ مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک پوٹلی کھول کر ٹین کا ڈبہ نکالا۔ اس میں دال کے نمکین لڈو تھے۔

"یہ لو تم بھی کھاؤ۔"

میں ایک لڈو لے کر کھانے لگا۔ ٹرین آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ سکھ کے ساتھ اس کی فیملی اور دوسرے ہندو سکھ شرنارتھی بھی بیٹھے تھے۔ وہ سب پاکستان کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ اگر کوئی ان میں سے میری طرف دیکھتا تو میں ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ اس طرح ٹرین کبھی تیز چلتی کبھی آہستہ چلتی کبھی رکتی رات

ہے اور دشمن سے انتقام لینا بھی جانتا ہے۔ مسلمان کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے۔ جبکہ میں اس حقیقت کا شاہد ہوں یعنی گواہ ہوں کہ سن 47ء کے فسادات میں سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو بڑی بیدردی سے شہید کیا تھا۔ بچوں تک کو معاف نہیں کیا تھا۔ میں نے درختوں پر معصوم بچوں کی کٹی ہوئی لاشیں دیکھی ہیں۔ میں یہ لاشیں پاکستان کی نئی نسل کے ان نوجوانوں کو دکھانا چاہتا ہوں جو انڈیا کی فلمیں اور انڈیا کے گانے نہ صرف گھروں میں لے جا کر دیکھتے اور سنتے ہیں بلکہ ان گانوں پر ڈانس بھی کرتے ہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ انڈیا کے گانوں پر نہیں بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی لاشوں پر رقص کر رہے ہیں جنہیں انڈیا کے ہندو سکھوں نے قتل کر دیا تھا۔

مجھے اس ٹرین میں بیٹھنا تھا کیونکہ یہ ٹرین آگے جا رہی تھی۔ میں ایک ڈبے میں گھس کر فرش پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہاں کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ ٹرین تھوڑی دیر بعد چل پڑی۔ ایک سکھ نے مجھے گھور کر دیکھا اور پنجابی میں پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو تم؟"

Prepared By: S.Sohail Hussain

کے وقت لیا لے پہنچی۔ یہاں سے مجھے مراد آباد کے لئے گاڑی بدلنی تھی۔ میں اسے
سے اتر گیا۔ سانپ کی شکل میں پاروتی کی کٹی ہوئی لاش یعنی سانپ کے جسم کے دونوں
ٹکڑے رومال میں بندھے میری جیب میں تھے۔ مراد آباد میں ابھی بڑے خوفناک فسادات
ہوئے تھے۔ سٹیشن پر ویرانی برس رہی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ یہاں سے کلکتہ اور لوپ
گورکھپور کی جانب ٹرینیں چل رہی تھیں۔ میں نے ایک قلی سے پوچھا کہ گورکھپور
جانے والی ٹرین کس وقت روانہ ہوتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے مراد آباد سے لکھنؤ
جانا ہوگا لکھنؤ سے مجھے گورکھپور جانے والی گاڑی ملے گی۔

میرے پاس پیسے موجود تھے۔ میں نے سب سے پہلے سٹیشن پر ہی تھوڑا بہت کھانا
کھایا۔ اور پلیٹ فارم کے ایک کونے میں بیٹھ کر لکھنؤ جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے
لگا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ ساڑھے دس بجے ایک گاڑی آئی۔ میں
اس میں بیٹھ گیا۔ اس گاڑی نے مجھے آدھی رات کے وقت گورکھپور پہنچایا۔ گورکھپور
میں کچھ امن و امان کی صورت تھی۔ یہاں سے کوہ ہمالیہ کی چڑھائی شروع ہوتی تھی۔
پاروتی نے ایک بار مجھے سمجھاتے ہوئے بتایا تھا کہ گورکھپور میں بیرنج جانے والی چھوٹی
لائن کی ریل گاڑی میں سوار ہوں گے۔ بیرنج سے ایک پہاڑی سڑک اوپر کیلاش پربت
کے مندر کو جاتی ہے۔

گورکھپور اتر کر وہیں سٹیشن کے مسافر خانے میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ یہاں اتنی
گرمی نہیں تھی جتنی پنجاب کے میدانی علاقے میں تھی۔ حبس بھی نہیں تھا۔ رات کا
ایک بج رہا تھا مسافر خانے میں کافی لوگ تھے۔ خدا جانے یہ مسافر تھے یا شرنارتھی تھے۔
مجھے اب ہر جگہ اپنے آپ کو ہندو ہی ظاہر کرنا تھا کیونکہ میں ہندو اکثریت کے علاقے
میں سفر کر رہا تھا اور ہندوؤں کے مندر میں جا رہا تھا۔

میں نے وہیں رات گزار دی۔ یہ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ بیرنج کو ایک میٹر گیج
یعنی چھوٹی ریلوے لائن والی ٹرین دوپہر کو جائے گی۔ مجھے یہ وقت سٹیشن پر ہی گزارنا
تھا۔ اگرچہ لوگوں کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ شہر میں امن و امان ہے اور کرفیو بھی اٹھا لیا

گیا ہے مگر میں شہر میں جا کر اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ دوپہر کے
وقت میں نے مسافر خانے میں ہی تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ پھر بیرنج جانے والی چھوٹے
ڈبوں کی ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی تقریباً خالی تھی۔ میں اپنے ڈبے میں کونے
والی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ لوپ میں جہاں جا رہا تھا ادھر کوہ ہمالیہ
کی پہاڑیوں کے دامن میں ہندوؤں کے بڑے مندر تھے۔ گاڑی میں کئی سادھو لوگ بھی
بیٹھے تھے۔ وہ بڑے مزے سے چوکڑیاں مار کر سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ لوگ ان کی خاطر
تواضع کر رہے تھے۔ میرے ڈبے میں سادھو کوئی نہیں تھا۔ مندروں کی یاترا کرنے
والے یاتری ہی تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ مندر کی مورتیوں پر چڑھانے کے لئے پھولوں
کے ہار اور خدا جانے کیا کیا کچھ لے جا رہے تھے۔

گاڑی چلنے لگی تو ایک بوڑھی عورت ڈبے میں آ گئی۔ اس کے سفید بال رسیوں
کی طرح کے تھے۔ اس نے ایک گٹھڑی اٹھائی ہوئی تھی۔ وہ سیدھی میرے ساتھ والی
سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس عورت کی عمر ساٹھ ستر کے قریب ہو گی۔ رنگ کالا تھا۔ جسم
ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ اس نے گیروے رنگ کی میلی سی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ گٹھڑی
اس نے پاس ہی رکھ دی۔ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ اس کے منہ میں چند ایک
دانت ہی باقی رہ گئے تھے۔ بولی۔

"بیٹا میں غریب عورت ہوں۔ کیلاش ماتا کے درشن کرنے جا رہی ہوں۔"

میں مسکرا کر خاموش رہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

گارڈ نے جھنڈی ہلائی۔ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی جھٹکے کرتی پلیٹ فارم
پر کھسکنے لگی۔ بوڑھی عورت نے گٹھڑی میں ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی نکالی۔ پوٹلی میں
سے نسواری رنگ کا سفوف نکال کر ہتھیلی پر رکھا۔ اوپر دوسری ہتھیلی آہستہ سے ماری
اور پھر سفوف کا پھکا منہ میں ڈال لیا۔ کہنے لگی۔

"میرے دانت نہیں ہیں۔ بھنگ تمباکو پیس کر کھا لیتی ہوں تم بھی کیلاش ہی کی
یاترا کو جا رہے ہو بیٹا؟"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"ہاں ماتا جی۔ وہیں ایک جگہ جا رہا ہوں۔"

وہ اپنا پوپلا سا منہ چلا رہی تھی کہنے لگی۔

"کیلاش ماتا کے مندر کی یاترا کرنے میں ہر سال جاتی ہوں۔ پہلے ماتا جی کی سہیلی کے درشن کرتی ہوں۔ پھر ناگ دیوتا کے مندر میں جا کر ناگ پوجا کرتی ہوں۔"

میں پھر بھی کچھ نہ بولا۔ اتنا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ یہ عورت کیلاش پربت کے سارے مندروں اور خاص طور پر ناگ دیوتا کے مندر سے بھی واقف ہے۔ مجھے اصل میں اسی ناگ مندر میں جانا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اس سے ناگ مندر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ پھر خیال آیا کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ میں راز داری سے کام لینا چاہتا تھا۔ یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ بوڑھی عورت بڑی زبردست چیلن ہے اور وہ ناگن پاروتی کی پوجا کرنے میرے ڈبے میں آئی تھی۔ اور جان بوجھ کر اس نے ناگ دیوتا کی باتیں شروع کی تھیں۔

بوڑھی عورت ناگ دیوتا کے بارے میں بتانے لگی۔

"ناگ دیوتا بڑے شکتی مان دیوتا ہیں بیٹا کیا تم نے ان کے درشن کئے ہیں؟"

مجھے ناگ دیوتا کے درشن کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ اگر مجھے ناگ دیوتا سانپ کے روپ میں کہیں مل جاتے تو میں اینٹ مار کر اسے وہیں ہلاک کر دیتا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔"

بوڑھی عورت ایسی چالاکی سے باتیں کر رہی تھی کہ آخر مجھے اس سے پوچھنا ہی پڑا کہ ناگ دیوتا کا مندر کس جگہ پر ہے۔ وہ کہنے لگی۔

"بیٹا تم کیوں فکر کرتے ہو۔ میں تمہیں خود وہاں لے جا کر ناگ دیوتا کے درشن کراؤں گی۔ یہ مندر پہاڑیوں کے درمیان بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ وہاں تو کوئی کوئی

یاتری ہی جاتا ہے۔ مگر میں تمہیں خود ساتھ لے کر جاؤں گی۔ اکیلے جاؤ گے تو راستہ بھول جاؤ گے۔ کیلاش پربت کی پہاڑیوں میں اگر کوئی راستہ بھول جائے تو اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کئی یاتری ان پہاڑیوں میں بھٹک کر گم ہو چکے ہیں۔"

اس مکار عورت نے مجھے کچھ ایسا ڈرایا کہ مجھے کہنا ہی پڑا۔

"ماتا تم مجھے اپنے ساتھ ہی ناگ دیوتا کے مندر میں لے چلنا۔"

وہ بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

"تمہارا کیا نام ہے بیٹا؟"

میری زبان پر ہندوانہ ایک ہی نام آیا۔ میں نے کہہ دیا۔

"میرا نام موہن لال ہے۔ میں امرتسر سے آیا ہوں۔ میرے پتا جی بیمار ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ناگ دیوتا کے مندر کے تالاب کا پانی لا کر انہیں پلایا جائے۔ یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں مندر کے تالاب کا پانی لینے جا رہا ہوں۔"

بوڑھی چیلن جھوم اٹھی۔ سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے ہاتھ باندھ کر خدا جانے کس زبان میں منتر پڑھنے لگی۔ وہ منتر پڑھتے پڑھتے مجھ پر پھونکیں بھی مارتی جا رہی تھی۔ میں دل میں ہنس رہا تھا کہ یہ کیسی احمق عورت ہے۔ اس کو معلوم ہی نہیں کہ میں ہندو نہیں ہوں اور اس کے ناگ دیوتا کے وجود ہی کو نہیں مانتا اور اگر میرا بس چلے تو میں اپنے کی پہاڑیوں کے سارے مندروں کے بت پاش پاش کر دوں۔ بوڑھی چیلن منتر ختم کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔

"بیٹا ناگ دیوتا کے تالاب کا جل امرت ہے چاہے کوئی روگ لگا ہو تالاب کے امرت جل کا ایک گھونٹ پلا دو۔ سارے روگ جاتے رہیں گے۔"

کوئی دو اڑھائی گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرین بیر گنج کے چھوٹے سے پہاڑی سٹیشن پر آ کر رک گئی۔ بوڑھی چیلن مجھے اپنے ساتھ لے کر ڈبے سے اتری۔ وہ میرے ساتھ بالکل شفیق ماں ایسا سلوک کر رہی تھی۔ میں اپنی غرض کی وجہ سے اس کے ساتھ ہو گیا تھا کہ یہ عورت مجھے میری منزل تک پہنچا دے گی ورنہ مجھے ناگ مندر تک پہنچنے میں

Prepared By: S.Sohail Hussain

کافی پریشانی اٹھانی پڑتی۔ کیونکہ وہاں کوئی شخص میری راہ نمائی کرنے والا نہیں تھا۔ عورت مجھے بے ضرر بھی لگ رہی تھی۔ ہم سٹیشن سے باہر آ گئے۔ باہر دو تین یکے کھڑے تھے۔ یہ علاقہ ایسا تھا کہ کہیں زمین اونچی اور کہیں نیچی تھی۔ دور دور تک پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس عورت سے ناگ دیوتا کے مندر کا پتہ معلوم کرنے کے بعد بیج کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔ جب میں نے بوڑھی سپین سے کہا کہ مجھے ناگ مندر کا پتہ سمجھا دو۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا تو وہ بولی۔

"رام رام کرو بیٹا تم اکیلے وہاں کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہ مندر تو کیلاش پربت کے اوپر بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ ایک سرنگ میں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔ میں بھی ادھر ہی جا رہی ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں اس عورت کے ساتھ ہی چلوں۔ اس طرح آسانی سے ناگ دیوتا کے مندر میں پہنچ جاؤں گا۔ میں نے سپین سے کہا۔

"ماتا جی تو کل ناگ مندر جاؤں گا۔ میں سفر سے بڑا تھک گیا ہوں۔ اب میں کسی ہوٹل میں جا کر آرام کروں گا۔"

بوڑھی سپین منہ اوپر نیچے چلاتے ہوئے کہنے لگی۔

"جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔ تم مجھے اپنا ہوٹل دکھا دو۔ میں تمہیں صبح وہاں سے لے لوں گی۔"

"اچھا ماتا میرے ساتھ آؤ۔"

بیج ایک نیم پہاڑی قصبہ تھا۔ وہاں ایک ہی معقول ہوٹل تھا یہ ایک حویلی تھا جس کو ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کمرے کا کرایہ معمولی تھا۔ میں نے بوڑھی سپین سے کہا۔

"ماتا جی! میں اسی ہوٹل میں ہوں گا۔ کل صبح کے لوبجے تم آ جانا۔ پھر چل پڑیں گے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا ایسا ہی کرتے ہیں۔ تم آرام کرو۔ میں کل صبح آؤں گی۔"

بوڑھی عورت یعنی بوڑھی سپین چلی گئی۔ ابھی تک مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت بڑی مکار سپین ہے اور وہ ایک خاص مقصد دل میں رکھ کر میرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ جب وہ چلی گئی تو میں نے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر جیب میں سے رومال نکال کر کھولا۔ پاروتی کے سانپ کے روپ میں دونوں ٹکڑے اسی طرح موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ ان ٹکڑوں کو کسی چھوٹے سے ڈبے میں بند کر کے رکھنا چاہئے۔ پھر وہی ڈبہ میں اسی طرح کیلاش مندر کے تالاب میں ڈال دوں گا۔ میں نے ہوٹل کے نوکر سے ٹین کا ایک چھوٹا خالی ڈبہ منگوایا اور پاروتی کے سانپ جسم کے دونوں ٹکڑے اس میں ڈال کر ڈبے کو بند کر دیا۔ یہ ڈبہ اتنا چھوٹا تھا کہ میری جیب میں آسانی سے آ جاتا تھا۔ جس رومال میں میں نے پاروتی کے سانپ کے ٹکڑوں کو پہلے باندھ کر رکھا ہوا تھا وہ رومال میں نے اپنی دوسری جیب میں رکھ لیا۔ رات میں نے ہوٹل میں گزاری۔

دوسرے دن سورج نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بوڑھی سپین آ گئی۔ میں تھوڑی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا اور نیچے ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں نے بوڑھی سپین کو بھی چائے پلا دی۔ آخر وہ میری بے غرض مدد کر رہی تھی۔ مجھے اس کی اتنی خاطر داری تو ضرور کرنی چاہئے تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"ماتا جی میں اوپر جا کر تیار ہوتا ہوں تم یہیں بیٹھ کر چائے پیو۔"

وہ مجھے دعائیں دیتی ہوئی بولی۔

"بیٹا بھگوان تیرا بھلا کرے جنموں میں بھلا کرے تو میری بڑی خدمت کر رہا ہے۔ فکر نہ کر۔ میں بھی تجھے ناگ دیوتا کے مندر میں پہنچا کر واپس آؤں گی۔"

مجھے تیار کیا ہونا تھا۔ بس منہ ہاتھ دھویا۔ پاروتی کے سانپ کے ٹکڑوں والا ڈبہ سنبھال کر جیب میں رکھ لیا۔ بوڑھی سپین نیچے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ گٹھڑی اس کے ساتھ ہی تھی۔ کہنے لگی۔

"بیٹا یہاں سے یکہ لے لیں گے۔ اوپر ڈبرو گڑھ تک یکے جاتے ہیں۔ آگے

Prepared By: S.Sohail Hussain

پہاڑیوں میں پیدل سفر شروع ہو گیا۔"

ایک گھنٹہ ہم نے کرا لیا اور اونچے نیچے نیم میدانی کھیتوں میں سے گزرتے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈھوک گرہ کے گاؤں میں پہنچے۔ یہاں سے ہمارا پیدل سفر شروع ہو گیا۔ یہ بالکل ایسا موڑ تھا جس طرح ہمارے کوہ مری جاتے ہوئے ترنڈے کے مقام سے پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑی ہری بھری وادی میں ہم جا رہے تھے۔ میں نے بوڑھی عورت سے کہا۔

"ماتا تم تھک تو نہیں جاؤ گی؟ ہمیں کتنا پیدل چلنا پڑے گا؟"

وہ کہنے لگی۔

"ارے بیٹا میری تو ساری عمر ان پہاڑیوں میں آتے جاتے گزر گئی ہے۔ ہر سال کالی ماتا کی یاترا کو آتی ہوں۔ ہر مہینے میں ایک بار درشن کرنے بھی ضرور آتی ہوں۔ بس ہمیں ایک دن ایک رات لگ جائے گی مندر تک پہنچنے پہنچانے۔"

میل دو میل چلنے کے بعد چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہ ہمالیہ کی ترائی کے ٹیلے تھے۔ راستے میں کہیں کہیں کوئی چھوٹا سا گاؤں بھی آ جاتا۔ چھوٹے چھوٹے جھونپڑی نما مکان ہوتے جن کے آگے مٹی اور پتھروں کے چبوترے بنے ہوئے ہوتے۔

اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونے لگے۔ بوڑھی پیدل نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لو کا بیٹا برے لگ یہ تو بارش کا طوفان لگتا ہے۔ ہمیں کہیں رک جانا ہو گا۔"

بادل اتنے گہرے نہیں تھے مگر میں نے ست پڑا کے جنگلوں کے بادل دیکھے تھے۔ میں نے سوچا شاید ہمالیہ کی ترائی میں ایسے ہی بادل طوفانی بارش لاتے ہوں۔ میں اس بوڑھی عورت کی ایک ایک بات پر یقین کرتا جا رہا تھا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مگر یہ میری بے وقوفی تھی اور بیوقوف آدمی ضرور مار کھاتا ہے۔ قدرت کے اصول اور ضابطے عقل مند آدمی کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ قدرت خود اصول اور ضابطے کی پابند

ہے۔

میں نے اس عورت سے کہا۔

"آگے کوئی گاؤں ہو گا۔ وہاں کسی جھونپڑے میں پناہ لے لیں گے۔"

وہ بولی۔ "ہاں آگے ایک گاؤں آ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے۔"

بادل اتنے گہرے سیاہ نہیں تھے لیکن آپس میں گھل مل گئے اور لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ ایک ٹیلے کا چکر کاٹ کر ہم آگے بڑھے تو کھپریل کی چھتوں والے چھ سات بوسیدہ سے مکان دکھائی دیئے۔ بوڑھی پیدل نے ایک عورت سے آگے جا کر بات کی اور پھر مجھے اشارے سے بلایا۔

"یہ بڑے دھرمی لوگ ہیں۔ یاتریوں کی بڑی سیوا کرتے ہیں۔ انہیں دو چار روپے دے دو۔"

میں نے عورت کو چار روپے دیئے۔ وہ روپے لے کر بڑی خوش ہوئی۔ اس نے ایک مکان کا دروازہ کھول دیا۔ اندر پیاز کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں پیازوں کا ڈھیر لگا تھا۔ عورت کے آدمی نے اندر دو چارپائیاں ڈال دیں اور ہمارے لئے مٹی کے گلاسوں میں چائے بنا کر لے آیا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ کھپریل کی ڈھلوان چھت پر بارش کی آواز آنے لگی۔ بوڑھی پیدل چارپائی پر بیٹھ کر اپنی گٹھڑی کھولنے لگی۔

"بیٹا اس میں بھرے دو چار کپڑے۔ تمباکو اور تھوڑا سا گڑ ہے۔ یہ گڑ کالی ماتا کے مندر کا پرشاد ہے۔"

اور اس نے پوٹلی میں سے گڑ کی ڈلی نکال کر تھوڑا سا گڑ توڑ کر مجھے دیا۔ گڑ کا رنگ سنہری تھا۔ اس کے ساتھ تل اور بادام بھی لگے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"اسے کھاؤ۔ یہ پرشاد ہے۔ انکار نہ کرنا کالی ماتا ناراض ہو گی۔"

مجھے کالی ماتا کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن گڑ کی رنگت اور تل بادام دیکھ کر میرا جی للچا گیا۔ میں نے گڑ کا ٹکڑا لے کر منہ میں ڈال لیا۔ واقعی گڑ بڑا لذیذ تھا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

پہاڑیوں میں پیدل سفر شروع ہو گا۔"

ایک گھنٹہ ہم نے کرا ایک اور اونچے نیچے نیم میدانی کھیتوں میں سے گزرتے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈیرہ گزہ کے گاؤں میں پہنچے۔ یہاں سے ہمارا پیدل سفر شروع ہو گیا۔ یہ بالکل ایسا علاقہ تھا جس طرح ہمارے کوہ مری جاتے ہوئے تریٹ کے مقام سے پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑی ہری بھری وادی میں ہم جا رہے تھے۔ میں نے بوڑھی عورت سے کہا۔

"ماں! تم تھک تو نہیں جاؤ گی؟ ہمیں کتنا پیدل چلنا پڑے گا؟"

وہ کہنے لگی۔

"ارے بیٹا میری تو ساری عمر ان پہاڑیوں میں آتے جاتے گزر گئی ہے۔ ہر سال بالک دیوتا کی یاترا کو آتی ہوں۔ ہر مہینے میں ایک بار درشن کرنے بھی ضرور آتی ہوں۔ بس ہمیں ایک دن ایک رات لگ جائے گی سندر تک پہنچنے میں۔"

میل دو میل چلنے کے بعد چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہ ہمالیہ کی ترائی کے ٹیلے تھے راستے میں کہیں کہیں کوئی چھوٹا سا گاؤں بھی آ جاتا۔ چھوٹے چھوٹے جھونپڑی نما مکان ہوتے جن کے آگے مٹی اور پتھروں کے چبوترے بنے ہوئے ہوتے۔

اس وقت آسمان پر بادل جمع ہونے لگے۔ بوڑھی سپیرن نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"زور کا مینہ برسے گا۔ یہ تو بارش کا طوفان لگتا ہے۔ ہمیں کہیں رک جانا ہو گا۔"

بادل اتنے گہرے نہیں تھے۔ مگر میں نے ست پڑا کے جنگلوں کے بادل دیکھے تھے۔ میں نے سوچا شاید ہمالیہ کی ترائی میں ایسے ہی بادل طوفانی بارش لاتے ہوں۔ میں اس بوڑھی عورت کی ایک ایک بات پر یقین کرتا جا رہا تھا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مگر یہ میری بے وقوفی تھی اور بیوقوف آدمی ضرور مار کھاتا ہے۔ قدرت کے اصول اور ضابطے عقل مند آدمی کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ قدرت خود اصول اور ضابطے کی پابند

ہے۔

میں نے اس عورت سے کہا۔

"آگے کوئی گاؤں ہو گا۔ وہاں کسی جھونپڑے میں پناہ لے لیں گے۔"

وہ بولی۔ "ہاں آگے ایک گاؤں آ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے۔"

بادل اتنے گہرے سیاہ نہیں تھے لیکن آپس میں گھل مل گئے اور لگتا تھا کہ بارش ہو گی۔ ایک ٹیلے کا چکر کاٹ کر ہم آگے بڑھے تو کھپریل کی چھتوں والے چھ سات بوسیدہ سے مکان دکھائی دیئے۔ بوڑھی سپیرن نے ایک عورت سے آگے جا کر بات کی اور پھر مجھے اشارے سے بلایا۔

"یہ بڑے دھرمی لوگ ہیں۔ یاتریوں کی بڑی سیوا کرتے ہیں۔ انہیں دو چار روپے دے دو۔"

میں نے عورت کو چار روپے دیئے۔ دو روپے لے کر بڑی خوش ہوئی۔ اس نے ایک مکان کا دروازہ کھول دیا۔ اندر پیاز کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں پیازوں کا ڈھیر لگا تھا۔ عورت کے آدمی نے اندر دو چارپائیاں ڈال دیں اور ہمارے لئے مٹی کے گلاسوں میں چائے بنا کر لے آیا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ کھپریل کی ڈھلوان چھت پر بارش کی آواز آنے لگی۔ بوڑھی سپیرن چارپائی پر بیٹھ کر اپنی گٹھڑی کھولنے لگی۔

"بیٹا اس میں میرے دو چار کپڑے تمباکو اور تھوڑا سا گڑ ہے۔ یہ گڑ کالی ماتا کے مندر کا پرشاد ہے۔"

اور اس نے پوٹلی میں سے گڑ کی ڈلی نکال کر تھوڑا سا گڑ توڑ کر مجھے دیا۔ گڑ کا رنگ بھورا تھا۔ اس کے ساتھ تل اور بادام بھی لگے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"اسے کھاؤ۔ یہ پرشاد ہے۔ انکار نہ کرنا کالی ماتا ناراض ہو گی۔"

مجھے کالی ماتا کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن گڑ کی رنگت اور تل بادام دیکھ کر میرا جی للچا گیا۔ میں نے گڑ کا ٹکڑا لے کر منہ میں ڈال لیا۔ واقعی گڑ بڑا لذیذ تھا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

بوڑھی سپیرن گٹھڑی میں سے نکلے ہوئے پرانے کپڑوں کو جھاڑ کر تہہ کر رہی تھی اور بولے بھی جا رہی تھی۔

"تم بڑے بھاگ والے ہو جو ناگ دیوتا کے درشن کرنے جا رہے ہو۔ تمہاری ہر خواہش ہو گی وہ ضرور پوری ہو جائے گی۔ وہاں سے کوئی سوالی خالی نہیں جاتا۔۔۔"

بوڑھی سپیرن باتیں کئے جا رہی تھی۔ میں دوسری چارپائی پر بیٹھا اسے باتیں کرتے دیکھ رہا تھا کہ مجھے اچانک ایک چکر سا آیا اور مجھے اتنا یاد ہے کہ میں پیچھے کو گرا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

ہوش اس وقت آیا جب میں باہر برآمدے میں فرش پر پڑا تھا۔ مکان کا مالک اور اس کی پہاڑن بیوی میرے پاس بیٹھے مجھے ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ میں نے ہوش میں آتے ہی پوچھا۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

پہاڑن عورت نے کہا۔ "پتہ نہیں کیا ہوا تھا؟"

اس کا خاوند کہنے لگا۔

"ہم تو تمہارے لئے کھانا تیار کرنے میں لگے تھے کہ تمہاری ماتا جی مکان کا دروازہ بند کر کے میرے پاس آئی۔ کہنے لگی۔ میرا بیٹا سفر کرتے کرتے بہت تھک گیا ہے۔ اب وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ اسے جگانا مت۔ میں اس کے لئے جنگل سے ایک جڑی بوٹی لینے جا رہی ہوں۔ وہ چلی گئی۔ ہم نے تمہیں نہ جگایا۔ جب شام ہونے لگی تو ہمیں تمہاری فکر لگی۔ ہم نے جا کر دیکھا کہ تم بے ہوش پڑے تھے۔۔۔۔"

میں نے جلدی سے اٹھ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا بٹوا جس میں پیسے تھے اور نگین کی وہ مالا جس میں ناگن پاروتی کے ٹکڑے رکھے تھے غائب تھی۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یہ عورت اسی لئے میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اسے ناگن پاروتی کے جسم کے ٹکڑے چاہئے تھے اور وہ انہیں اڑا لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔

اس وقت رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

پہاڑی مکان کے برآمدے میں مٹی کے تیل کی لالٹین ستون کے ساتھ لگی جل رہی تھی۔ میں نے مکان کے مالک سے پوچھا کہ بوڑھی عورت کو گئے کتنی دیر ہو گئی ہے۔ اس نے کہا۔

"وہ تو دن کے وقت ہی چلی گئی تھی۔"

اس کا مطلب تھا کہ میں سارا دن بے ہوش پڑا رہا تھا۔ کاش میں اس عیار عورت کا کہا نہ مانتا۔ اس میں بے ہوشی کی دوائی ملی ہوئی تھی۔ اب کیا کروں؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھ سے پاروتی چھین لی گئی تھی۔ یقیناً یہ بوڑھی عورت کوئی سپیرن تھی اور اس نے میری جیب میں پڑے ہوئے پاروتی کے سانپ کے ٹکڑوں کی بو سونگھ لی تھی اور وہ اسے ہتھیانے کے لئے میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ پاروتی نے کئی بار مجھے کہا تھا کہ اب جب کہ مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے کہ انسانی شکل سے سانپ کی شکل اختیار کر سکتی ہوں تو میں دشمن سپیروں کے لئے بڑی قیمتی ہو گئی ہوں۔ اگر کوئی سپیرا مجھے اپنے قبضے میں کر لیتا ہے اور اسے ناگ دیوتا کے وہ خفیہ منتر بھی آتے ہیں جن کے پڑھنے سے میری یادداشت گم ہو سکتی ہے تو وہ مجھ سے بڑے خطرناک کام لے سکتا ہے۔ اس لئے اگر کبھی میرے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا اور کسی انسان نے مجھے معمولی سانپ سمجھ کر مار دیا تو میری لاش کو بہت سنبھال کر رکھنا اور کیلاش پربت کے مندر تک جاتے ہوئے

Prepared By: S.Sohail Hussain

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے کہ تم ناگن پاروتی کے سانپ کی لاش لے جا رہے ہو۔"

اسوس میں بوڑھی عورت سے دھوکا کھا گیا جو ضرور بڑی خطرناک سپیرن تھی۔ وہ پاروتی کی لاش کے ٹکڑے مجھے بے ہوش کر کے لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور خدا جانے اب وہ اسے اپنے قبضے میں کر کے اس سے کیسے کیسے برائی کے کام لیتی ہو گی۔ میرا فرض ہو گیا تھا کہ میں اس مکار بوڑھی سپیرن کا کھوج لگا کر اس سے پاروتی کی لاش کے ٹکڑے کسی طرح واپس لوں۔ میں نے پہاڑی آدمی سے پوچھا۔

"ماتا یہاں سے کس طرف گئی تھی؟"

میرا خیال تھا کہ وہ اوپر ناگ دیوتا کے مندر کی طرف گئی ہو گی۔ مگر پہاڑیا کہنے لگا۔

"میں رسوئی میں اپنی عورت کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے رسوئی کی کھڑکی سے تمہاری ماتا کو دیکھا تھا۔ وہ نیچے وادی میں شہر کی طرف جا رہی تھی۔ کیا تمہیں وہ نہیں ملی تھی؟ تم بے ہوش کیسے ہو گئے تھے؟ کیا تم نے زیادہ دارو پی لیا تھا؟"

میں نے اسے تو کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ یہاں میں نے سو روپے کا ایک نوٹ تہہ کر کے چھپا کر رکھا ہوا تھا کہ اگر میں چوری ہو گیا تو یہ روپے میرے کام آ سکتے ہیں۔ سو کا تہہ کیا ہوا نوٹ مجھے مل گیا۔ اسی جیب میں وہ رومال بھی تھا جس میں میں نے پاروتی کے سانپ کے روپ میں کٹے ہوئے ٹکڑے باندھے تھے اور پھر اس میں سے نکال کر لیمن کے ڈبے میں بند کر لئے تھے۔ میں یہ رومال پھینکنے لگا۔ پھر سوچا کہ یہ پاروتی کی نشانی ہے۔ اور میں نے رومال کو تہہ کر کے پچھلی جیب میں سو روپے کے نوٹ کے ساتھ ہی سنبھال کر رکھ لیا۔ میں نے دیہاتی آدمی سے کہا۔

"میں واپس بدر گنج جاؤں گا۔ کیا یہاں سے کوئی لیجر وغیرہ مل جائے گا جو مجھے بدر گنج لے جائے؟"

وہ کہنے لگا۔

"ہمارے پاس تو ایک گائے ہی ہے۔ وہ ہم تمہیں نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ تو ماتا ہے۔ ہم سواری نہیں کرتے۔ مگر رات کے اندھیرے میں تمہیں نہیں جانا چاہئے۔ ترائی کے جنگل میں رات کو بھالو اور چیتے نکل آتے ہیں۔"

میں مکار سپیرن کو جلد سے جلد پکڑنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم مجھے وہ راستہ بتا دو جو بدر گنج کو جاتا ہے۔ ہم جس راستے سے آئے تھے وہ مجھے یاد نہیں رہا۔"

آدمی نے کہا۔

"اگر تم ضرور جانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔"

اس نے لالٹین اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور میرے آگے آگے چلنے لگا۔ ڈھلان سے اتر کر ہم ایک پہاڑی پگ ڈنڈی پر آ گئے۔ یہ پگ ڈنڈی دو چار موڑ گھومنے کے بعد ایک کچے راستے پر نکل آئی۔ پہاڑیا بولا۔

"یہ راستہ بدر گنج کو جاتا ہے۔ میں ایک بار پھر تمہیں یہی کہوں گا کہ رات کے اندھیرے میں جنگل میں سفر کرنے میں بڑا خطرہ ہے۔ ادھر رات کو بھالو چیتے نکل آتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اشکارا دھوار بھائی ـــــــ"

اور میں بدر گنج کو جانے والے کچے راستے پر اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ یہ پہاڑی راستہ تھا۔ دونوں جانب پہاڑیاں تھیں جن میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ارد گرد چھوٹے بڑے ٹیلے تھے جو رات کے اندھیرے میں بڑے ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ میں چلتا گیا۔ رات اترائی کا تھا۔ اس لئے میری رفتار تیز تھی۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ بدر گنج وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ کیونکہ جب مکار عورت مجھے ساتھ لے کر بدر گنج سے چلی تھی تو کوئی آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد ہم چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں آ گئے تھے جہاں اس سپیرن نے مجھے بے ہوش کیا تھا۔ لیکن رات کی تاریکی کی وجہ سے مجھے رک رک کر

Prepared By: S.Sohail Hussain

چلا پڑ رہا تھا۔ ذرا کسی طرف سے کوئی کھڑکا ہوتا تو میں رک جاتا کہ کہیں کوئی بھالو
چیتا نہ ہو۔ لیکن خدا کا کرم شامل حال رہا۔ مجھے راستے میں کوئی چیتا یا ریچھ نہ ملا اور
ایک جگہ اترائی اترتے ہوئے مجھے کچھ فاصلے پر بیج گنج کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آنے
لگیں۔

میں بیج گنج پہنچ گیا۔ یہاں میں اسی ہوٹل میں آ گیا جہاں میں نے رات گزاری
تھی۔ یہ ہوٹل جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک شکستہ سے پرانا دو منزلہ مکان تھا
جس کو ہوٹل بنا دیا گیا تھا۔ میں نیچے ہوٹل کی دکان میں ہی بیٹھ گیا۔ میں نے پانی پیا۔
بھوک لگ رہی تھی۔ چاول دال منگوا کر کھائے۔ ہوٹل کا لڑکا مجھے بوڑھی سیتا کے
ساتھ دیکھ چکا تھا۔ وہ پانی کا مگ لے کر آیا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔

"صاحب تمہاری ماتا جی بھی دوپہر کو یہاں آئی تھی۔ بھوجن کر کے چلی گئی تھی۔"

میں نے چونک کر لڑکے کی طرف دیکھا۔

"وہ کس وقت آئی تھی؟"

لڑکے نے میری طرف حیرانی سے دیکھا اور کہا۔

"بارش ہو رہی تھی۔ دن کے نو دس بجے آئی تھی۔ وہ بارش میں بھیگ رہی
تھی۔ یہاں اس کمرے میں اس نے دوسری ساڑھی پہنی اور بھوجن کیا تھا۔ پھر شہر کی
طرف چل دی۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ آگے بڑا شہر گورکھپور ہی ہے۔ بیج گنج سے وہ سیدھا گورکھپور
گئی ہو گی۔ گورکھپور ایک بڑا شہر تھا۔ میں اسے وہاں کہاں تلاش کروں گا؟ وہ کہاں مل
سکے گی؟ کہیں وہ گورکھپور سے بھی آگے تو نہیں نکل گئی ہو گی؟ مجھے یہی سوال پریشان
کر رہے تھے۔ اس وقت رات کے نو سوا نو بجے کا وقت ہو گا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔
میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"اس وقت بیج گنج سے کوئی لاری یا ریل گاڑی گورکھپور کو جاتی ہے؟"

لڑکے نے کہا۔

"لاری تو کوئی نہیں جاتی۔ ریل گاڑی شاید مل جائے۔"

میں نے کھانے کا اور کمرے کا جو تھوڑا بہت بل بنتا تھا ادا کیا اور سیدھا بیج گنج کے
سٹیشن پر آ گیا۔ رات کے بارہ بجے کہیں جا کر مجھے ایک گاڑی ملی جو گورکھپور سے ہوتی
ہوئی پٹنہ کو جاتی تھی۔ کوئی دو بجے رات گورکھپور پہنچا۔ اگرچہ گورکھپور کے بارے میں
یہی پتہ چلا تھا کہ یہاں شروع شروع میں ہندو مسلم فساد ہوئے تھے مگر اس کے بعد امن
امان ہو گیا تھا۔ لیکن سٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ شہر میں رات کا کرفیو لگا ہوا ہے جو
صبح نو بجے کھلے گا۔ پلیٹ فارم پر بہت سے مسافر رکے ہوئے تھے۔ ان میں مسلمان بھی
تھے اور ہندو بھی۔ اس علاقے میں اب مجھے ہندو مسلم کی پہچان ہو گئی تھی۔ اگرچہ
بظاہر دیکھنے میں دونوں کے روپ ایک سے ہوتے تھے۔ مگر مسلمان کے کندھے پر ڈالے
ہوئے سرخ خانے دار پرنے کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن فسادات کی وجہ سے
اب مسلمانوں نے پرنے رکھنے چھوڑ دیئے تھے۔ اب صرف داڑھی سے پتہ چلتا تھا کہ
یہ مسلمان ہے۔ میں بھی پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ میرے ماتھے پر جو سرخ بندیا
لگی تھی وہ میں نے اتار کر پھینک دی تھی۔ یہ میں نے اس وقت لگائی تھی جب میں
پاروتی کی مہاپ لاش کے ٹکڑے لے کر کیلاش پربت کو ہندو بن کر جا رہا تھا۔ اب مجھے
ہندو بنے رہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ گورکھپور میں مسلمانوں کی کافی
آبادی تھی۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ گورکھپور کے سٹیشن پر بتیاں روشن تھیں۔ یہ
کافی بڑا شہر تھا۔ میں پلیٹ فارم پر کنکروں رساوں کے ایک بند کھوکھے کے ساتھ ٹیک
لگا کر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے عیار سیتا اس وقت تک نہ
جانے کہاں کی کہاں نکل چکی ہو گی۔ مجھے کوئی منصوبہ بندی کر کے اس کی تلاش شروع
کرنی تھی۔ اس کا سراغ مجھے سیتا سے یا کسی ایسے ہندو سے ہی لگ سکتا تھا جہاں
ناگ دیوتا کی پوجا ہوتی ہو۔ خدا جانے گورکھپور میں کوئی ایسا مندر تھا بھی یا نہیں۔ یہ
معلومات مجھے شہر میں صبح کرفیو کھلنے کے بعد ہی مل سکتی تھیں۔ اس بات کا ڈر بھی تھا کہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

اگر یہاں رات کا کرفیو لگا ہے تو ضرور شہر میں بلوہ ہوا ہو گا۔ میں شہر سے واقف تو
کھلے بندوں شہر میں پھرنا خطرے کی بات بھی ہو سکتا تھا۔
میں اسی الجھن میں بیٹھا سوچتا رہا۔ میرے قریب ہی ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔
ایک عمر رسیدہ مرد تھا جس کی داڑھی تھی۔ چار خانے کی دھوتی اور بنیان پہنی ہوئی
تھی۔ اس کے ساتھ دو تین عورتیں اور دو بچے تھے۔ یہ مسلمان فیملی لگتی تھی۔ میرا جی
چاہا کہ ان سے شہر کے حالات کے بارے میں کچھ معلوم کروں۔ میں اٹھ کر ان کے
پاس گیا۔ عمر رسیدہ بزرگ کو السلام علیکم کہا اور وہیں بیٹھ گیا۔
بزرگ نے وعلیکم السلام کہہ کر مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور منہ دوسری طرف
کر کے اپنی عورتوں سے دبی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے اس سے کہا
"بھائی صاحب میں مسلمان ہوں۔ پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ حج پر اپنے ایک عزیز
کے لئے گیا تھا۔ یہاں آ کر پھنس گیا ہوں۔ کیا شہر میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے؟"
اس آدمی نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا
"ہمیں تو کچھ معلوم نہیں۔ ہم تو لکھنؤ سے آئے ہیں۔ کل پاکستان جانے والی
گاڑی کا انتظار ہے۔ کہتے ہیں صبح جائے گی۔"
میں نے کہا "مجھے پتا تو اصل میں پاکستان ہے۔ میں پاکستان کے شہر لاہور کا
رہنے والا ہوں مگر سنا ہے پنجاب میں ہندو سکھ مسلمانوں کے قافلوں اور ریل گاڑیوں پر
حملے کر رہے ہیں۔ اور مسلمان مہاجرین کو قتل کر رہے ہیں۔ اس لئے اب میں چاہتا
ہے کہ یہاں سے نکلتے چلا جاؤں۔ وہاں سے بمبئی جاؤں اور وہاں سے سمندری جہاز
میں سوار ہو کر کراچی کی طرف نکل جاؤں۔"
"ہاں میاں! تمہارے لئے یہی راستہ مناسب رہے گا۔ مشرقی پنجاب میں تو ہر طرف
آگ لگی ہے۔ سکھ ہندو مل کر مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے ہیں۔ انہیں قتل
کر رہے ہیں۔ مہاجرین کی جو ریل گاڑیاں پاکستان جاتی ہیں ان کو راستے میں ہی روک
کر لوٹ لیتے ہیں۔"

یہ ساری باتیں مجھے معلوم تھیں۔ میں گورکھپور شہر کے بارے میں ان سے پوچھنا
چاہتا تھا کہ یہاں ہندوؤں کی آبادی کتنی ہے اور کیا یہاں کوئی ایسا مندر بھی ہے جہاں
سانپوں کی پوجا ہوتی ہے۔ جب میں نے بڑے طریقے سے یہ باتیں ان سے پوچھیں تو وہ
بزرگ کہنے لگے۔
"میاں ان ہندوؤں کے مذہب میں تو ہر جانور کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ کوئی مذہب
نہیں ہے گورکھپور میں مسلمان بھی رہتے ہیں مگر اس شہر میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔
سنا ہے یہاں ایک مندر ہے جہاں سانپ کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے۔ لیکن تم کیوں پوچھ
رہے ہو؟"
میں نے جلدی سے کہا
"یونہی پوچھ رہا تھا۔ بھلا مجھے ان ہندوؤں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"
اس بزرگ سے گورکھپور میں ایک ایسے مندر کا سراغ مجھے مل گیا تھا جہاں ناگ
کی پوجا ہوتی تھی۔ اب مجھے اس مندر میں جا کر اس مکار بوڑھی سپیرن کا سراغ لگانا تھا
کہ کہیں وہ وہاں تو نہیں آئی۔ میری تفتیش اسی طرح ایک ایک قدم ایک ایک مرحلہ
کر کے آگے بڑھ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ عورت میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔
اب میں سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کے مطابق چل کر ہی اس کا کوئی کھوج لگا سکتا تھا۔
کسی نہ کسی طرح رات گزر گئی۔ دن نکلا تو پلیٹ فارم پر کچھ رونق نظر آنے لگی۔
مسافر چائے کی کینٹین پر جا کر اپنے لئے اور اپنے بال بچوں کے لئے ناشتے کا سامان
خریدنے لگے۔ میں نے بھی وہیں پلیٹ فارم پر ناشتہ کیا اور کرفیو کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔
میں اس پلیٹ فارم پر آ گیا جس کے گیٹ میں سے باہر شہر کا بازار نظر آ رہا تھا۔ بازار
خالی پڑا تھا۔ سٹیشن کے بالکل سامنے ایک چھوٹے سے پلاٹ میں فوارہ لگا تھا جو بند تھا۔
پولیس کے کچھ سپاہی ہاتھ میں ڈنڈے لئے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔
کرفیو کھلنے کا سائرن بجا تو بازار میں رکشے یکے اور لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو
گئی۔ خدا جانے لوگ کہاں کہاں سے نکل کر سڑک پر آ گئے تھے۔ میں بھی سٹیشن سے

Prepared By: S.Sohail Hussain

باہر آگیا۔ مجھے اب ہندو بن کر یعنی اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے ناگ پوجا لے مندر کا پتہ معلوم کرنا تھا۔ تانگہ سٹینڈ پر تین چار یکے خالی کھڑے تھے۔ ایک کوچوان شکل صورت سے ہندو لگتا تھا۔ اس کو صرف میں ہی پہچان سکتا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"بھیا شہر میں کچھ شانتی ہوئی ہے کیا؟"

وہ بولا۔ "شانتی کیوں نہیں ہو گی بابو جی۔ مسلموں کو مار دیا ہے یا نکال دیا ہے شہر سے۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں سمجھ گیا کہ کوچوان ہندو ہے۔ میں نے کہا۔

"بھیا کیلاش پربت ناگ دیوتا کے درشنوں کو گیا تھا۔ اب گورکھپور کے ناگ مندر میں بھی پوجا کرنے کا خیال ہے۔ پھر واپس اپنے شہر رامپور چلا جاؤں گا۔ کیا مجھے ناگ مندر لے چلو گے؟"

"ناگ جی کے مندر کا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں ہاں وہی——"

"بیٹھ جاؤ۔"

میں یکے میں بیٹھ گیا۔ یکہ شہر کی سڑک پر چل پڑا۔ گرمی کھلتے ہی دکانیں بھی کھل گئی تھیں۔ لوگ سودا سلف لینے گھروں سے نکل آئے تھے۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی جو اپنی وضع قطع سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ یکہ دو مندروں کے سامنے سے بھی گزرا۔ آخر کوچوان نے مجھے ایک بازار کے کونے پر لے آیا۔ کہنے لگا۔

"یہ رہا ناگ جی کا مندر بابو۔"

یہ مندر بھی ویسا ہی تھا جیسا اکثر بڑے شہروں میں چھوٹے مندر میں نے دیکھے تھے۔ احاطہ تھا۔ احاطے میں پیپل اور نیم کے درخت تھے۔ کونے میں بہت بڑا چبوترہ تھا جس کے اوپر قطبی مینار والی مندر کی عمارت کھڑی تھی۔ مینار کے اوپر زعفرانی رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ گرمی کھلا ہی تھا۔ بہت ہندو لوگ پوجا پاٹھ کرنے وہاں

آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ مندر کے اندر گھنٹیاں اور گھڑیال بج رہے تھے۔ میں نے احاطے میں ایک طرف کھڑے ہو کر چاروں طرف غور سے دیکھا۔ یہاں بھی درختوں کے نیچے کہیں کہیں سادھو دھونی رمائے بیٹھے تھے اور لوگ ان کے آگے پوری پکوڑی کے دونے رکھ رہے تھے۔ سادھو لمبی لمبی چلمیں چھوٹے چلم سے لگائے چرس مدک پی رہے تھے۔ یہاں مجھے وہ عیار پہلوان کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ اندر چل کر بھی ایک نظر دیکھ لینی چاہیے۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر مندر میں آ گیا۔ ہندوؤں کے دوسرے مندروں کی طرح یہاں بھی ایک تنگ سا کمرہ تھا جس میں دم گھٹ رہا تھا۔ لوبان اور ہرنل کی بو سے فضا سخت بوجھل ہو رہی تھی۔ دیوار میں پتھر کا ایک سیاہ رنگ کے سانپ کا بت بنا ہوا تھا جس نے پھن کھول رکھا تھا۔ اس کے پھن کے اوپر دو دیئے جل رہے تھے۔ سانپ کے پھن پر سیندور کا پوچا پھیرا ہوا تھا۔ ہندو عورتیں اور مرد اس کے آگے سجدے کر رہے تھے۔ میں نے سانپ کے بت کی طرف ایک نظر دیکھا۔ عورتوں پر نگاہ ڈالی جس شکل کی مجھے تلاش تھی وہ شکل وہاں نظر نہ آئی تو میں مندر سے باہر نکل آیا۔ میں چبوترے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ میں نے دو آدمیوں کو دیکھا جو قریب ہی ایک درخت کے پاس کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ یہ آدمی جب میں مندر میں داخل ہوا تو اس کے گیٹ کے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور جب میں مندر کے چبوترے کی طرف جا رہا تھا تو میں نے یونہی پلٹ کر دیکھا تو یہ آدمی میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ بڑا کٹا آدمی تھا۔ رنگ کالا تھا۔ گردن بھینسے کی طرح موٹی تھی اور سر کے درمیان سے چوٹی باہر نکلی ہوئی تھی۔ اب یہی آدمی اپنے کسی ساتھی کو لے کر وہاں آ گیا تھا۔ غالباً اسے مجھ پر شک ہوا تھا کہ میں ایک اجنبی ہوں اور مندر میں آیا ہوں۔ ہو نہ ہو میں ضرور مسلمان ہوں گا۔ مجھے یکے والے ہندو نے بھی بتایا تھا کہ ان مندروں میں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان غلطی سے مندر میں آ

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہتھیلے تو پجاری کے آدمی اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ شاید ان آدمیوں کو میرے مسلمان
ہونے کا علم ہو گیا تھا۔ انہیں مجھ پر کچھ نہ کچھ شک ضرور پڑ چکا تھا۔ شہر کی فضا فسادات
کی وجہ سے پہلے ہی کشیدہ تھی۔

میں نے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن تقدیر میں کچھ ایسی باتیں بھی
تقدیر لکھ دیتا ہے کہ وہ پوری ہو کر ہی رہتی ہیں۔ انسان لاکھ ہاتھ پاؤں مارے وہ ہو کر
ہی رہتی ہیں۔ جب میں نے مندر سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تو ساتھ ہی مجھے یہ خیال
بھی آ گیا کہ مندر کے پیچھے بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہئے۔ ہو سکتا ہے میرا سیتا وہاں
نظر آ جائے کیونکہ وہ عورت کیلاش پربت سے اتر کر اسی طرف آئی تھی۔ میں وہیں
سے پتھر کی دیوار کے عقب کی طرف گھوم گیا۔ یہ مندر کا پچھواڑہ تھا۔ یہاں بھی
کے درخت ادھر ادھر اگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں۔ کونے میں ایک کچا
کوٹھا تھا جس کے باہر بندھی ہوئی بکری مے مے کر رہی تھی۔ دیوار کی ایک جانب
گھاس بندھی ہوئی تھی۔ یہاں سیتا تو کیا کسی انسان کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

میں واپس جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ اچانک مجھے کسی نے پیچھے سے اپنے
بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں بوکھلا گیا۔ میں نے ان دیکھے آدمی کے بازوؤں سے نکلنے کی
کوشش کی تو مزید دو آدمی آ گئے اور انہوں نے آتے ہی میرے منہ میں کپڑا ٹھونسنا
شروع کر دیا۔ میں نے پہچان لیا ان میں دو آدمی وہی تھے جو میرا پیچھا کر رہے تھے
جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا وہ وہی بڑی والا کالا کلوٹا ہندو تھا۔ میں نے شور مچانے کی بہت
کوشش کی مگر میرا منہ کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس دوران ایک ہندو نے میرے
ہتھے دیکھ لئے۔ وہ چلا کر بولا۔

"ارے سالے مسلا اس کو لے چلو۔ تم نے ٹھیک کہا تھا بھیکو!"

بھیکو اس کالے کلوٹے بھینسا نما ہندو کا نام تھا جس نے سب سے پہلے پیچھے سے آ
کر مجھے دبوچا تھا۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھے اور مجھے الٹا
کر سامنے کونے میں جو کوٹھا تھا اس کے اندر لے گئے اور فرش پر پھینک کر باہر سے

کنڈی لگا دی۔ کسی نے کہا۔

"پجاری جی سے کہو۔ مسلمان پکڑا ہے۔ آج اماوس کی رات ہے۔ شو بھگوان کے
بھگ جی نے خود ہی اپنی بھینٹ کے لئے مسلمان بھیج دیا ہے۔"

میرا خون خشک ہو گیا۔ یہ لوگ مجھے اپنے بھگ دیوتا پر قربان کرنے والے تھے۔
میں نے اللہ سے دعا مانگی۔

"اللہ پاک! مجھے ان کافروں سے بچا لے۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میرے ہاتھ پیر رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔

میں اندھیری کوٹھڑی میں فرش پر ایک طرف منہ کر کے پڑا تھا۔ میرے ہاتھ انہوں نے پیچھے باندھے تھے جس کی وجہ سے میں سیدھا نہیں لیٹ سکتا تھا۔ پتا نہیں یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ لیکن میں جس راستے پر چل پڑا تھا وہاں میرے ساتھ یہی کچھ ہونا تھا۔ کہاں بستی جا رہا تھا اور بلیر گٹ پکڑا گیا۔ ٹی ٹی نے مجھے اندھیری رات کو جنگل میں اتار دیا۔ اس کے بعد واقعات کیسی کیسی خوفناک شکلیں اختیار کرتے چلے گئے اور میں پھنستا ہی چلا گیا۔ لیکن ابھی تو میں رسیوں سے بندھا کوٹھڑی میں بند تھا اور جیسا کہ ان ہندوؤں نے کہا تھا یہ لوگ بھگ دیوتا پر میری قربانی دینے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہندوستان کے کونے کونے میں پھر کر اس کے شہروں دیہاتوں اور جنگلوں میں آوارہ گردی کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہو کر مجھے ہندوؤں کی بہت سی باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ ان کے مذہب میں میں نے ایسی ایسی باتیں دیکھی تھیں کہ جو نہ صرف درندگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھیں بلکہ تہذیب و شائستگی سے گری ہوئی اور کراہت انگیز بھی تھیں۔ مثال کے طور پر راجستھان میں کلی ناتھ کا مندر ہے جہاں چوہوں [illegible] ہے۔ اس مندر میں بڑے پلے ہوئے موٹے موٹے چوہے چاروں طرف بے آزادی سے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ لوگ ان کے آگے دودھ حلوہ اور مٹھائیاں رکھتے ہیں۔ کراہت کی بات یہ ہے کہ وہاں بیٹھ کر لوگ جس تھال میں

مٹھائی یا دال چاول کھاتے ہیں چوہے بھی اسی تھال کے کناروں پر بیٹھ کر ساتھ ساتھ کھاتے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ پوجا کرنے والے چوہوں کے منہ سے لقمہ لے کر خود بڑے مزے سے کھا لیتے ہیں ذرا غور کریں۔ دنیا کا کوئی ایسا مذہب جس میں ذرا سی بھی عقل ہو گی کبھی یہ مکروہ حرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن راجستھان کے اس مندر میں پوجا پاٹھ کرنے آنے والے لوگ چوہوں کو اپنے کھانے کی تھالی میں بٹھا کر ان کے ساتھ کھاتے اور ان کا جوٹھا دودھ بڑے شوق سے پیتے ہیں۔ یقین کریں پاکستان کا قیام ایک قدرتی عمل تھا۔ مسلمان میں اور ہندو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور یہ بھی یقین کریں کہ اگر مسلمانوں میں صادق اور جعفر ایسے غدار وطن پیدا نہ ہوئے ہوتے تو پاکستان سلطان ٹیپو کے زمانے میں ہی بن چکا ہوتا۔

اگر آپ کے دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے بندھے ہوں اور پاؤں بھی رسی سے بندھے ہوں تو آپ زیادہ دیر ایک پہلو پر لیٹے نہیں رہ سکتے۔ میرا کندھا شل ہو گیا اور میں اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ اس طرح تھوڑا سکون ضرور ملا مگر کبھی میں چہرہ ایک پہلو پر کرتا کبھی دوسری طرف کر لیتا۔ اس قسم کی مصیبت بھی مجھ پر پہلے نہیں پڑی تھی۔

دروازہ کوئی باہر سے کھول رہا تھا۔ میں نے دروازے پر نظریں جما دیں۔ دروازے کے کھلتے ہی دن کی روشنی بھی تین آدمیوں کے ساتھ اندر آئی تھی۔ انہوں نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ ان لوگوں کی آوازوں سے میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے مجھے یہاں باندھ کر پھینکا تھا۔

سب سے پہلے انہوں نے میری آنکھوں پر کس کر پٹی باندھ دی۔ پھر مجھے ڈولی اٹھا کر کے اٹھایا اور باہر لے گئے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ باہر اور اندر کا صرف اتنا فرق تھا کہ کوٹھڑی کے گھپ اندھیرے میں جب انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی تو اندھیرے میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ باہر چونکہ دن کی روشنی تھی اس لئے صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کچھ روشن روشن ہو گئی تھی مگر نظر پھر بھی نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگا جیسے انہوں نے مجھے کسی سٹریچر پر ڈال دیا ہے۔ پھر یہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

سٹریچر چل پڑا۔ کچھ دور جانے کے بعد سٹریچر ڈھلان پر اترتا محسوس ہوا۔ مجھے ان لوگوں کے قدموں کی آواز ساتھ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد ان میں سے ایک آدمی بولا تو اس کی گونج سی پیدا ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مجھے زمین کے نیچے کسی جگہ لے چلا جا رہا تھا۔ فضا بھی تھوڑی گرم ہو گئی تھی۔ میں زندگی سے مایوس تو نہیں ہوا تھا کیونکہ زندگی اور موت تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن لگ یہی رہا تھا کہ میری موت کا جو وقت مقرر ہوا تھا وہ وقت آن پہنچا ہے۔

سٹریچر ایک طرف کو مڑنے کے بعد سیدھا ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ رینگنے لگا اور پھر رک گیا۔ مجھے لوبان اور جڑی کی تیز بو آنے لگی۔ سب سے پہلے میرے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کھول دی گئیں۔ لیکن دو آدمیوں نے دائیں بائیں سے میرے بازوؤں کو پکڑے رکھا۔ میری آنکھوں کی پٹی بھی کھول دی گئی۔ سب سے پہلے میں نے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی مشعل کو دیکھا۔ اس طرح کی تین چار مشعلیں دیوار کے ساتھ لگی جل رہی تھیں۔ یہ ایک بڑا تہہ خانہ تھا جس کے درمیان میں پھن دار سانپ کا بت نصب تھا۔ بت کے آگے گول دائرے میں بنا ہوا گڑھا تھا گڑھے کے کنارے اونچے تھے۔ پہلے میں اسے کنواں سمجھا مگر گڑھے میں ایک آدمی چل پھر رہا تھا۔ اس کا صرف سر مجھے نظر آتا تھا۔ وہی تین آدمی جو مجھے لے کر وہاں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بازو کی پٹی سے سٹریچر کے ساتھ باندھ دیا۔ سٹریچر ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے آواز کو ذرا رعب دار بناتے ہوئے پوچھا۔

"تم لوگ مجھے یہاں کس لئے لائے ہو؟"

"ابھی پتہ چل جائے گا کہ تمہیں یہاں کیوں لائے ہیں؟"

فرش پر سامنے والی دیوار کے ساتھ دری بچھی تھی۔ دری پر لال رنگ کے بڑے بڑے تکیے پڑے تھے۔ تینوں آدمی دری پر جا کر بیٹھ گئے اور آپس میں سرجوڑ کر بڑی رازداری سے باتیں کرنے لگے۔ تہہ خانے کا ایک دروازہ بھی تھا مگر اس دروازے کے پٹ نہیں تھے۔ دروازے پر لال رنگ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ تہہ خانے میں اترائی اتر کر تا

پڑتا تھا۔ مجھے آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ تینوں آدمی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پردہ ہٹا اور مزید تین آدمی اندر آ گئے۔ ان میں دو آدمی دبلے پتلے تھے اور ایک آدمی گول مٹول اور موٹا تھا۔ اس کی توند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ان سب نے دھوتی بلیاں پہنی ہوئی تھی۔ صرف موٹے آدمی نے کندھے پر دھاری دار پٹکا ڈال رکھا تھا۔ اس کے ماتھے پر سرخ رنگ کی تین لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ یہ مندر کا بڑا پجاری لگتا تھا۔

وہ آتے ہی دری پر درمیان والے بڑے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ باقی لوگ اس کے دائیں بائیں ادب سے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہاں خاموشی چھائی رہی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ شاید یہاں خاموشی کا کوئی چلہ کاٹنے آئے ہیں۔ بڑے پجاری نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ایک آدمی جلدی سے اٹھ کر تہہ خانے سے نکل گیا۔ کوئی تین منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ اپنے ساتھ تین عورتوں کو لے کر آ گیا۔ ان عورتوں نے بھڑکیلے رنگوں کی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ بالوں میں سرخ پھولوں کے گجرے تھے اور چہروں پر زبردست میک اپ کیا ہوا تھا۔ تینوں عورتیں باری باری موٹے پجاری کے پاس گئیں۔ جھک کر اس کے پاؤں چھو کر ماتھے پر لگائے اور بڑے ادب سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئیں۔ تینوں نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ بڑے پجاری نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"پارتی کی کالج شروع ہو"

شو دیوتا کو ہندو جوگی برہمچاری کا دیوتا مانتے ہیں۔ اس دیوتا کے سر پر جٹوں کا جوڑا بندھا ہوتا ہے اور جوڑے میں ایک سانپ پھن کھولے بیٹھا دکھایا جاتا ہے۔ دو سانپ شو دیوتا کے بازوؤں سے اور ایک سانپ اس کی گردن سے بھی لپٹا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ پارتی اس دیوتا کی بیوی کا نام ہے۔ انڈیا میں سانپوں کی پوجا کرنے والے شو کو ہی اپنا بڑا دیوتا مانتے ہیں اور دور دراز دیہات اور جنوبی ہند کے پاس ملحقہ علاقوں میں آج بھی سانپ دیوتا کے آگے زندہ عورتوں اور بچوں کی قربانی دی جاتی ہے۔

پجاری کا اشارہ پا کر تینوں عورتیں اٹھیں اور درمیان میں سانپ کا جو بڑا سا بت

Prepared By: S.Sohail Hussain

رکھا ہوا تھا اس کے گرد والس کرنے لگیں۔ وہ ساتھ ساتھ خدا جانے کس زبان کا کوئی
گیت بھی گا رہی تھیں۔ میں سنیچر پر تقریباً نیم جان پڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہ
ساری تیاریاں میری موت کی تیاریاں تھیں۔ یہ لوگ خدا جانے مجھے کیسی اذیت ناک
موت مارنے والے تھے۔ بس میں دل میں خدا کے حضور دعائیں مانگ رہا تھا۔ رقص
جاری تھا کہ دری پر بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے دو آدمی اٹھے۔ سانپ کے بت کے
پیچھے گئے اور وہاں پڑے ہوئے دو ڈھول اٹھا کر لے آئے اور ڈھول بجاتے ہوئے وہ بھی
رقص کرنے والی عورتوں میں شامل ہو کر سانپ کے بت کے گرد چکر لگانے لگے۔ دس
پندرہ منٹ کے بعد رقص کرنے والی عورتیں اور ڈھول بجانے والے مرد سانپ کے
مجسمے کے آگے جو لوہے کی منڈیر والا گڑھا کھدا ہوا تھا اس کی ایک جانب قطار بنا کر کھڑے
ہو گئے۔ آدمی ڈھول بجا رہے تھے مگر عورتیں رقص کرنے کی بجائے گانا گا رہی تھیں اور
ہاتھ باندھ کر دائیں بائیں جھوم رہی تھیں۔ اب موٹا پجاری اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا
سانپ کے بت کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ گیت اور ڈھول کی آواز تھم گئی۔ پجاری نے
ہاتھ باندھ کر سانپ کے بت پر نظریں جما کر اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے اس دوران
باقی آدمیوں نے سب سے پہلے میرے ہاتھ ایک بار پھر پیچھے رسی سے کس کر باندھ
دیئے۔ پٹی کھول کر مجھے سنیچر سے اتارا اور بازوؤں سے پکڑ کر سانپ کے بت کے
سامنے گڑھے کی منڈیر کے پاس لے آئے۔

جیسے ہی میں گڑھے کی منڈیر یا دیوار کے پاس آیا ڈھول بجانے والوں نے زور زور
سے ڈھول بجایا اور عورتوں نے دوبارہ گانا شروع کر دیا۔ ایک بار پھر وہاں شور مچ گیا۔
اسی شور میں دو آدمیوں نے مجھے پیچھے سے اٹھا کر گڑھے میں پھینک دیا۔ میں گڑھے
میں مٹی کے ڈھیر پر گرا۔ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا سر منڈیر سے تھوڑا اونچا تھا مگر
میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میں ان لوگوں کا منہ تک رہا تھا جو مشعلوں کی روشنی میں
عورتوں کے ہاتھ پکڑ کر دیوانہ وار والس کر رہے تھے۔ پجاری میرے سامنے کھڑا زور
زور سے اشلوک پڑھ رہا تھا۔

پھر ایک دم سے شور تھم گیا۔

پجاری نے ہاتھ اوپر اٹھائے۔ فوراً تمام آدمی دیواروں پر سے مشعلیں اتار کر لے
آئے اور یہ مشعلیں گڑھے کی دیوار پر لگے ہوئے کنڈوں میں پھنسا دی گئیں۔ ان کی
روشنی گڑھے میں بھی پڑنے لگی۔ میں نے دیکھا گڑھے میں مٹی ہی مٹی تھی۔ اور
کچھ نہیں تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ یہ لوگ مجھے گڑھے میں پھینک کر چلے جائیں
گے۔ ان کا مقصد یہ ہو گا کہ میں یہاں بھوکا پیاسا رہ کر اپنے آپ مر جاؤں۔ لیکن میری
یہ خوش فہمی فوراً ہی دور ہو گئی۔ دو آدمی گڑھے میں اتر گئے۔ انہوں نے مجھے بازوؤں
سے پکڑ کر گڑھے کی دیوار کے ساتھ لگا کر زبردستی کھڑا دیا۔ اور پیچھے دیوار میں لوہے کی
ہک لگی تھی۔ مجھے رسی سے اس ہک کے ساتھ اس طرح باندھ دیا کہ میں اٹھ نہیں
سکتا تھا۔ دونوں آدمی گڑھے میں سے باہر نکل گئے۔ میں اوپر دیکھ رہا تھا۔ باہر خاموشی
چھا گئی تھی۔ پھر کسی نے گڑھے کی دیوار کے اوپر بڑا سا ٹوکرا لا کر رکھ دیا۔ میں نے
مشعلوں کی روشنی میں ایک آدمی کو دیوار پر چڑھتے دیکھا۔ وہ ٹوکرے کے پاس کھڑا ہو
گیا۔ اس نے کوئی نعرہ لگایا۔ جس کے جواب میں دوسرے آدمیوں نے بھی نعرے
لگانے شروع کر دیئے۔ نعروں کے شور میں دیوار پر کھڑے آدمی نے ٹوکرے کا ڈھکنا اٹھا
کر پرے پھینکا اور ٹوکرا میرے اوپر الٹ دیا۔ میری چیخیں نکل گئیں۔

ٹوکرے میں سانپ تھے جو میرے اوپر آ کر گرے اور پھنکاریں مارنے لگے۔ میری
چیخوں کی آواز پر باہر عورتوں اور مردوں نے اونچی آوازوں میں اشلوک گانے شروع کر
دیئے۔ باہر پھر ایک شور مچ گیا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لوگ گڑھے کے گرد چکر لگا
رہے ہیں لیکن گڑھے میں کوئی نہیں جھانک رہا تھا۔ گڑھے کے اندر میرے ساتھ ایک
عجیب کرامت ہو گئی۔ مجھ پر سانپوں کا جو ٹوکرا پھینکا گیا تھا اس میں چھوٹے بڑے کتنے
ہی سانپ تھے۔ سانپ مجھ پر گرتے ہی پھنکارتے اور میری گردن کندھوں اور بازوؤں پر
چڑھنے لگے۔ لیکن فوراً ہی خدا جانے کیا بات ہوئی کہ ایک ساتھ سارے کے سارے
سانپ میرے جسم سے اتر گئے۔ ان کی پھنکاریں خاموش ہو گئیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران

Prepared By: S.Sohail Hussain

رہ گیا کہ سارے کے سارے سانپ وہیں بیٹھیں تو ضرور تھے مجھ سے پانچ فٹ کے فاصلے پر اکٹھے ہو کر کنڈلیاں مار کر بیٹھ گئے اور میری طرف پھن اٹھا کر دیکھنے لگے۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ شاید خدا نے میری فریاد سن لی تھی اور سانپوں کو مجھ سے الگ کر دیا تھا۔ پھر یہ خیال آیا کہ شاید سانپ باری باری آگے آئیں گے اور مجھے ایک ایک کر کے ڈستے چلے جائیں گے۔ پجاری نے شاید انہیں اسی طرح سدھایا ہوا ہو۔ مگر ایسی بھی کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک منٹ دو منٹ گزر گئے اور سانپ اپنی جگہ پر بیٹھے مسلسل میری طرف تکتے رہے۔ اس دوران باہر آدمیوں اور عورتوں کے اونچی اونچی اشلوک گانے کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ شاید وہ مجھے اس وقت دیکھنا چاہتے تھے جب سارے سانپوں نے مجھے ڈسنے کے بعد میرا جسم نوچ نوچ کر ادھیڑ دیا ہو۔

اچانک کسی مرد نے اونچی آواز میں نعرہ بلند کیا۔

اس کے ساتھ ہی گانے اور آدمیوں کی آواز خاموش ہو گئی۔ میں نے اوپر گڑھے کی منڈیر کی طرف دیکھا۔ وہاں کتنے ہی انسانی چہرے مجھے اس طرح بندھا ہوا بیٹھا اور سانپوں کو ایک جگہ کنڈلی مارے پھن کھولے بیٹھا دیکھ کر حیران تھے۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے گڑھے میں مجھے اور سانپوں کو دیکھ رہے تھے۔ پجاری نے ایک آدمی کو زور سے باآواز بلا کر کہا۔

"سلاخ چلاؤ۔ جلدی کرو۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔"

ایک آدمی نے لمبی سلاخ گڑھے میں ڈالی۔ سلاخ آگے سے مڑی ہوئی تھی۔ اس نے سلاخ سے ایک سانپ کو پکڑا اور میرے اوپر ڈال دیا۔ سانپ نے پھنکار ماری اور جیسے میرے جسم سے خوف زدہ ہو کر جلدی سے بھاگ کر دوسرے سانپوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ یہ بات میری سمجھ سے بھی باہر تھی کہ آخر سانپ مجھ سے خوف کھا کر کیوں بھاگا ہے۔ پجاری اوپر سے دوسرے آدمیوں اور عورتوں کے ساتھ گردن نکالے یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے سلاخ والے آدمی کو غصے میں کہا۔

"سارے سانپ اس مسئلے کے اوپر ڈال دو۔"

سلاخ کی مدد سے باری باری دو دو تین تین کر کے میرے اوپر سانپ پھینکے گئے مگر ہر بار یہی ہوا کہ جیسے ہی سانپ میرے جسم پر گرتا وہ تڑپ کر ایک طرف کو چھلانگ لگاتا اور تیزی سے رینگتے ہوئے دیوار کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ اب پجاری اور اس کے آدمی حیران ہونے کے ساتھ کچھ خوف زدہ بھی ہو گئے تھے۔ ادھر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وجہ ہو بھی ہو لیکن یہ سانپ مجھے کاٹیں گے نہیں۔ میں نے سوچا اس موقع سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہئے۔ کوئی پتہ نہیں کچھ دیر کے بعد ان سانپوں کا خوف دور ہو جائے اور یہ مجھ پر حملہ کر دیں۔ میں نے چہرہ اوپر اٹھا کر رعب دار آواز میں کہا۔

"تم دیکھ رہے ہو کہ ان سانپوں نے مجھے کچھ نہیں کہا اور میرے غلام بن گئے ہیں۔ بچے! اگر میری رسیاں کھول دو نہیں تو میں ان سانپوں کو حکم دوں گا اور تم سب کو اوپر آ کر ڈس لیں گے۔"

بڈھا پجاری، اس کے ساتھی اور عورتیں پہلے ہی مجھ سے بے حد متاثر ہو چکی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سانپوں نے مجھے کچھ نہیں کہا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ جب میں نے رعب دار آواز میں انہیں اپنی رسیاں کھولنے کا حکم دیا تو فوراً ایک آدمی سیڑھی لگا کر گڑھے میں اتر آیا۔ اس نے میری رسیاں کھول دیں اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"شما کر دیں مہاراج!"

میں گڑھے سے باہر نکلا تو سب ہاتھ جوڑ کر ادب سے کھڑے تھے۔ بڈھے پجاری نے کہا۔

"مہاراج! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ شو دیوتا کے داس ہیں؟"

میں نے کہا۔

"اگر میں پہلے بتا دیتا تو اس کا یہ اثر نہ ہوتا جو اب ہوا ہے۔ تم میں سے کسی نے میری بات کا یقین نہیں کرنا تھا۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

پجاری نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مہاراج! آپ تو سلطان ہیں۔ پھر شو مہاراج کے اتنے پاتر داس کیسے بن گئے ہیں"

میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"خبردار ہونے پجاری! ایسی باتیں مت پوچھو۔ یہ راز ہے جس کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ فوراً میرے اشنان اور بھوجن پانی کا بندوبست کیا جائے۔"

وہ لوگ بڑے احترام کے ساتھ مجھے تہہ خانے سے نکال کر مندر کے ایک نہایت کمرے میں لے گئے جہاں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ مجھے بھوک لگی تھی۔ میں نے غسل کیا کھانا کھایا۔ اور بڑے مزے سے ٹانگیں پسار کر لیٹ گئے۔ مجھ کے سارے نیم دراز ہو گئے ایک ٹولی میرے ہاتھ اور دو آدمی میرے پاؤں دبا رہے تھے۔ یہ راز بعد میں کھلا کہ لوگ کے سانپ مجھ سے خوف زدہ ہو کر یا میرا ادب کرتے ہوئے ایک طرف ہٹ کر کیوں بیٹھ گئے تھے۔ یہ سارا کرشمہ اس رومال کا تھا جس میں میں نے ناگن پاروتی کی لاش کے دونوں ٹکڑے پہلے باندھے ہوئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ سانپ کے ٹکڑے ٹین کے ڈبے میں بند کرتے وقت یہ رومال میں نے پھینکا نہیں تھا۔ اس رومال میں ناگن پاروتی کے جسم کی بو رچی ہوئی تھی اس سانپوں کو مجھ سے ناگن پاروتی کی بو آ رہی تھی جس کی وجہ سے سانپوں نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا۔ ناگن پاروتی بہت بڑی طاقت بن چکی تھی اور سارے سانپ اس کا احترام کرتے تھے۔ اب میں آسانی سے عیار پیرن کا سراغ لگا سکتا تھا۔

پاگل مندر کا بڈھا پجاری میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ میری بہت زیادہ شکل سیدھا کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ عیار پیرن کا اسی سے کھوج لگوانا چاہیے۔ میں نے اپنی آواز میں جلال پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے مجھے رسیوں سے باندھ کر مجھے سانپوں کے گڑھے میں پھینکا۔ تم اندھے اور بہرے ہو۔ تم جھوٹے پجاری ہو۔ میری شکل صورت سے تم لوگ یہ اندازہ بھی نہ لگا سکے کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ بلکہ شو دیوتا کا خاص اوتار ہوں۔"

بڈھا پجاری ہاتھ باندھ کر دو زانو بیٹھ گیا۔ عاجزی سے بولا۔

"مہاراج شما کریں۔ ہم سے بھول ہو گئی۔"

میں نے کہا "تم سے تو اس مندر کے سانپ اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ جنہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور ادب سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ تم جھوٹے پجاری ہو۔ تمہیں تمہاری غلطی کی سزا ضرور ملے گی۔"

بڈھا پجاری گڑگڑانے لگا۔ میں نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں صرف ایک صورت میں معافی مل سکتی ہے۔"

"آگیا مہاراج۔" پجاری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

میں نے کہا "اس شہر گورکھ پور میں اس وقت ایک مکار پیرن موجود ہے۔ ہم پاروتی دیوی کا پجاری سانپ لے کر کیلاش پربت کو جا رہے تھے کہ اس مکار پیرن نے

Prepared By: S.Sohail Hussain

وہ ساتپ چرا لیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ لیکن ہم تمہیں بھی بتا دینا چاہتے ہیں۔ فوراً اس کا کھوج لگاؤ اور اسے پکڑ کر ہمارے سامنے پیش کرو۔"

جب میں نے موٹے پجاری کو سیتا کا حلیہ بتایا تو وہ پکار اٹھا۔

"مہاراج یہ ضرور دھوتی سیتا ہے۔ وہ بڑی مکار ہے مہاراج۔ مجھے معلوم ہے اس کا ڈیرہ کہاں ہے۔ میں ابھی اسے پکڑ کر لاتا ہوں۔"

مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ پاروتی ناگن مجھے مل جائے گی۔ موٹے پجاری کو میں نے اسی وقت سیتا کی تلاش کے لئے روانہ کر دیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ عیار سیتا کو پکڑے چلا آ رہا ہے۔ اس نے سیتا کو میرے بارے میں ضرور بتایا ہوگا کہ میں شو دیوتا کا ایک روپ ہوں اور ساتپ مجھے سجدے کرتے ہیں۔ کیونکہ سیتا مجھے پہچاننے کے باوجود آتے ہی میرے قدموں پر گر پڑی اور معافیاں مانگنے لگی۔ میں نے زوردار آواز میں کہا۔

"پاروتی دیوی کا پجاری ساتپ کہاں ہے؟"

اس نے قمیض کے اندر سے تھیلی نکال کر میرے قدموں میں رکھ دی اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"مہاراج ساتپ اس میں موجود ہے۔"

میں نے تھیلی کھول کر دیکھا۔ اس میں پاروتی ناگن کے ٹکڑے موجود تھے۔ اسی وقت تھیلی میں نے اپنے قبضے میں کر لی اور موٹے پجاری سے کہا۔

"اس چور سیتا کو لے جا کر تین دن کے لئے اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دو۔"

پجاری کے نوکر اسی وقت سیتا کو پکڑ کر لے گئے۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہاں میرا راز کھل جاتا یعنی پاروتی کا وہ رومال جس کی وجہ سے ساتپ میری پوجا کرتے تھے گم ہو جاتا مجھے وہاں سے نکل کر کیلاش پربت کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے تھا۔ چنانچہ میں نے موٹے پجاری سے کہا۔

"ہم صبح صبح کیلاش کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ ہمارے لئے سواری کا

بندوبست کیا جائے۔"

رات میں نے موٹے پجاری کے کمرے میں گزاری۔ صبح کو اٹھا تو باہر تین خچر موجود تھے۔ ایک خچر پر کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا اور دوسرے خچر پر ایک نوکر سوار تھا۔ اس نوکر کو میرے ساتھ محافظ کے طور پر سفر کرنا تھا۔ میں اپنے خچر پر بیٹھ گیا۔ سارے پجاری مجھے الوداع کہنے کے لئے باہر موجود تھے۔ میں بڑی شان سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

مندر سے نکلنے کے بعد میں نے اپنا رخ گورکھ پور کے ریلوے اسٹیشن کی طرف کر دیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر میں خچر سے اتر گیا اور نوکر سے کہا کہ وہ بدری گنج کے مندر کے باہر میرا انتظار کرے۔ اور اسے کہا "اگر میں پہلے پہنچ گیا تو میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔"

نوکر دونوں خچر لے کر چل پڑا۔ گورکھ پور سے بدری گنج تک ہم پہاڑی علاقہ تھا اور وہاں بہت شارٹ کٹ یعنی مختصر فاصلے والے راستے بھی تھے۔ بدری گنج سے آگے کیلاش پربت تک دشوار گزار پہاڑی سفر شروع ہوتا تھا۔ چنانچہ میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر بدری گنج جانا چاہتا تھا۔ میں ٹکٹ لے کر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی آئی تو میں اس میں سوار ہو گیا۔

بدری گنج پہنچ کر میں مندر میں آ گیا۔ نوکر ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ دوپہر کے وقت نوکر بھی آ گیا۔ وہاں سے ہمارا پہاڑی سفر شروع ہو گیا۔ یہ کافی مشکل سفر تھا۔ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ راستے میں بے شمار گھاٹیاں اور ندی نالے آتے۔ پتھروں کی وجہ سے ہمارا سفر آہستگی سے کٹتا چلا گیا۔ راستے میں ہی ہمیں رات آ گئی۔ بارش بھی شروع ہو گئی۔ ایک ٹیلے کے دامن میں ایک چھوٹا سا مندر نظر پڑا۔ ہم خچروں کو لے کر وہاں چلے گئے۔ وہاں پر کوئی پجاری نہ تھا۔ نہ کسی دیوی دیوتا کا بت ہی تھا۔ ایک خالی کوٹھڑی تھی جس کی شکل مندر کی طرح کی تھی۔ ساری رات موسلا دھار مینہ برستا رہا۔ صبح ہوئی تو ہم کیلاش پربت کی طرف چل پڑے۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ پہاڑوں کی بارش

Prepared By: S.Sohail Hussain

ایسی ہوتی ہے کہ کہیں پانی وغیرہ کھڑا نہیں ہوتا۔ صرف درخت، جھاڑیاں اور گھاس گیلی تھی۔ درختوں کے پتے سے گرتے تو شاخوں پر رکا ہوا پانی ٹپ ٹپ ہم پر گرتا رہا۔ دن سفر کرتے رہے۔

نوکر کو کیلاش پربت کے ناگ مندر کا راستہ معلوم تھا۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہمیں دور اوپر ایک جگہ پہاڑیوں میں مندر کے نقش دکھائی دیئے۔ نوکر نے مجھے وہ نقش دکھاتے ہوئے کہا۔

"مہاراج وہ ہے کیلاش پربت کا ناگ مندر۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پاروتی کا ناگن کے روپ میں لپٹا ہوا جسم تھیلی میں بند میرے پاس تھا۔ کیلاش پربت کے مندر کے احاطے میں آ کر ہم گھوڑوں سے اتر پڑے۔ وہاں کوئی آدمی دکھائی نہ دیا۔ نوکر کہنے لگا۔

"مہاراج سردیوں میں یہاں یاتری نہیں آتے صرف بڑا پجاری موجود ہوتا ہے۔ میں اس کو جا کر بلاتا ہوں۔"

میں نے اسے جانے دیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ پجاری کے آگے میری بڑھ چڑھ کر تعریف کرے گا۔ تھوڑی دیر میں ایک گول مٹول توند والا ناٹے قد کا پجاری نوکر کے ساتھ مندر کے برآمدے میں نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی میرے قدم چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"ہمارے دھن بھاگ مہاراج کہ آپ ہمارے مندر میں تشریف لائے۔"

میں نے بڑی شان سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے لئے ایک علیحدہ کمرے کا انتظام کر دو۔ ہم کچھ روز یہاں رہ کر شو دیوتا کی پوجا کریں گے۔"

"تشریف لایئے مہاراج۔"

مجھے اسی مندر میں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ جو شاید وہاں سب سے آرام دہ کمرہ تھا۔ کیلاش پربت کی ان پہاڑیوں میں کافی سردی تھی۔ مجھے پہننے کے لئے پجاری نے ایک

اونی فرغل بھی دیا۔ کمرے میں بڑا سا آتشدان تھا۔ اس میں آگ روشن کر دی گئی۔ نوکر کو میں نے وہیں سے واپس جانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ میرے پاؤں چھو کر واپس چل دیا۔ پجاری میرے لئے کھانا اور گرم قہوہ لے کر آ گیا۔ میں کھانا کھاتا رہا اور وہ میرے سامنے ادب سے ہاتھ باندھے بیٹھا رہا۔

میرا بستر لگا دیا گیا تھا۔ آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کی وجہ سے کمرے میں ہلکی سی گرمی تھی۔ میں کھانا کھانے کے بعد قہوہ پینے لگا۔ پجاری بولا۔

"مہاراج اگر آپ کا حکم ہو تو میں رات کو سونے سے پہلے دیوتاؤں کا درس پیش کروں۔"

میں سمجھ نہ سکا کہ دیوتاؤں کا درس کیا ہوتا ہے۔ میں سمجھا کوئی خاص قسم کا قہوہ ہوگا۔ میں نے کہا۔

"ہاں! تمہیں اجازت ہے اب تم جا سکتے ہو۔"

پجاری چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے بڑے تھیلے میں سے پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں والی تھیلی نکالی۔ اسے کھول کر سانپ کے ٹکڑوں کو غور سے دیکھا۔ ان کا رنگ سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے ان ٹکڑوں کو جتنی جلدی ہو سکے کسی ڈبے میں بند کر کے اس مندر کے تالاب میں ڈبو دینا اور پھر دس روز تک وہاں انتظار کرنا تھا۔ پجاری سے میں نے پوچھ لیا تھا۔ تالاب جسے کیلاش سرور بھی کہتے تھے مندر کے پیچھے تھا۔ رات ہو گئی تھی۔ مندر میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ ایک بڑا چراغ میرے کمرے میں بھی جل رہا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر اونی فرغل کو جسم کے گرد لپیٹے تالاب کے مشاہدے کے لئے چل پڑا۔

مندر کے پیچھے ایک لمبا چوڑا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے کے آگے سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا۔ جس میں کنول کے پھول بھی کھلے تھے۔ اور مچھلیاں بھی کناروں پر جلتے چراغوں کی روشنی میں تیرتی نظر آ رہی تھیں۔ سردی بڑی شدید تھی۔ اوپر ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں دن کے وقت مجھے صرف نظر آتی تھیں۔ میں اپنے

Prepared By: S.Sohail Hussain

کمرے میں آئیں میں نے یہی سوچا کہ رات کے پچھلے پہر جب مندر کے سارے کرمی
گہری نیند سو رہے ہوں گے تو پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں کو ڈبے میں بند کر کے تالاب
میں ڈال دوں گا۔ مجھے کسی ایسے ڈبے کی تلاش تھی جس میں تالاب میں ڈوبنے کے بعد
پانی داخل نہ ہو سکے۔ کمرے میں مجھے کچھ شیشے کی بوتلیں پڑی تو مل گئیں مگر ڈیزائن
ملا۔ میں نے سوچا کہ سانپ کے ٹکڑوں کو کسی بوتل میں بند کر کے تالاب میں ڈال دوں
مگر مشکل یہ تھی کہ بوتل ڈوب نہیں سکتی تھی۔ فوراً تالاب کی سطح پر آ جاتی۔
اس کا میں نے ایک حل تلاش کر لیا۔ میں نے سوچا کہ بوتل کے ساتھ ایک پتھر
باندھ دوں گا۔ پھر خیال آیا کہ پاروتی نے بوتل کا نہیں کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے
کسی ڈبے میں بند کر کے تالاب میں ڈالنا مگر وہاں ڈبہ کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔ میں
بستر پر کمبل اوپر کر کے بیٹھ گیا۔ آتشدان میں آگ مدھم پڑ گئی تھی۔ کمرہ خوب گرم ہو
گیا ہوا تھا۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہو تم؟" میں نے رعب سے پوچھا۔

کسی عورت کی آواز آئی۔ "مہاراج میں ہوں رکمنی۔"

میں نے سوچا مندر کی نوکرانی ہے۔ پجاری نے میرے لئے کوئی مصالحہ وغیرہ بھیجی
ہوگی۔ میں نے کہا۔ "اندر آ جاؤ۔"

دروازہ کھلا اور ایک نوجوان عورت ہاتھوں میں طشت لئے سر جھکائے ہوئے اندر
سے چلتی داخل ہوئی۔ میرے پلنگ کے پاس آ کر اس نے طشت پتھر کی تپائی پر رکھ
دیا اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

میں نے پوچھا۔ "یہ کیا لائی ہو؟"

وہ بولی۔ "مہاراج جی نے سوم رس بھیجا ہے۔"

سوم رس؟ میں سوچنے لگا۔ اف میرے خدایا! پجاری نے جو دیوتاؤں کا رس
بلوانے کے لئے کہا تھا وہ یہ سوم رس ہی تھا۔ سوم رس اس علاقے کی دیسی شراب
تھی۔ میں نے رکمنی سے کہا۔

"رکمنی! ہم جب یاترا پر آتے ہیں تو سوم رس کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ اسے
واپس لے جاؤ۔"

"جو حکم مہاراج۔"

وہ طشت اٹھا کر واپس دروازے کی طرف گئی تو میں نے کہا۔

"رکمنی ہمیں شودھ تا کی چتا کے بال رکھنے کے لئے ٹین کے بند ڈبے کی ضرورت
ہے۔ کہیں سے ہمیں ٹین کا ڈبہ لا دو۔"

رکمنی نے گردن جھکا کر کہا۔ "جو حکم مہاراج۔"

وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ٹین کا گول ڈبہ تھا۔
میں نے ڈبہ لے کر چراغ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ ٹفن چائے کا ڈبہ تھا۔ مجھے ایسے ہی
ڈبے کی ضرورت تھی۔ میں نے رکمنی سے کہا۔ "اب تم جا سکتی ہو رکمنی۔"

وہ ادب سے سر جھکا کر واپس چلی گئی۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی۔
پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ڈبے کو کھول کر دیکھا۔ اس کا ڈھکنا ایسا تھا کہ ایک بار بند ہونے
کے بعد مشکل سے کھلتا تھا۔ میں نے سانپ کے ٹکڑوں والی تھیلی کھول کر اس میں سے
پاروتی کے جسم کے ٹکڑے نکال کر بڑی احتیاط سے رکھ دیئے اور کہا۔

"پاروتی مجھے یقین نہیں آتا کہ تم دوبارہ زندہ ہو کر انسانی شکل میں واپس
آ سکو گی۔"

مجھے تو اس وقت تک یہ بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ناگن سے عورت اور
عورت سے پھر ناگن بن جاتی ہے۔ میں اس وقت بھی اور آج بھی اسے اپنی آنکھوں کا
فریب سمجھتا ہوں۔ بہرحال جب آدمی گھر سے لیڈر پنچر کرنے نکلتا ہے اور خاص کر
ہندوستان کے جنگلی جنگلوں میں سفر کرتا ہے تو اس کے ساتھ عجیب و غریب واقعات
پیش آتے ہیں۔ یہ وہ جنگل ہیں جہاں قدم قدم پر توہمات اور پراسرار اور ناقابل یقین
واقعات سے واسطہ پڑتا ہے۔

میں نے پاروتی کی سانپ لاش کے ٹکڑوں کو ڈبے میں اچھی طرح سے بند کر کے

Prepared By: S.Sohail Hussain

اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا۔ اس کے بعد سو گیا۔ صبح صبح میری آنکھ کھل گئی۔ یہ بات میں نے تجربہ کر کے دیکھی تھی کہ اگر آدمی کو صبح صبح اٹھنا ہو اور وہ اپنے آپ سے یہ کہہ کر سو جائے کہ میں صبح چار بجے اٹھ بیٹھوں گا تو ٹھیک چار بجے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ رات کو میں بھی اپنے دل سے یہی کہہ کر سویا تھا کہ میں منہ اندھیرے جاگ جاؤں گا۔

اس وقت ابھی رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ میرے کمرے کا چراغ بجھ چکا تھا۔ آتشدان کی آگ بھی اتنی مدھم پڑ گئی تھی کہ لکڑی کے انگاروں پر سفید راکھ کی تہہ چڑھ چکی تھی۔ میں نے پاروتی کے ٹکڑوں والا ٹین کا چوکور ڈبہ قریب کے بستر پر پھیلایا۔ سر پر چادر ڈالی اور آہستہ سے کنڈی کھول کر کمرے سے نکل گیا۔ باہر سخت سردی تھی۔ یہ ہمالیہ کے پہاڑوں کی سردی تھی۔ تیز ہوا نہیں چل رہی تھی مگر ہوا ایسے لگتا تھا جیسی سردی کی وجہ سے جم گئی ہے۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر کمرے بادل اترے ہوئے تھے۔ میں دبے پاؤں چلتا مندر کے عقبی برآمدے میں آ گیا۔ تالاب دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے تاریک رہی رات کو ہی سنبھال کر رکھ لی تھی۔ تالاب کے پاس جا کر میں نے ایک بڑے سے پتھر کو رسی کے ساتھ باندھ کر ٹین کے ڈبے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا اور کونے میں اسے تالاب کے پانی میں اتار دیا۔ پتھر نیچے گیا اور ٹین کے ڈبے کو بھی ساتھ ہی نیچے لے گیا۔ میرا مقصد اور میرا فرض پورا ہو گیا تھا۔ اب مجھے دس دن تک وہاں رہ کر پاروتی کے دوبارہ زندہ ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ جس کے بارے میں مجھے بالکل یقین نہیں تھا۔ لیکن مجھے ہر حالت میں وہاں رہ کر اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ مجھے پاروتی سے دلی محبت ہو گئی تھی اور میں دل سے یہی چاہتا تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے دوبارہ زندہ ہو جائے۔ میرا ایمان تھا کہ اگر خدا چاہے گا تو پاروتی دوبارہ زندہ ہو کر انسانی شکل میں واپس آ جائے گی۔

میں تالاب کے پاس بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ یہاں اس دن قسمت سے کٹ

جائیں۔ کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ میں نے یہاں ٹین کا ڈبہ تالاب میں ڈالا ہے۔ اگر کسی نے ڈبہ نکال لیا تو پاروتی نے مجھے بتا دیا تھا کہ پھر میں کبھی اس دنیا میں واپس نہ آ سکوں گی۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں یہیں کسی جگہ گیان دھیان کرنے کے بہانے بیٹھ کر ڈبے کی نگرانی کرنا شروع کر دوں۔ لیکن جب سردی کا خیال آیا تو یہ خیال دل سے نکال دیا۔ اس علاقے میں واقعی بے حد سردی تھی۔ میں اٹھ کر واپس اپنے کمرے کی طرف چلا۔ ابھی برآمدے میں ہی قدم رکھا تھا کہ ایک ستون کے پیچھے سے اچانک کوئی عورت نکل کر میرے سامنے آ گئی۔ یہاں کچھ دور ستون کے طاق میں جلتے چراغ کی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے عورت کو پہچان لیا۔ یہ وہی عورت رکمنی تھی جو رات کو میرے لئے دیوتاؤں کا رس لے کر آئی تھی اور جس نے مجھے ٹین کا ڈبہ بھی لا کر دیا تھا۔

میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ یونہی سیر کرتا ادھر آ گیا تھا کہا۔

"یہاں صبح کا سماں بڑا اچھا ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے یہاں گیان دھیان کروں۔"

رکمنی مسکرا رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"مہاراج! رشی منی لوگ یہیں بیٹھ کر گیان دھیان کیا کرتے تھے۔"

مجھے شک ہوا کہ کہیں اس نے مجھے تالاب میں ڈبہ ڈالتے دیکھ نہ لیا ہو۔ میں نے پوچھا۔

"تم یہاں اس وقت کیا کر رہی ہو؟"

رکمنی نے کہا۔

"مہاراج! میں تو روز منہ اندھیرے اٹھ کر ناگ مندر کے سات چکر لگاتی ہوں۔ پرانے شاستروں میں لکھا ہے کہ جو دیوداسی دو مہینے منہ اندھیرے اٹھ کر ناگ مندر کے سات پھیرے لگائے گی اس کو سورگ میں جگہ ملے گی۔"

میرا شک دور ہو گیا۔ رکمنی کو بالکل معلوم نہیں ہوا تھا کہ میں وہاں کیا کرنے آیا تھا۔ میں نے تالاب میں کوئی ڈبہ ڈالا ہے۔ میں نے کہا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"اچھا رکنی! سکھی رہو۔"

اور میں اسے آشیرباد دے کر اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ کمرے کی گرم فضا میں آتے ہی مجھے سکون نصیب ہوا۔ کمرے کی فضا باہر کی کڑاکے کی سردی کے مقابلے میں گرم اور پرسکون تھی۔ گورکھ پور کے مندر کے نوکر نے کیلاش پربت کے اس ناگ مندر کے پجاری کو میرا تعارف کراتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ میں دیوتا شو کا اوتار ہوں اور مجھے سانپ سجدہ کرتے ہیں۔ دوسرے دن پجاری میرے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ اس نے پوچھا۔

"مہاراج! کیا یہ سچ ہے کہ ناگ آپ کی پوجا کرتے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس لئے کہ میں شو دیوتا کا اوتار ہوں۔ سانپ مجھے دیکھتے ہی ادب سے سر جھکا دیتے ہیں۔ اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو تجربہ کر کے دیکھ لو۔"

پجاری بولا۔

"مہاراج! ویسے تو مجھے آپ کے اوتار ہونے کا پورا وشواس ہے۔ مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میں سانپوں کو آپ کی پوجا کرتے دیکھوں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ مکار پجاری یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میں کہیں فراڈیا تو نہیں ہوں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ رومال میرے پاس موجود تھا جس میں پاروتی کے جسم کی بو رچی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے سانپ میرے قریب نہیں پھٹکتے تھے بلکہ ادب سے دور کھڑے ہو جاتے تھے۔ میں نے پجاری سے کہا۔

"اس میں دیر کس بات کی ہے۔ ابھی تمہیں یہ چمتکار دکھائے دیتا ہوں۔ کہیں سے سانپ لے آؤ۔"

پجاری کے پاس اس وقت اس کی چہیتی دیوداسی رکمنی بھی کھڑی تھی۔ اس نے رکمنی کو اشارہ کیا۔ رکمنی اسی وقت گئی اور سانپوں کی پٹاری لے کر آ گئی۔ اس وقت یہ لوگ میرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ پجاری نے سانپوں کی پٹاری درمیان میں رکھ دی۔

پھر اس کا منہ کھول دیا۔

پٹاری کے اندر سے تین سیاہ کالے سانپ پھنکارتے ہوئے باہر نکل آئے۔ میں اپنی جگہ پر بڑے اطمینان سے بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی یہ سانپ مجھے دیکھ کر دو ایک طرف ہٹ جائیں گے اور پھر ادب سے پھن اٹھا کر اس طرح کھڑے ہو جائیں گے جیسے میری تعظیم بجا لا رہے ہوں۔ مگر میں یہ دیکھ کر کچھ بے چین سا ہو گیا کہ سانپ میری طرف دیکھ کر ابھی تک پھنکار رہے تھے۔ ان میں سے ایک سانپ میرے قریب بھی آ گیا اور اس نے مجھے ڈسنے کی بھی کوشش کی۔ میں نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور یہ دیکھ کر میرا جسم خوف کے مارے سرد ہو گیا کہ میری جیب میں پاروتی کا رومال نہیں تھا۔ اچانک مجھے یاد آ گیا کہ پاروتی کا رومال میری دوسری پتلون میں ہے جو غسل خانے میں لٹکی ہوئی ہے۔ میں ایک دم اٹھا اور یہ کہہ کر غسل خانے میں گھس گیا کہ

"ابھی آتا ہوں۔"

جلدی سے اپنی دوسری پتلون سے رومال نکال کر اپنی پتلون میں ڈالا اور باہر آ کر اسی طرح بیٹھ گیا۔ جیسے ہی میں بیٹھا تینوں سانپ ڈر کر ایک طرف ہو گئے۔ پھر وہ ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے پھن کھول لئے اور جیسے بار بار پھن جھکا جھکا کر میری تعظیم بجا لانے لگے۔

پجاری بڑا عیار آدمی تھا اس کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے سانپ میرے قریب نہیں آتے۔ پہلے وہ چیز میرے پاس نہیں تھی۔ میں غسل خانے سے وہ چیز لایا ہوں۔ مگر اوپر اوپر سے اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ مجھ سے بڑا متاثر ہوا ہے۔ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! آپ سچ مچ اوتار ہیں۔"

جب وہ اور رکمنی چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور دل میں فیصلہ کیا کہ اب پاروتی کا رومال ہمیشہ اپنی جیب میں رکھا کروں گا۔ مگر آگے جو کچھ میرے ساتھ ہونے والا تھا اس کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

مجھے دس دنوں کا حساب رکھنا تھا۔

وہاں کوئی کیلنڈر وغیرہ تو تھا نہیں کہ اس کو دیکھ کر معلوم کرتا کہ آج کونسا دن ہے اور کل کونسا دن ہو گا۔ میں نے دیوار پر ایک جگہ کوئلے سے نشان لگانے شروع کر دیئے۔ ایک دن گزر جاتا تو ایک نشان لگا لیتا۔ میں اس ناگ مندر میں صرف پاروتی کی خاطر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے سوا مجھے وہاں مندر کے پجاری اس کی دیوداسیوں اور سنیاسیوں کی پوجا پاٹھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دن بھر میں ویرانوں گھاٹیوں میں ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا رہتا۔ رات کو تھوڑی دیر کے لئے مندر میں آ کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا۔ پجاری کو میں یہ ظاہر کرتا کہ میں گیان دھیان میں مصروف ہوں۔ حقیقت میں میں سوچتا رہتا تھا کہ پاروتی اگر واقعی دیوداسی شکل میں واپس آ گئی تو میں اسے ساتھ لے کر کلکتے اس کے کسی رشتے دار کے ہاں چھوڑ کر اپنے نئے آزاد وطن پاکستان چلا جاؤں گا اور پھر کبھی ان علاقوں میں آنے کا نام نہیں لوں گا۔ میں نے ان علاقوں میں بڑی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائی تھیں۔

پجاری برابر میری خدمت کر رہا تھا۔ صبح شام مجھے اعلیٰ قسم کا کھانا میرے کمرے میں پہنچ جاتا تھا۔ کبھی نوکر لے کر آ جاتا۔ کبھی دیوداسی رکمنی کھانا لے کر آ جاتی۔ رکمنی کی عمر تیس برس کے قریب تھی۔ اس کی شکل سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ عام طور پر خاموش رہتی۔ میں بات کرتا تو وہ بھی کوئی بات کر لیتی۔ مگر اس کی آنکھوں کو دیکھنے

سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہرے راز کو دل میں چھپائے ہوئے ہے۔ ایک ایسا راز جس کو وہ مجھ سے چھپانا بھی چاہتی ہے اور مجھے بتانا بھی چاہتی ہے۔ اپنی آوارہ گردیوں کے دوران مجھے قسم قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا اور میں لوگوں کے چہروں کو تھوڑا تھوڑا پڑھ لیتا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ رکمنی کس راز کو چھپائے ہوئے ہے۔

ایک روز شام کو وہ میرے لئے کھانا لے کر آئی تو میں اس سے کیلاش پربت کی پہاڑیوں اور موسموں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"رکمنی! تم اتنی مدت سے یہاں رہ رہی ہو۔ کبھی تم نے کسی ایسے سادھو، جوگی یا سنیاسی کو دیکھا ہے جو سانپ کا روپ دھار لیتا ہو؟"

رکمنی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ بولنے لگی۔

"مہاراج! میں نے ایسا کوئی سپیرا سنیاسی یا سادھو نہیں دیکھا۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا آپ نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے رشیوں سے سنا ہے کہ اگر کوئی سانپ پانچ سو سال تک زندہ رہے تو اس میں ایسی شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جب چاہے انسان کی شکل بدل سکتا ہے۔"

رکمنی میری بات بڑے توجہ سے سن رہی تھی۔ اس نے دو ایک بار دروازے کی طرف اس انداز سے دیکھا کہ جیسے اسے شک ہو کر کوئی ان کی باتیں سن رہا ہے۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں نے بھی سنا ہی ہے مگر ابھی تک اتنی شکتی والا سانپ نہیں دیکھا۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں اس عورت کے بارے میں کچھ دیر غور کرتا رہا۔ یہ دیوداسی مجھے پراسرار لگ رہی تھی۔ دن گزرتے چلے گئے میرے حساب سے جب نو دن گزر گئے اور دس تاریخ کی رات آئی تو میں ساری رات جاگتا رہا کیونکہ پاروتی کے جسم والے ٹین کے ڈبے کو تالاب میں پڑے دس دن ہو گئے

Prepared By: S.Sohail Hussain

تھے اور اب مجھے اسے رات کے پچھلے پہر تالاب میں سے نکالنا تھا۔ یہ بات واضح نہیں تھی کہ آیا پاروتی خود بہ خود اپنے میں سے اصلی شکل اختیار کر کے باہر آ جائے گی یا میں اس کے جسم کے ٹکڑوں کو جوڑوں گا اور اس کے بعد وہ اصلی شکل اختیار کر کے اٹھ کھڑی ہو گی۔ ابھی تھا مجھے رات کے پچھلے پہر سب سے پہلے پاروتی کے ڈبے کو تالاب سے باہر نکالنا تھا۔ میں نے ڈبے کو رسی سے باندھ کر تالاب کے کونے میں ڈال رکھا تھا اور رسی کو جھاڑیوں میں چھپا کر اوپر پتے اور گھاس ڈال دی تھی۔

مندر میں رات کے پچھلے پہر گھنٹیاں بجتی تھیں۔ میں ان کے بجنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں تو میں لوئی لبادہ پہن کر کمرے سے خاموشی سے نکل کر تالاب پر آ گیا۔ میں نے گھاس پتے ہٹا کر رسی کو اندھیرے میں پکڑنے کی کوشش کی مگر رسی میرے ہاتھ نہ آئی۔ میں نے اسے ادھر ادھر ٹٹولا۔ رسی وہاں نہیں تھی۔ میں نے تالاب کے کنارے کو جھک کر دیکھا۔ اوپر سے کوئی رسی تالاب میں نہیں جا رہی تھی۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔

کیا کوئی پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں والا ڈبہ نکال کر لے گیا تھا؟ ایسا ہی ہوا تھا۔ رسی اپنے آپ تالاب میں نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے اسے جھاڑی کے ساتھ باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا کسی نے مجھے تالاب میں ڈبہ ڈالتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ آدمی ڈبہ نکال کر لے جا چکا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک رات پہلے دیکھا تھا۔ رسی موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ واردات دس تاریخ کی رات کو ہی ہوئی ہے۔ جس آدمی نے بھی ڈبہ چرایا تھا وہ ان دنوں کے پورے ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا مطلب بھی واضح طور پر نکلتا تھا کہ جس شخص نے ڈبہ نکالا ہے وہ جانتا تھا کہ اس میں کسی ایسے سانپ کے جسم کے ٹکڑے بند ہیں جس نے دس دن گزرنے کے بعد اصلی شکل اختیار کرنی ہے۔

میں قدرتی طور پر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کام کسی بھیدی کا ہے اور وہاں اس راز کو

جاننے والا سوائے ناگ مندر کے بڑے پجاری کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے پجاری پر ہی شک پڑا۔ میں چپکے سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں سخت پریشان تھا۔ دن چڑھا اور رکمنی میرے لئے دودھ لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"اس مندر میں پجاری کے علاوہ اور کون کون رہتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"میرا مطلب ہے ان دنوں میں باہر سے کوئی جوگی یا سپیرا تو نہیں آیا؟"

رکمنی نے کہا۔

"کوئی نہیں آیا مہاراج! اس موسم میں بڑی سردی ہوتی ہے باہر سے سادھو جوگی لوگ نہیں آتے۔"

رکمنی چلی گئی۔ اس کے چہرے کی پراسراریت بہت زیادہ نمایاں تھی۔ میں سخت بے چین تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ کام سوائے مندر کے بڑے پجاری کے اور کسی کا نہیں ہے۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ پجاری پر میرے چمتکاروں یعنی کرامات کا گہرا اثر ہے۔ اگر میں نے اسے تھوڑا سا بھی ڈرایا دھمکایا تو وہ مان جائے گا کہ تالاب میں سے ڈبہ اسی نے نکالا تھا۔

میں نے دودھ کا پیالہ جلدی جلدی پیا اور پجاری کے کمرے کی طرف تیز تیز چل پڑا۔ پجاری اپنے کمرے میں آتشدان کے پاس ہرن کی کھال پر بیٹھا وید سامنے رکھے پڑھ رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"مہاراج! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کہا۔

"پجاری جی! میری ایک بڑی قیمتی شے چوری ہو گئی ہے۔ مجھے شک ہے کہ اسے مندر کے کسی آدمی نے چرایا ہے۔"

پجاری نے وید کی کتاب بند کر دی اور میری طرف پوری طرح متوجہ ہو کر بولا۔

"مہاراج! یہاں کبھی کسی کی کوئی شے غائب نہیں ہوئی۔ آپ کی کونسی چیز چوری

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہوئی ہے؟"

میں نے ایک منٹ کے لئے سوچا۔ پھر اسے کہا۔

"میں نے مقدس گنگا کے پانی والا ڈبہ تپسیا کے لئے مندر کے تالاب میں ڈال رکھا تھا۔ آج صبح میں نے جا کر دیکھا تو ڈبہ وہاں نہیں تھا۔ میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ جس کسی نے میرا ڈبہ چرایا ہے اسے ڈبے سمیت میرے سامنے پیش کیا جائے۔"

پجاری بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔

"مہاراج! میں ابھی سارے مندر کی آپ کے سامنے چھان پھٹک کرتا ہوں۔ یہاں ہمارے علاوہ دو تین دیوداسیاں ہی ہیں۔ ابھی ان سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں اگر آپ کی چیز یہاں ہوئی تو وہ آپ کو ضرور مل جائے گی۔"

پجاری کی ان باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ڈبہ اس نے چوری نہیں کیا۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں یا تو باہر سے کوئی چور آیا ہے یا پھر کسی دیوداسی نے تالاب میں سے ڈبہ نکال کر چھپا لیا ہے؟"

پجاری نے اسی وقت ساری دیوداسیوں کو بلا لیا۔ یہ کل چار دیوداسیاں تھیں۔ ان میں رکمنی بھی شامل تھی۔ پجاری نے بڑی سختی سے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا کہ اگر میں ان میں سے کسی نے پوتر گنگا جل کا ڈبہ تالاب میں سے نکالا ہے تو بتا دے۔ نہیں تو ان سب کو بھگ دیوتا کا شراپ بھگتنا پڑے گا۔

ساری دیوداسیاں رونے لگیں۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر کہا کہ ہم نے گنگا جل کا ڈبہ دیکھا تک نہیں۔ ہم بے قصور ہیں۔ ہمیں معاف کیا جائے۔ میں نے بھی یہی اندازہ لگایا کہ ان میں سے کسی نے ڈبہ نہیں چرایا۔ تو پھر آخر وہ کہاں چلا گیا۔ ظاہر ہے کسی بھیدی نے اسے تالاب میں سے نکالا ہے۔ میں نے اپنے طور پر سراغ رسانی کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ دوپہر تک کمرے میں پیچ و تاب کھاتا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مجھے بار بار پجاری کا ہی خیال آتا۔ اسی پر

شک پڑتا کہ یہ کام اس کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کی کڑی نگرانی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دن کے وقت تو پجاری سب کے سامنے رہتا تھا۔ صرف رات کو وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا اور رکمنی کے کہنے کے مطابق وہ ساری رات گیان دھیان میں مشغول رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ رات کے وقت کسی طریقے سے چھپ کر اس کی نگرانی کرنی چاہئے۔ مگر میں اس کے بند کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے کمرے کی صرف ایک ہی کھڑکی تھی جو مندر کے عقبی صحن کی طرف کھلتی تھی۔ یہ کھڑکی دن کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی بند رہتی تھی۔ ہو سکتا ہے کھڑکی میں کوئی سوراخ یا درز ہو۔ میں اس میں سے پجاری کو دیکھ سکتا تھا۔

دن میں نے اپنے کمرے میں ہی گزار دیا۔ جب رات ہو گئی اور چاروں طرف اندھیرا اور خاموشی چھا گئی تو میں دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکل کر پجاری کے کمرے کی عقبی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں آنکھ لگا کر ادھر ادھر کوئی سوراخ یا درز تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ چھوٹی سی درز تھی۔ میں نے اس کے ساتھ آنکھ لگا دی۔ مجھے پجاری کمرے کے وسط میں ہرن کی کھال پر آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کئے بیٹھا نظر آیا۔ وہ واقعی گیان دھیان میں مصروف تھا۔ میں دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر پجاری کا تھوڑی تھوڑی دیر بعد مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ مجھے سردی لگنے لگی۔ سردی وہاں بہت زیادہ تھی اور پہاڑوں کی طرف سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔

میں مایوس ہو کر کمرے میں آ گیا۔ سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ پاروتی کے جسم کے ٹکڑوں کے ڈبے کا غائب ہو جانا میری لئے بہت بڑا حادثہ تھا۔ پاروتی کے بغیر کیلاش پربت سے واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے ہر حالت میں پاروتی کے ڈبے کا کھوج لگانا تھا۔ میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ دیوداسی رکمنی سے پوچھنا چاہئے۔ وہ پراسرار دیوداسی ہے۔ ہو سکتا ہے اسے کچھ معلوم ہو۔ صبح کے وقت جب

Prepared By: S.Sohail Hussain

رکمنی میرے لئے دودھ لے کر آئی تو میں نے سب سے پہلے تو رکمنی کی تعریف کی شروع کر دی کہ وہ سب دیوداسیوں سے بڑھ کر خوبصورت اور عقل مند دیوداسی ہے رکمنی اپنی تعریف سن کر خوش بھی ہوئی اور کچھ شرما بھی گئی۔ اس لئے کہ ایک قدرتی بات تھی۔ جب میں نے اس سے کہا کہ گنگا جل والا پوتر ڈبہ میری زندگی کی سب سے قیمتی چیز ہے اور میں اس کے بغیر واپس نہیں جا سکتا تو وہ خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے کہا

"رکمنی! تم مجھے مندر کی ساری دیوداسیوں سے بڑھ کر اچھی لگتی ہو۔ میری بات کا وشواش کرو کہ اگر مجھے میرا ڈبہ نہ ملا تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

رکمنی نے بند دروازے کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ جیسے اسے شک ہو کہ باہر کوئی ہماری باتیں سن رہا ہے۔ میں نے کہا

"بے فکر رہو۔ ہماری باتیں کوئی نہیں سن رہا۔ اگر تمہیں کسی راز کا پتہ ہے تو بے دھڑک مجھے بتا دو۔ میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ بلکہ تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔"

دیوداسی رکمنی مسلسل مجھے سنجیدہ نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

جب میں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے آہستہ سے ایک ایسا سوال کر دیا جس نے مجھے سر سے پاؤں تک چونکا دیا۔ اس نے میرے چہرے پر نظریں جمائے پوچھا

"مہاراج! اس ڈبے میں اگر گنگا جل ہوتا تو اسے چور اٹھا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔"

میں اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ بولی۔

"آپ خود ہی بتا دیں کہ ڈبے میں اگر گنگا جل نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟"

میں نے رکمنی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"رکمنی! اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ ڈبہ کس نے چرایا ہے تو میں تمہیں بتا دوں گا کہ ڈبے میں کیا تھا؟"

رکمنی نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا

"مہاراج! معلوم نہیں کیوں آپ مجھے اچھے لگ رہے ہیں۔ آپ جس روز یہاں آئے تھے اسی وقت سے مجھے اچھے لگ رہے ہیں۔"

میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس دیوداسی کو سارا راز معلوم ہے۔ میں اس کی تعریف کر کے اس سے یہ راز اگلوانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا

"رکمنی! وشواش کرو۔ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو تم بھی بڑی اچھی لگی تھیں۔ تم بہت خوبصورت ہو۔"

میں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ رکمنی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ میں نے جب دیکھا کہ لوہا گرم ہے تو اس پر ضرب لگاتے ہوئے کہا

"رکمنی! اگر تم مجھے بتا دو کہ میرا ڈبہ کس کے پاس ہے تو میں بھگوان شو جی کے آگے تمہاری بڑی پرارتھنا کروں گا۔"

دیوداسی رکمنی کہنے لگی۔

"مہاراج! اس ڈبے میں آکاش کی کوئی اپسرا سانپ کے روپ میں بند تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

میں نے کہا "ہاں رکمنی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ وہ ڈبہ کس کے پاس ہے؟"

دیوداسی رکمنی نے مجھے ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان بیان کی۔ اس نے کہا

"مہاراج! بڑے پجاری کا ایک گرو دیو ہے۔ جس کو سب راج گرو کہتے ہیں۔ آج رات وہ اچانک کیلاش پربت والے اپنے مندر سے اتر کر پجاری کے پاس آ گئے۔ میں ایک طرف کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ راج گرو نے کہا کہ یہاں ایک شخص آیا ہے جس کے پاس ایک ایسی ناگن ہے جو انسانی شکل بدل لیتی ہے۔ اس ناگن کو سانپ کے روپ میں کسی نے مار ڈالا تھا۔ یہ شخص اس کی لاش کے ٹکڑے ڈبے میں بند کر

Prepared By: S.Sohail Hussain

کے لایا ہے اور اس نے ڈبے کو مندر کے تالاب میں دس دن کے لئے ڈال دیا ہے۔ اگر وہ ڈبہ ہمارے ہاتھ لگ جائے تو ہماری قسمت بدل سکتی ہے راج گرو نے پجاری سے کہا کہ دس دن کے بعد یہ ناگن انسانی روپ میں ظاہر ہو جائے گی۔ میں اسے اپنے خاص منتر سے اپنے قبضے میں کر لوں گا۔ یہ ناگن زبردست طاقت کی مالک ہے۔ ہم اس کی مدد سے بھارت ورش کے سارے ناگ مندروں کو اپنے قبضے میں کر کے سب سے مہا پجاری بن سکتے ہیں۔ یہ سن کر ہمارے پجاری کو بھی لالچ آ گیا۔ اس نے کہا راج گرو! ہم ابھی جا کر تالاب سے ناگن کا ڈبہ نکال لاتے ہیں۔ وہ اسی وقت تالاب پر گئے اور ڈبہ نکال کر لے آئے راج گرو نے ڈبے کو سونگھ کر کہا اس میں سے ناگن کی بو آ رہی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ اوپر پہاڑوں پر اپنے مندر میں لے جا رہا ہوں۔ وہاں جا کر میں اس پر منتر پڑھ کر پھونکوں گا۔ پھر یہ ہمارے قبضے میں ہو گی۔ اسے سورج نکلنے کے بعد کھولوں گا۔"

دیوداسی رکمنی یہ داستان سنا رہی تھی اور میں حیرانی سے سن رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"راج گرو ناگن کا ڈبہ لے کر اوپر اپنے پہاڑی مندر میں چلا گیا ہے۔"

میں پریشان ہو کر کمرے میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ میں نے رکمنی کا بازو پکڑ کر کہا۔

"رکمنی! کیا تم مجھے اس مندر کا پتہ بتا سکتی ہو جہاں راج گرو ناگن کا ڈبہ لے کر گیا ہے؟"

رکمنی نے کہا۔

"مہاراج! میں نے وہ مندر دیکھا نہیں ہے۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہاں سے دو پہاڑیاں چھوڑ کر اوپر ایک راستہ جاتا ہے۔ آدمی اس راستے پر ایک دن ایک رات سفر کرے تو ایک جھیل آ جاتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راج گرو کا مندر اسی جھیل کے آس پاس کسی جگہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں ابھی اس چور راج گرو کی تلاش میں جاتا ہوں۔"

رکمنی بولی۔ "مہاراج! راج گرو سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے چل دیا تھا اور وہ

گھوڑے پر سوار تھا۔ آپ اس کو راستے میں نہیں پکڑ سکیں گے۔ راج گرو ضرور کسی خفیہ راستے سے جا رہا ہو گا۔ مجھے معلوم ہے ان لوگوں نے اس قسم کے گاؤں کے راستے پہاڑوں میں خفیہ نکالے اور خفیہ راستے بنا رکھے ہیں۔"

میں نے رکمنی کا شکریہ ادا کیا اور اسے تاکید کی کہ وہ یہ بات کسی کو نہ بتائے کہ میں کہاں گیا ہوں۔"

"میں بہت جلد اپنی بیٹی لے کر تمہارے پاس واپس آ جاؤں گا۔"

پجاری سے اس بارے میں کوئی بات کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ڈبہ اس کے ہاتھ سے نکل کر راج گرو کے قبضے میں جا چکا تھا۔ یہ راج گرو یقیناً کوئی بڑا جادوگر قسم کا آدمی تھا جس کو اوپر پہاڑوں میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کیلاش پربت کے مندر میں کوئی شخص بڑی طاقتی والی ناگن کی لاش لے کر آیا ہوا ہے۔

رکمنی کہنے لگی۔

"مہاراج! اوپر پہاڑوں میں برف بھی رہتی ہے وہاں بڑی سردی ہوتی ہے۔ میں آپ کو گرم کپڑے لا دیتی ہوں۔"

رکمنی چلی گئی۔ میں نے پاروتی کے جسم کی بو والا رومال سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیا۔ رکمنی میرے لئے سر اور گردن کو احاطہ دینے والی اونی ٹوپی اور روئی کی بنڈی لائی تھی۔ میں نے اسے پہن لیا۔ میرے پاؤں میں چمڑے کے جوتے تھے۔ اندر میں نے گھٹنوں تک گرم جرابیں بھی پہن رکھی تھیں جو میں نے بیج میں خریدی تھیں۔ میں نے رکمنی سے کہا۔

"اب میں جاتا ہوں۔ پجاری پوچھے تو کہہ دینا کہ میں کسی کام سے نیچے بیج گیا ہوں اسے ہرگز پتہ نہ چلے کہ میں راج گرو کے تعاقب میں اوپر پہاڑوں پر گیا ہوں۔"

رکمنی نے کہا۔ "میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ آپ جلدی واپس آ جانا۔"

اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی تھی۔ مجھے اس وقت اس کی آنکھوں کی اداسی پر غور کرنے کی واقعی فرصت نہیں تھی۔ رکمنی کہنے لگی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"نیچے اصطبل میں خچر بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خچر لے جائیں۔ پیدل آپ نہیں جا سکیں گے۔"

میں نے رکنی کا شکریہ ادا کیا اور خچروں کے اصطبل کی طرف چل دیا۔

ایک خچر کو کھول کر میں اس کے اوپر بیٹھ گیا اور دیوداسی رکنی نے مجھے جو راستہ بتایا تھا خچر کو اس راستے پر ڈال دیا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہوا بند تھی۔ مگر سردی بہت تھی۔ شروع شروع میں راستہ دشوار گزار نہیں تھا۔ زمین غیر ہموار تھی مگر دونوں جانب ہموار کے کھیت تھے اور پگ ڈنڈی بھی کشادہ تھی۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا پگ ڈنڈی سکڑتی گئی۔ کھیتوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اب کہیں کہیں کسی ڈھلان پر کوئی کھیت نظر آ جاتا تھا۔ پہلے دونوں جانب پہاڑیاں دور دور تھیں۔ اب وہ قریب آ رہی تھیں۔ میں ایک پہاڑی دریا میں سے گزرا جس کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ ہر طرف پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ پانی صرف درمیان میں ایک ندی کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ میں نے اتر کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈا یخ تھا۔ دوپہر کے وقت میں ایسے علاقے میں سے گزر رہا تھا جہاں کھائیاں، برساتی نالے اور بڑی بڑی چٹانیں جگہ جگہ کھڑی تھیں۔ یہاں پہاڑیاں خشک بنجر اور تسواری رنگ کی تھیں۔ چٹانوں کے پتھر دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ہرے بھرے جنگل پیچھے رہ گئے تھے۔ کافی بلندی پر پہاڑیوں کی ڈھلانیں اوپر برف پوش چوٹیوں تک چلی گئی تھیں۔ یہ کوہ ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں تھیں۔

ابھی تک راستے میں کہیں کہیں کوئی پہاڑی گاؤں آ جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر کی سلوں کی ڈھلواں چھتوں والے جھونپڑا نما مکان تھے۔ بیچ میں ایک تنگ سا بازار

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہوٹل دو چار دکانیں ہوتیں۔ ایک گاؤں آیا تو میں نے خچر کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ ایک دکان کے باہر بیٹھ کر روٹی کھائی۔ چائے پی۔ اس دوران خچر بھی گھاس وغیرہ چر کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ گاؤں والوں سے آگے مندر کا راستہ پوچھا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔

یہ ایک دن اور ایک رات کا سفر تھا۔ رکشی نے مجھے راج گرو کے مندر کی یہ شکل چلتے وقت بتائی تھی کہ جب مندر قریب آتا ہے تو برف پوش پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ابھی یہ پہاڑیاں دور اوپر مجھ سے کافی فاصلے پر تھیں۔ میں اونی ٹوپی اور اونی فرغل کی وجہ سے کافی گرم ہو کر خچر پر بیٹھا تھا۔ خچر آرام آرام سے پہاڑی راستوں پر چل رہا تھا۔ یہ ساری کی ساری چڑھائی تھی۔ مگر اتنی اونچی اور مشکل چڑھائی نہیں تھی۔

شام کے وقت ایک خچر نیلے کی ڈھلان اتر کر ایک چھوٹی سی وادی آ گئی۔ یہاں تین چار سرسبز کھیتوں میں سرو کی طرح کے اونچے چھریرے درخت کھڑے تھے۔ ایک پتھر کا چھوٹا سا مکان بھی نظر آ رہا تھا۔ راستے میں خچر کو پلانے کے واسطے پانی کہیں نہیں ملا تھا۔ ان کھیتوں میں ایک جگہ چھوٹی سی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ میں یہاں خچر سے اتر پڑا۔ خچر پانی پینے لگ گیا۔ میں نے بھی تھوڑا سا پانی پیا۔ پانی بہت سرد تھا۔ اتنے میں پتھر کے مکان میں سے ایک دیہاتی نکل کر میری طرف آیا۔ اس نے پہاڑی لہجے اور پہاڑی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ میں اوپر کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے راج گرو کے مندر کا بتایا تو وہ بولا۔

"وہ تو بہت دور ان برفانی پہاڑیوں کے اندر ہے۔ تم وہاں کیوں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یاترا کرنے جا رہا ہوں۔"

دل میں کہا۔ راج گرو کی گردن توڑنے جا رہا ہوں۔ مجھے تمہارے مندروں کی یاترا سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ دیہاتی میرے لئے جوار کی روٹی اور دودھ لے آیا۔ دودھ کا رنگ سرخی مائل تھا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کس کا دودھ ہے۔ یہاں مجھے کوئی گائے تو نظر نہیں آ رہی۔"

وہ بولا۔ "یہ گھوڑی کا دودھ ہے۔"

میں نے دودھ کا پیالہ اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ دوست! میں روٹی کے ساتھ دودھ نہیں پیا کرتا۔"

وہ دودھ واپس لے گیا اور میرے لئے گڑ لے آیا۔ میں نے گڑ کے ساتھ بڑے مزے سے جوار کی روٹی کھائی۔ ٹھنڈا پانی پیا۔ دل میں خیال آیا کہ یہیں رات بسر کر لی جائے۔ پھر سوچا کہ ابھی کافی دن باقی ہے۔ جتنا سفر طے ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں نے دیہاتی کا شکریہ ادا کیا اور خچر پر سوار ہو کر آگے روانہ ہوا۔

اب کوئی باقاعدہ پگ ڈنڈی یا راستہ نہیں بنا ہوا تھا۔ بس سامنے والی برفانی پہاڑیوں کو نظر میں رکھ کر سفر کر رہا تھا۔ ایک پہاڑی کا موڑ گھوم کر اپنے راستے سے ہٹ جاتا تو اوپر والی برف پوش پہاڑیوں کو دیکھ کر پھر راستہ درست کر لیتا۔

جب سورج مشرقی برفانی پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے چلا گیا تو وادی میں اور پہاڑیوں کے نشیب میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ اس وقت مشرق کی جانب آسمان پر سیاہ کالے بادل نمودار ہوئے۔ یہ بادل میدانوں کے بادلوں سے بالکل مختلف تھے۔ میدانوں کے بادل تو اوپر اوپر سائبان کی طرح پھیلے ہوتے ہیں لیکن یہاں ہمالیہ کی بلندیوں پر بادل بالکل سامنے سے چلے آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں میں اور خچر بادلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں کسی اندھیری سرنگ میں داخل ہو گیا ہوں۔ بادل اس قدر ٹھنڈے اور گیلے گیلے تھے کہ میرے کندھے سردی کی وجہ سے کپکپانے لگے۔ ایک تو ویسے ہی سورج غروب ہو چکا تھا اوپر سے بادلوں نے مجھے گھیر لیا تو اور بھی اندھیرا چھا گیا۔ خچر وہ ایک بار پریشان ہو کر اچھلا اور رک گیا۔ میں جلدی سے اتر پڑا اور خچر کی باگ پکڑ کر وہیں پتھر پر بیٹھ گیا۔ بادل سیاہ دھند کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ سردی سے میرے دانت بج اٹھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے بادل میرے جسم کے اندر سے ہو کر گزر رہے ہیں۔ جب بادل نہ چھٹے اور میرے ارد گرد اسی طرح سیاہ دھند چھائی رہی تو میں نے خچر کی باگ پکڑ لی اور اسے کھینچتے ہوئے جس پہاڑی راستے پر چل رہا تھا اسی پر آگے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ تک راستہ ہموار رہا۔ پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

کچھ دور تک چڑھائی چڑھنے کے بعد میں بادلوں سے باہر نکل آیا۔ میں نے شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں نیچے دیکھا۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر سیاہ کالے بادل وادیوں پر ایسے پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی نے وادیوں کو بادلوں سے بھر دیا ہو۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور پھر پیٹھ کر پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اوپر بھی بادلوں کے حصے آگئے۔ آسمان پر جو غروب ہونے کے بعد سورج کی لالی سیاہ رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی وہ ان بادلوں میں غائب ہو گئی۔ یہ بادل بہت گھنے تھے۔ ان میں رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی اور ہلکی ہلکی گرج سنائی دینے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ کوئی ایسی جگہ جلدی سے تلاش کرنی چاہئے جہاں بارش کا یہ جو طوفان آ رہا ہے اس سے بچ سکوں۔

اپنی بائیں جانب تھوڑا اوپر آڑھی ترچھی کھڑی چٹانوں کے درمیان مجھے ایک دھندلا دھندلا سا نظر آیا۔ میں نے فیصلہ کر کے اسی طرف ڈال دیا۔ ابھی میں چٹانوں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ بجلی چمکی اور بادل بڑے زور سے گرجے۔ پھر موٹی موٹی بارش کی بوندیں گرنے لگیں۔ میں فیصلہ کر کے اترا اور اسے کھینچتے ہوئے چٹانوں کے درمیان سے ہو کر دھندلکے تک آ گیا۔ یہ دھندلکا اصل میں ایک قدرتی غار تھا۔ قدرت نے مجھے ایک بڑی اچھی پناہ گاہ عطا کر دی تھی۔ غار کافی کھلا اور کشادہ تھا۔ زمین پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اصل میں یہ ایک دریا تھا جو پہاڑوں کے اندر سے بہتا ہوا یہاں نکل آیا تھا مگر سردیوں کے موسم کی وجہ سے خشک ہو رہا تھا۔ میں نے زمین کو چھو کر دیکھا۔ زمین دریا کے پاٹ کی طرح گیلی تھی۔ پھر بھی میرے ساتھ غار میں آ گیا۔

اتنی دیر میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ سرد ہوا بھی چلنے لگی۔ مگر غار میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔ میں ہاتھ بغلوں میں دے کر غار کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ غار کے دہانے پر اوپر پتھر باہر کو نکلے ہوئے تھے جن کی وجہ سے بارش کی بوچھاڑیں اندر نہیں آتی تھیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب رات بھی اسی غار میں بسر کروں گا۔ میں کافی دیر تک بیٹھا اندھیرے میں بارش کی آواز سنتا رہا۔ کافی تیز بارش ہو

رہی تھی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد بڑا تیز شور سنائی دینے لگا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ یہ کوئی برساتی نالہ تھا جس میں بارش کا سارا پانی آ گیا تھا اور بڑے زور شور سے بہنے لگا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں بارش کا پانی تو نہیں آ رہا تھا مگر سرد ہوا کے جھونکے بڑے تیز تھے۔ میں نے پتھر کو وہیں چھوڑا اور خود اٹھ کر غار کے اندر چلا گیا۔ میں سونے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ غار میں اندھیرا تھا مگر محسوس ہوتا تھا کہ غار کافی کشادہ ہے اور اس کی چھت بھی اونچی ہے۔ میرے پاؤں تلے جو پتھر آ جاتے تھے ان کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ غار کی چھت اونچی ہے۔ میں دیوار کے ساتھ غار کے منہ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ یہاں اتنی سردی نہیں تھی۔ بارش اور برساتی نالے کا شور بھی زیادہ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اندھیری اور طوفانی بارش والی لمبی رات مجھے وہیں بسر کرنی تھی۔ کچھ دیر تک اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا پاروتی کے بارے میں سوچتا رہا کہ راج گرو پجاری نے پاروتی کو انسانی شکل میں لانے کے بعد منتر پڑھ کر اپنے قبضے میں کر لیا ہو گا اور پاروتی کی یادداشت غائب کر دی ہو گی۔ یہ بات پاروتی نے مجھے ایک بار بتائی تھی کہ اگر کوئی زبردست طاقت والے پجاری نے مجھے پکڑ لیا اور اسے شیش ناگ کا منتر بھی آتا ہو گا تو وہ مجھے اپنے قبضے میں کر سکتا ہے۔ پھر میری یادداشت بھی غائب ہو جائے گی اور میں جن لوگوں کو پہلے دیکھ چکی ہوں، جن لوگوں سے پہلے مل چکی ہوں ان کو بالکل نہ پہچان سکوں گی۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ ایسی حالت میں پاروتی مجھے بھی نہیں پہچانے گی۔ پاروتی نے اتنی بات تو مجھے بتا دی تھی مگر آگے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا توڑ کیا ہو گا اور کس طریقے پر عمل کرنے سے اس کی یادداشت واپس آ سکے گی۔ یہی بات مجھے سخت پریشان کئے ہوئے تھی جس کی وجہ سے میری نیند غائب تھی۔ لیکن نیند آنا ایک قدرتی بات ہے اور نوجوانی میں آدمی کو بڑی جلدی نیند آ جاتی ہے۔ مجھے بھی رات کے کسی پہر نیند آ گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب میرا چہرہ زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول

Prepared By: S.Sohail Hussain

کر دیکھا۔ غار کے دہانے میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے غار کی چھت کو دیکھا۔ یہ کسی مکان کی چھت نہیں تھی۔ پہاڑ کے اندر غار کی چھت تھی جس میں سے نوکیلے پتھر باہر نکلے ہوئے تھے اور جگہ جگہ سوراخ تھے۔ دیوار بھی کہیں باہر کو نکلی ہوئی تھی اور کہیں اندر کو دھنسی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زمین پر پانی کے بہنے کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی ایسا دریا یا پہاڑی نالہ تھا جس کا دہانہ اوپر برفانی چوٹیاں پر تھا اور برف پگھلنے کے بعد اس میں پانی آتا ہو گا۔ اگر یہ برساتی نالہ ہوتا تو اب تک جتنی بارش ہوئی تھی اس میں سیلاب آ چکا ہوتا۔

میں غار کے دہانے پر بندھے ہوئے خچر کے پاس گیا۔ اس کو تھپکی دی۔ باہر بارش بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ کہیں کوئی درخت نہیں تھا۔ کسی پرندے کے چہچہانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ مجھے خود بھی تھوڑا سا کھانا پینا تھا اور خچر کو بھی کھلانا پلانا تھا۔ یہی فیصلہ کیا کہ غار سے نکل کر آگے چلا جائے۔ ہو سکتا ہے آگے کوئی گاؤں آ جائے۔ خچر کھول کر میں اس پر بیٹھ گیا۔ اسے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے غار سے باہر نکلا اور جس پہاڑی راستے سے میں اوپر جا رہا تھا اسی راستے پر روانہ ہو گیا۔ بارش کے بعد لطف زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ بات بڑی غنیمت تھی کہ ہوا تیز نہیں چل رہی تھی۔

یہ ساری چڑھائی ہی چڑھائی تھی۔ آس پاس بھی بڑی چٹانوں کے لوتے پھولے ٹکڑے پڑے تھے۔ میرا خچر ان پتھروں کے درمیان سے ہو کر قدم قدم چل رہا تھا۔ یہ اس علاقے کا خچر تھا اور اسے پہاڑوں پر چڑھنے کی بڑی مہارت تھی۔ میں کسی ایک پہاڑ کی چڑھائی نہیں چڑھ رہا تھا بلکہ یہ بہت سے پہاڑوں کی ڈھلانوں سے مل کر ایک وسیع و عریض ڈھلان بنی ہوئی تھی۔ اس ڈھلان میں کہیں گہری کھائی میں اتر جاتا۔ کبھی چٹانوں کے درمیان بنے ہوئے تنگ راستے سے گزرتا۔ اب اوپر اور دائیں بائیں کہیں کہیں سفید برف چوٹیوں سے چمٹی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ کافی دیر تک چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک کشادہ جگہ آ گئی۔ یہاں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے

بکھرے ہوئے تھے۔ کشادہ جگہ سے آگے پیچھے تو نشیب میں سیڑھیوں کی طرح بنے ہوئے دو تین ہرے بھرے کھیت دیکھ کر دل کو تسکین ہوئی کہ یہاں کسی نہ کسی دیہاتی کا مکان ضرور ہو گا۔ میں نے خچر کو کھیتوں کی طرف ڈال دیا۔ یہاں بھی کھیتوں کے قریب ہی اونچائی پر ایک گھر بنا ہوا تھا۔ میں اس طرف چلنے لگا۔ خچر کی ٹاپوں کی آواز سن کر مکان میں سے ایک آدمی نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا حقہ تھا۔

اس آدمی نے میری بڑی خاطر داری کی۔ روٹی کھلائی۔ میرے خچر کے آگے چارہ ڈالا اور میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جس ناگ مندر میں میں جا رہا ہوں وہ ابھی اوپر کافی فاصلے پر ہے۔ اس نے کہا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے برفانی علاقہ شروع ہو جائے گا۔ اس علاقے میں ایک جگہ مجھے تین برف پوش نوکیلی چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی نظر آئیں گی۔ ناگ مندر ان چٹانوں کے پیچھے ہے۔ یہ معلومات میرے لئے کافی تھیں۔ اس دیہاتی نے مجھے چار روٹیوں پر اچار ڈال کر ساتھ دے دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سفر پر چل پڑا۔

دیہاتی نے سورج غروب ہونے سے پہلے برفانی پہاڑیوں کے شروع ہو جانے کا کہا تھا مگر دوپہر کے بعد ہی برف پوش ٹیلوں اور چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے تک میں برف پوش پہاڑیوں میں داخل ہو چکا تھا۔ اب میرا خچر برف پر چل رہا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی وجہ سے سورج دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ سفر اب اس طرح کٹ رہا تھا کہ کہیں چڑھائی آ جاتی اور کہیں برف پوش چٹانوں کے درمیان تھوڑی سی اترائی آ جاتی۔ دور اوپر کسی وقت پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں بھی نظر آ جاتی تھیں۔ میرے چاروں طرف اب برف ہی برف تھی۔ یہ برف نرم نہیں تھی۔ جمی ہوئی تھی جس کی وجہ سے خچر سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہا تھا۔ یہاں اتنی سردی نہیں محسوس ہو رہی تھی جتنی سردی پیچھے تھی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

جس وقت میں ایک برف پوش پہاڑی درے میں سے گزر کر دوسری طرف آیا تو شام کا ہلکا ہلکا سرمئی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ میں نے برفانی ٹیلوں کا جائزہ لیا تو مجھے اوپر ایک جانب تین برف پوش چٹانیں دکھائی دیں۔ یہ چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ یہی وہ چٹانیں تھیں جن کی دوسری طرف پجاری راج گرو کا مندر تھا۔ مجھے وہیں جانا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے رات کا اندھیرا ہو جائے گا اور رات تلاش کرنے میں دشواری ہو گی۔ میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں کسی جگہ رک کر رات گزار لوں اور اگلے روز دن کی روشنی میں ان چٹانوں کی طرف چلوں۔ وہاں برف ہی برف تھی۔ رات بسر کرنے کا کوئی ٹھکانہ بظاہر نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے لچھمن کو ایک طرف ڈال دیا۔ لچھمن ٹیلے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ٹیلے کی دوسری جانب پہنچ کر میں نے اوپر نگاہ ڈالی تو میں نے لچھمن کو وہیں روک لیا۔ سامنے ایک پہاڑی کا چبوترہ سا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ چبوترے پر لکڑی کا چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ قدرت نے مجھے رات گزارنے کے لئے بڑی اچھی جگہ عنایت کر دی تھی۔ میں لچھمن کو لے کر پہاڑی چبوترے کی طرف چلنے لگا۔ پہلے بڑے بڑے پتھر راستہ روک رہے تھے۔ میں لچھمن سے اتر پڑا۔ اس کی باگ تھام کر پیدل چل پڑا۔ تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد میں چبوترے کے سامنے آ گیا۔ چبوترے پر اور لکڑی کے کیبن کی چھت پر برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ دو تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سیڑھیاں بھی برف پوش تھیں۔ میں نے لچھمن کو وہیں چھوڑا اور سیڑھیاں چڑھ کر لکڑی کے کیبن کا جائزہ لیا۔ خدا جانے یہ کیبن کس نے اور کس مقصد کے لئے یہاں بنایا تھا۔ کیبن کا لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ دروازے کے آگے چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کے اوپر کیبن کی ڈھلانی چھت دو تین ستون پر کھڑی تھی۔

دروازے پر کوئی تالا نہیں پڑا تھا۔ شام کا اندھیرا رات کے اندھیرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا۔ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ فرش لکڑی کا تھا جس پر ایک طرف سوکھی گھاس کا ڈھیر پڑا تھا۔

لکڑی کی ایک بڑی چوکی تھی۔ چوکی پر لکڑی کا گول تھال رکھا تھا۔ اس تھال میں مٹی کا ایک دیا سلائی کا بکس پڑا تھا۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ جس دیہاتی نے مجھے دو روٹیاں دی تھیں اس نے مجھے ایک ٹین چائے کا پیالہ بھی دیا تھا کہ اگر پاس کے تو اس میں پانی ڈال کر پی لوں۔

سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ سوکھی گھاس کا گٹھا سا بنا کر باہر لے آیا اور لچھمن کے آگے ڈال دیا۔ لچھمن بڑے مزے سے گھاس کھانے لگا۔ کیبن میں آ کر میں نے چراغ روشن کر دیا۔ وہاں پینے کا پانی نہیں تھا۔ میں نے ایک جگہ سے تھوڑی سی برف توڑ کر ٹین چائے کے پیالے میں ڈالی اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے چراغ کی لو پر گرم کرنے لگا۔ دو منٹ کے بعد برف پگھل کر پانی بن گئی۔ میں نے پیالہ جلتے ہوئے دیئے کے پاس ہی رکھ دیا اور روٹی نکال کر کھانے لگا۔ پانی کے جلدی جلدی تین چار گھونٹ پیئے کیونکہ پانی سردی کی وجہ سے دوبارہ جمنے لگا تھا۔ روٹی کھانے کے بعد میں باہر آ گیا۔ لچھمن ساری گھاس کھا گیا تھا اور اب برف پر منہ مار رہا تھا۔ شاید وہ اپنی گرم زبان اور سانس کی گرمی سے برف میں سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔ میں اسے چبوترے پر لے آیا اور برآمدے میں ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ خود کیبن میں آ کر سوکھے گھاس کے ڈھیر میں گھس کر سٹ سمٹا کر بیٹھ گیا۔ گھاس نے مجھے گرم کر دیا۔ میں نے دیا بجھا دیا اور وہیں گھاس پر اکٹھا ہو کر سو گیا۔

کچھ معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کچھ ایسا خیال آ رہا تھا کہ لچھمن نے دور سے برآمدے کے فرش پر پاؤں مارے تھے۔ میں نے کان لگا دیئے۔ لچھمن نے ایک بار پھر فرش پر پاؤں مارے۔ میں آہستہ سے اٹھا اور بند دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ باہر سفید برف کی وجہ سے رات اتنی اندھیری نہیں تھی جتنی میدانی علاقوں میں ہوتی ہے۔ میں نے ایک انسانی سایہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر ڈھلان کی طرف جاتے دیکھا۔ پہلے تو مجھے خوف محسوس ہوا کہ یہ کوئی ڈاکو یا قاتل قسم کا آدمی نہ ہو۔ پھر خیال آیا کہ اگر وہ ڈاکو یا قاتل ہوتا تو مجھے مار ڈالتا

Prepared By: S.Sohail Hussain

اور میرا لچر کھول کر لے جاتا۔ لیکن اس نے دونوں میں سے ایک بھی کام نہیں کیا تھا۔ سایہ جو مجھے نظر آیا تھا وہ بالکل انسان کی طرح تھا۔ پھر یہ کون تھا اور برآمدے میں کس غرض سے آیا تھا؟

پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کا پیچھا کروں اور معلوم کروں کہ یہ کون تھا پھر یہ سوچ کر وہیں کھڑا رہا کہ خوامخواہ مجھے کسی مصیبت میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے سے ہی میں جس مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں میرے لئے کافی ہے۔ میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور لنگ گھاس کی ڈھیری میں آ کر گھس گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کچھ تجسس اور کچھ خوف کے مارے اب مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرا ذہن بار بار اس انسانی سائے کی طرف جاتا جو مجھے برآمدے سے اتر کر نشیب میں جاتا دکھائی دیا تھا۔ آخر یہ کون تھا؟ ضرور کوئی بھوت پریت ہو گا۔

یہی سوچتے سوچتے میں اونگھنے لگا۔ مجھے شروع ہی سے اونگھنا پسند نہیں رہا۔ مجھے بیداری اچھی لگتی ہے یا نیند اچھی لگتی ہے۔ لیکن اونگھنا جو بیداری اور نیند کی درمیانی حالت ہے سخت بری لگتی ہے۔ اس حالت میں ایک تو آدمی کو اپنے اوپر کنٹرول نہیں رہتا دوسرے گردن انتہائی بے بسی کے عالم میں کبھی ادھر کو گرنے لگتی ہے کبھی ادھر کو اپنے آپ جھک جاتی ہے۔ اونگھنے کی حالت میں انسان عجیب عجیب مضحکہ خیز شکلیں بناتا ہے میں اونگھنے کی بجائے گھاس پر دراز ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں تاکہ سو جاؤں اور اونگھنے کی کیفیت سے نجات ملے۔ نیند مجھے اپنی آغوش میں لینے ہی والی تھی کہ برآمدے میں میرے لچر نے زور زور سے پاؤں مارے۔ اس کے شور سے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر دیکھا۔ لچر اب اطمینان سے کھڑا تھا۔ ایک آدھ منٹ میں دروازے میں کھڑا سفیدی مائل برفانی رات کے اندھیرے میں جائزہ لیتا رہا۔ اس وقت مجھے وہ انسانی سایہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دروازہ بند کر کے گھاس کی ڈھیری پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب نیند بالکل غائب تھی۔ یہ جگہ مجھے کچھ پراسرار اور آسیبی لگنے لگی تھی۔ دیا بجھا ہوا تھا۔ کیبن میں اندھیرا تھا۔ میں گھاس کی ڈھیری میں گھس کر خاموش

بیٹھا تھا۔

اچانک مجھے شوں شوں کی دو آوازیں سنائی دیں۔ خوف کے مارے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

اس سنسان برفانی پہاڑیوں میں رات کے سناٹے میں یہ آواز ایسی خوفناک لگی کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ باہر جا کر معلوم کروں کہ یہ آواز کس چیز کی ہے۔ جب تھوڑے وقفے کے بعد ایک بار پھر وہی آواز سنائی دی تو مجھے شک پڑا کہ باہر کوئی جنگلی ریچھ خچر کو کھانے نہ آ گیا ہو اور یہ اس کی آواز نہ ہو۔ میں آہستہ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر برآمدے میں نظر ڈالی۔

برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ خچر سر جھکائے ایک جگہ ایسی حالت میں کھڑا تھا جیسے کھڑے کھڑے سو گیا ہو۔ میں ہمت کر کے خچر کے پاس آ گیا۔ خچر میری پدائش پر ذرا سا غرایا اور پھر اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ خچر زندہ تھا۔ وہاں کوئی جنگلی درندہ وغیرہ بھی نظر نہ آیا۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ میرے ہاتھ ٹھٹھرنے لگے۔ پھر بھی میں برآمدے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں کہیں درندہ مجھے دیکھ کر ادھر ادھر نہ ہو گیا ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ شاید خچر نے ہی شوں شوں کی تھی۔ میں واپس کیبن میں آ کر گھاس پر لیٹ گیا۔ مگر گھاس اس برفانی رات میں میرے لئے بستر سنجاب و سمور سے کم جنت نہیں ہو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے جب مجھے اونگھ آئی تو میں نے اونگھ سے بچنے کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ سب خیریت ہے اب مجھے سو جانا چاہئے۔ چنانچہ میں سو گیا۔

آخر رات گزر ہی گئی۔

دن نکل آیا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی۔ سورج ابھی تک بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ یہی بڑی غنیمت تھی کہ بارش رکی ہوئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں پہاڑوں میں جس بلندی پر پہنچ گیا ہوں وہاں اب بارش نہیں ہو گی بلکہ برف گرے گی۔ میں نے جلدی جلدی رات کی بچی ہوئی روٹی کھائی۔ پیالے میں تھوڑی سی برف ڈال کر اسے چراغ کی لو کے اوپر رکھ کر اس کا پانی بنایا اور پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ کیبن سے گھاس لا کر میں نے خچر کے آگے ڈال دی تھی جسے وہ بڑے مزے سے کھا رہا تھا۔ اب خچر میری طرح تازہ دم ہو گیا تو ہم دونوں نے اوپر کی جانب اپنا سفر شروع کر دیا۔ وہ پہاڑیوں کی ڈھلانیں جہاں آ رہی تھیں وہاں برف پر ایک قدرتی پگ ڈنڈی بن گئی تھی۔ خچر اسی پگ ڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ میں خچر پر بیٹھا تھا اور میری نگاہیں اوپر ان تین برف پوش چٹانوں پر لگی تھیں جہاں مجھے پہنچنا تھا۔ پہاڑیوں میں برفانی راستوں پر سفر کرتے ہوئے کبھی یہ چٹانیں میری نظروں سے اوجھل ہو جاتیں اور کبھی اچانک سامنے آ جاتی تھیں۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے آخر میں اس پگ ڈنڈی پر آ گیا جو سیدھی اوپر چٹانوں کی طرف جاتی تھی۔

میں نے اپنے دل میں سوچ لیا تھا کہ مجھے اوپر راج گرو کے پاس جا کر کیا کہنا ہو گا اور اسے کیا کہنا ہو گا۔ یہ حقیقت میرے پیش نظر تھی کہ اگر وہاں پر پارو تی موجود ہو گی تو راج گرو نے اپنے خاص منتر کی مدد سے اس کی یادداشت گم کر کے اسے اپنے قبضے میں کر رکھا ہو گا اور وہ مجھے دیکھ کر بھی نہیں پہچان سکے گی کہ میں اس کا ساتھی اور دوست ہوں۔ خچر آہستہ آہستہ برفانی پگ ڈنڈی کی چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ تینوں چٹانیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ جب خچر اور میں ان چٹانوں کے نیچے پہنچ گئے تو میں خچر سے اتر پڑا۔ اس کی باگ تھام لی اور برف پر احتیاط سے چلتا ہوا چٹانوں کے پیچھے آیا تو سامنے ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا جس کی مخروطی چھت کے اوپر پیتل کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ یہ کوئی مندر ہے۔ یہ مکان نما مندر بھی پتھروں کے ایک چبوترے پر بنا ہوا تھا اور اس کے آگے بھی چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ آدمی کوئی نہیں

Prepared By: S.Sohail Hussain

تھا۔

ایک بات میرے حق میں بڑی اچھی ہوئی تھی کہ دیوداسی رکنی والے مندر میں پجاری راج گرو نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس کو یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ ایک نوجوان ناگن عورت کی لاش کے ٹکڑے لے کر مندر میں آیا ہے جس نے لاش کے ٹکڑے ڈبے میں ڈال کر تالاب میں ڈبو رکھے ہیں لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ نوجوان میں ہوں۔ بقول دیوداسی رکنی کے راج گرو نے اپنے گیان دھیان سے میرے بارے میں پتہ چلا لیا تھا اور وہ آدھی رات کے وقت وہاں پہنچا تھا اور پجاری سے مل کر پاروتی کی ناگن لاش والا ڈبہ تالاب سے نکال کر اسی رات منہ اندھیرے وہاں سے واپس روانہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بے دھڑک ہو کر اوپر چلا جا رہا تھا کہ اگر راج گرو نے مجھے دیکھ بھی لیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ میں ہی وہ نوجوان ہوں جو ناگن عورت کے ٹکڑے لے کر کیلاش پربت پر آیا ہوا تھا۔ جہاں تک پاروتی کا سوال تھا تو اس کی یادداشت راج گرو نے منتر پڑھ کر ضرور غائب کر دی تھی کہ دوسری صورت میں وہ اس کے قابو میں آ ہی نہیں سکتی تھی اور یادداشت گم ہو جانے کی وجہ سے پاروتی کے لئے بھی میں اجنبی ہی ہوں گا۔ میں نے ٹھہر کو ایک طرف چھوڑ دیا اور خود چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر راج گرو کے مندر کے برآمدے میں آ گیا۔ سامنے صحن میں پتھر کے ستونوں کے دو مجسمے بنے ہوئے تھے جن پر برف جمی ہوئی تھی۔

مندر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ تین چار بار دستک دینے سے ایک عورت نے دروازہ کھول کر مجھے گھور کر دیکھا۔

"کون ہو؟ کیا کام ہے؟"

یہ عورت تبت کی لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیلی اور نتھنے کشادہ تھے۔ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ اس نے گرم لنگا اور اونی چغہ پہنا ہوا تھا۔ وہ اردو ٹھیک ٹھاک بول رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"راج گرو کے درشن کرنے بڑی دور سے چل کر آیا ہوں۔ میرا نام شیکو ہے۔"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ سردی بہت تھی مگر مجبور تھا۔ عورت مجھے کچھ کہے بغیر دروازہ بند کر کے چلی گئی تھی۔ مگر اس کی شکل سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اندر سے کسی کو بلانے گئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسی عورت نے دوبارہ دروازہ کھولا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر ایک مدھم روشنی ڈیوڑھی تھی۔ آگے ایک دالان تھا جس کے فرش پر چھت نہ ہونے کی وجہ سے برف جمی ہوئی تھی۔ سامنے ستونوں والا برآمدہ تھا۔ عورت دالان کے کونے والے کمرے یا کوٹھڑی کے دروازے پر جا کر رک گئی۔ اس نے دروازے کے باہر لگی ہوئی تانبے کی چھوٹی سی گھنٹی کو ہاتھ سے ہلایا۔ اندر سے کسی کی بھاری مگر کرخت آواز آئی۔

"دروازہ کھلا ہے۔"

میں اس عورت کے ساتھ اندر داخل ہوا تو سامنے تخت پوش پر ایک موٹا بھاری بھرکم آدمی اونی چغہ اونی ٹوپی اور اونی لنگا پہنے میلا سنگار پی رہا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے بدھ بھاو لگا۔ کمرے میں بجلی کے تیل کا بڑا لیمپ روشن تھا۔ دیواروں پر سانپوں کے بت بنے ہوئے تھے۔ جس تخت پر وہ بھلو نما انسان بیٹھا تھا اس کے پیچھے بھی دیوار پر پتھر کا ایک سیاہ سانپ پھن کھولے ہوئے تھا۔

میں نے جاتے ہی ہندوؤں کے طریقے سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ وہ آدمی جو یقیناً پجاری راج گرو ہی تھا میری طرف اپنی زرد چمکیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"شیکو مہاراج!"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"مہاراج! وشنیار کا رہنے والا ہوں۔ وہاں ایک ناگ مندر میں آپ کی بڑی تعریف سنی اور من میں چاہ پیدا ہوئی کہ جا کر آپ کے چرن چھوؤں اور آپ کی

Prepared By: S.Sohail Hussain

خدمت کروں۔"

وہ سنگار کا کش لگا کر بولا۔

"چلو چلو۔ یہاں تمہارے واسطے کوئی جگہ نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ۔ یہاں سے کاچی اسے یہاں سے نکال دو۔"

کاچی اس جتی عورت کا نام تھا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف چلی۔ میرے ساتھ وہ بھی راج گرو کے کمرے سے باہر آ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور میرے آگے آگے برآمدے میں چلنے لگی۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے کوئی ترکیب نکالنی چاہیے۔ اس پجاری راج گرو نے تو مجھے مندر میں گھسنے نہیں دیا۔ برآمدے کے آگے صحن تھا۔ صحن کے برفانی فرش پر چلتے ہوئے کاچی مکان یا مندر کی ڈیوڑھی میں آئی تو میں نے کاچی سے کہا۔

"کاچی! میں راج گرو جی کی سیوا کرنے یہاں آیا تھا۔ اگر اس کی سیوا کے بغیر مر گیا تو میری روح کو چین نہیں مل سکے گا۔"

کاچی نے ڈیوڑھی کے دروازے کو کھولنے کے بعد میری طرف دیکھا اور سر سے اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ میں باہر نکل جاؤں۔ میں اس جتی عورت کا دل موم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

"کاچی جی! ذرا سوچو ان برفانی پہاڑوں میں میں کہاں جاؤں گا۔ یہاں تو باہر سردی سے ٹھٹھر کر مر جاؤں گا۔"

جب میں نے دیکھا کہ کاچی کے چہرے پر میرے ساتھ ہمدردی کے تاثرات نمایاں ہو رہے ہیں تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"دیوی کاچی! بھگوان کیلئے میری مدد کرو۔ میں مندر میں بیٹھ کر ناگ دیوتا کی بھی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔"

جتی عورت کے دل میں میرے بارے میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

میں جلدی سے دروازے کے ایک طرف ہو گیا۔ کاچی واپس چلی گئی۔ شاید وہ راج گرو کو یہ کہنے گئی تھی کہ مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔ یہ خدا جانے کیا کرنے گئی تھی۔ بہرحال اس نے میری مدد کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ واپس آئی تو یہ کہہ کر میرے آگے چل پڑی۔ "میرے ساتھ آ جاؤ۔" اس مندر کے ہال میں تیزی چلکن کے عقب میں لیلوں کی برفوں کے درمیان ایک راستہ جاتا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اس راستے پر آ گئی۔ آگے جا کر ٹیلے کے دامن میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس کی ڈھلوان چھت برف میں چھپی ہوئی تھی۔ کاچی دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ میں باہر کھڑا رہا۔ کاچی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"وہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اندر کیوں نہیں آتے؟"

میں جلدی سے اندر چلا گیا۔ یہاں بھی فرش لکڑی کا تھا۔ جس پر خشک گھاس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا آتشدان تھا۔ کاچی نے دروازہ بند کرنے کے بعد مٹی کے تیل والا لیمپ روشن کر دیا۔ کہنے لگی۔

"مجھے تم پر ترس آ گیا ہے بھیکو۔ تم یہاں رہو لیکن میں کسی طرح راج گرو پجاری کو منا لوں گی کہ تمہیں مندر میں نوکر رکھ لے۔"

میں نے کاچی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

"کاچی جی! تم دیوی ہو۔"

وہ بولی۔

"لیکن اس جگہ سے باہر مت جانا۔ بہت ہی ضرورت پڑے تو پیچھے گھاٹی میں چلے جانا مگر اس وقت تک مندر کی طرف مت آنا جب تک کہ میں پجاری راج گرو سے تمہاری نوکری کی بات پکی نہیں کر لیتی۔"

میں بطخوں میں ہاتھ دیئے خشک گھاس پر بیٹھا تھا۔

"تمہیں کھانے پینے کو میں یہاں دے جایا کروں گی۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نے کہا "میرے لچھر کا کیا بنے گا؟ وہ مندر کے باہر تھا۔ تم نے اسے ضرور دیکھا ہو گا۔"

کانچی کہنے لگی۔

"نیچے مندر کا ایک اصطبل ہے جہاں مندر کی گائے اور پجاری کے لچھر بندھے رہتے ہیں۔ میں تمہارا لچھر بھی وہیں لے جاؤں گی۔"

کانچی ساتھ والے کمرے میں گئی اور وہاں سے ایک بڑا لفافہ نکال کر لے آئی۔ لفافہ گھاس کے بستر پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ دروازہ بند کرنے سے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں دن کے وقت آتی ہوں تو لیمپ جلا لیتی ہوں۔ اوپر صرف روشندان ہے۔ ساتھ والے کمرے میں غسل خانہ بھی ہے۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

میں کانچی کے اس فیاضانہ سلوک پر خوش بھی ہوا اور حیران بھی ہو رہا تھا کہ آخر وہ مجھ پر اچانک اتنی مہربان کیوں ہو گئی ہے۔ شاید اسے مجھ پر ترس آ گیا تھا کہ میں اتنی دور سے وہاں گیان دھیان کرنے آیا ہوں اور پجاری نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ کانچی کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ وہ اندر سے پجاری راج گرو کے خلاف ہے اور اسے پسند نہیں کرتی۔ مجھے نہ تو وہاں کوئی گیان دھیان کرنا تھا اور نہ تو کسی پجاری کی تھی میں تو وہاں پاروتی کی تلاش میں آیا تھا اور مجھے کچھ دیر وہاں رہ کر پاروتی کا سراغ لگانا تھا۔ میرا یہ مسئلہ کانچی نے حل کر دیا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے اصرار کے ساتھ کہا کہ جس طرح بھی ہو وہ مجھے راج گرو کی اجازت سے مندر میں کوئی کام دلا دے۔ کانچی نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور کوشش کرے گی۔ مکان سے جاتے ہوئے کانچی مجھے کہہ گئی کہ میں وہاں سے باہر کہیں نہ جاؤں اور جب تک وہ واپس نہیں آ جاتی میں کمرے میں ہی رہوں۔ اس نے آتشدان میں دو چار موٹی لکڑیاں جلا دی تھیں۔ کانچی کے جانے کے بعد میں آتشدان کے قریب ہو کر گھٹنوں پر لحاف ڈال کر بیٹھ گیا۔ جیب سے پاروتی کا رومال نکال کر اسے دیکھا۔ سونگھا۔ مجھے تو اس میں سے پاروتی سانپ کی کوئی بو نہیں آ

رہی تھی۔ لیکن میں انسان تھا۔ اس بو کو صرف سانپ ہی محسوس کر سکتے تھے۔ رومال کو تہ کر کے میں نے جیب میں رکھ لیا۔

شام ہو گئی۔ میں کمرے میں ہی رہا۔ جب باہر اندھیرا ہونے لگا تو کانچی آ گئی۔ مندر میں وہ راج گرو اور دو تین پجاریوں کے لئے کھانا وغیرہ بھی بناتی تھی۔ آتی دفعہ وہ میرے لئے چاول رومال میں ڈال کر لے آئی۔ یہ تھیلی چاول تھے۔ وہ آتشدان میں لکڑیاں ڈال کر آگ تیز کرنے لگی۔ میں چاول کھانے لگا۔ پھر دوسرے کمرے میں گئی اور میرے لئے قہوہ بنا کر لے آئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ راج گرو نے اس نے میرے بارے میں کوئی بات تو نہیں کی۔ کہنے لگی۔

"آج موقع نہیں ملا۔ کل ضرور کہوں گی۔ ویسے بھی تمہارا مندر میں نوکر بن کر رہنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر تم میرے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکو گے۔ سب کو پتہ چل جائے گا۔"

اس نے بتایا کہ پجاری راج گرو نے ہر قسم کے سانپ پال رکھے ہیں جن کی وہ پوجا کرتا ہے۔

"اس نے مجھے بھی ایک سانپ دیا تھا۔ میں تمہیں وہ دکھاتی ہوں۔ یہ سانپ شیش ناگ دیوتا کی بلا گی سے ہے۔"

کونے میں ایک مٹی کا بڑا سا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ وہ مٹکے میں سے ایک چھوٹی پٹاری نکال کر لے آئی۔ پٹاری سامنے رکھ کر اسے کھولا تو اس میں سے سنہری رنگ کا ایک بالشت بھر کا سانپ پھنکارتا ہوا باہر نکل آیا۔ کانچی نے سانپ کو پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"یہ بڑا زہریلا سانپ ہے۔ پجاری کہتا ہے اس میں ایک ہزار سانپوں کا زہر ہے۔"

اس دوران ایک عجیب بات ہوئی۔ یہ میرے لئے عجیب نہیں تھی مگر کانچی کے لئے بڑی حیران کر دینے والی بات تھی۔ سنہری سانپ نے اپنا چھوٹا سا پھن کھول کر میری طرف دیکھا۔ پھر کانچی کی کلائی سے اتر کر میرے قریب آیا اور کنڈلی مار کر سامنے

Prepared By: S.Sohail Hussain

بیٹھ گیا اور اپنا پھن جھکا دیا۔

کانچی حیرت زدہ سی ہو کر کبھی مجھے اور کبھی سانپ کو دیکھتی۔ اس نے ساری زندگی ناگ مندر میں گزاری تھی۔ سمجھ گئی کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اپنی پھولی پھولی آنکھیں مجھ پر جماتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟ مجھے بتا دو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

مجھے اس عورت سے پاروتی کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ قدرت نے اس عورت کا اعتماد حاصل کرنے کا ایک موقع دے دیا تھا۔ میں نے اسے یہ تو نہ بتایا کہ میرے پاس پاروتی ناگن کا رومال ہے جس کی بو کی وجہ سے سنہری سانپ میرے آگے جھک گیا ہے۔ میں نے پراعتماد لہجہ میں کہا۔

"کانچی! اب جبکہ میری طاقت کا راز تم پر اس سانپ نے کھول دیا ہے تو میں تمہیں اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں شیش ناگ کا اوتار ہوں۔ سانپ میری تعظیم کرتے ہیں۔"

سنہری سانپ ابھی تک اپنا پھن میرے آگے جھکائے بیٹھا تھا۔ میں تو ڈر کے مارے اسے ہاتھ نہیں لگا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہنے لگی۔

"مہاراج! آپ شیش ناگ دیوتا کے اوتار ہیں تو آپ کو یہاں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا۔ "کانچی! یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ دو لفظوں میں بات کروں تو میں اپنی ایک دیوداسی ناگن کے ساتھ پرلوک سے دھرتی پر سیر کرنے آیا تھا۔ دیوداسی ناگن سانپ کے روپ میں میرے ساتھ تھی۔ گورکھپور شہر میں اچانک وہ میری کلائی سے اتر کر باغ میں پھرنے لگی ایک آدمی نے اسے دیکھا تو لاٹھی مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ مجھے بیاصدمہ ہوا۔ میں نے ناگن کی لاش کے ٹکڑوں کو ڈبے میں بند کیا اور کیلاش پربت لے آیا۔ کیونکہ لاش کے ٹکڑوں والے ڈبے کو کیلاش پربت کے تالاب میں دس روز ڈبوئے رکھنے کے بعد دیوداسی ناگن کو پھر سے زندہ ہو جانا تھا۔ میں نیچے مندر میں ڈبے

کو تالاب میں ڈبو کر دس دن تک بیٹھا رہا۔ مگر تمہارے پجاری راج گرو نے اپنی طاقت کے زور سے دیوداسی ناگن کا پتہ چلا لیا۔ بس وہ آخری رات کو مندر میں آیا اور پجاری سے مل کر دیوداسی ناگن والا ڈبہ نکال کر لے گیا۔ مجھے شیش ناگ دیوتا نے ساری بات بتا دی۔ چنانچہ اب میں اپنی دیوداسی ناگن کی تلاش میں راج گرو کے پیچھے یہاں آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دیوداسی ناگن کا سراغ لگاؤ اور پتہ کرو کہ پجاری راج گرو نے اسے یہاں کس جگہ رکھا ہوا ہے۔ میں تمہیں اس کے عوض تمہیں شیش ناگ کا سب سے اونچا منتر بتا دوں گا اور تم سب سے بڑی پجارن بن جاؤ گی۔"

کانچی بڑے غور سے میری گفتگو سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت و انبساط کی کیفیت تھی۔ سنہری سانپ اسی طرح پھن جھکائے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"سانپ کو پٹاری میں بند کر دو اور مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے؟"

کانچی نے سانپ پٹاری میں بند کر دیا اور میرے پاؤں کو چھو کر بولی۔

"مہاراج! میں آج سے آپ کی داسی ہوں آپ جو کہیں گے میں ویسے ہی کروں گی۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ راج گرو نیچے مندر میں کسی خاص چیز کی تلاش میں گیا تھا اور جب وہ واپس آیا تو بڑا خوش تھا اور اسی روز وہ اپنی گپھا میں چلا گیا تھا۔"

"اس کی گپھا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

کانچی نے کہا۔ "یہ مندر میں کسی پجاری، کسی دیوداسی کو معلوم نہیں ہے۔ مگر میں سب معلوم کر لوں گی آپ مجھے صرف دو دن کی مہلت دے دیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ دو دن زیادہ ہیں۔ میں تمہیں کل کے دن کی مہلت دیتا ہوں۔ تمہیں ایک دن میں ساری جاسوسی کرنی ہو گی۔ کیا تمہیں منظور ہے؟"

مجھے یہ خطرہ تھا کہ راج گرو کہیں اتنی دیر میں پاروتی کو یہاں سے کسی دوسری جگہ نہ پہنچا دے۔ کانچی کو میری وجہ سے سب سے بڑی پجارن بننے کا موقع مل رہا تھا۔ کہنے لگی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"جو حکم مہاراج! میں کل تک ساری باتیں معلوم کر لوں گی۔"

رات گزر گئی۔ دوسرے روز کانچی نے جاتے ہوئے جھک کر میرے پاؤں چھوئے اور کہا۔

"مہاراج! میں جاتی ہوں۔"

کانچی چلی گئی۔ اس بات کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کانچی اس مکار پجاری راج گرو کی بڑی چہیتی دیوداسی ہے اور وہ اس کے دل کا راز معلوم کر لے گی۔ صبح کی گئی کانچی دوپہر کو بھی نہ آئی۔ شام ہو گئی۔ پھر رات کا اندھیرا چھا گیا۔ اس وقت کانچی آ گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی خاص بات معلوم کر کے آئی ہے۔ آتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میرے پاؤں چھوئے اور سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مہاراج! میں نے آپ کی دیوداسی ناگن کا سراغ لگا لیا ہے۔"

میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"کہاں ہے وہ؟"

کانچی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ راج گرو نے پاروتی کو اوپر برف پوش پہاڑیوں کے ایک ایسے دور تہہ خانے میں بند کر رکھا ہے جو اس کی گپھا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس عیار شخص نے پاروتی کے زندہ ہو جانے کے بعد اس پر اپنا منتر پڑھ کر اسے اپنے قبضے میں کر لیا ہوا تھا اور یہ بات بھی یقینی تھی کہ پاروتی کی یادداشت گم ہو چکی ہو گی۔ کانچی کہنے لگی۔

"اس بات کا سوائے راج گرو کے اور کسی کو علم نہیں ہے۔ میں ہی جانتی ہوں کہ میں نے یہ راز راج گرو سے کیسے اگلوایا ہے۔"

میں نے کانچی سے کہا۔

"شاباش! تب تم یہ معلوم کرو کہ راج گرو کی گپھا پہاڑوں میں کس جگہ پر ہے۔"

کانچی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! میں ابھی معلوم کر آتی ہوں۔"

میں نے کانچی کی ذہانت کی تعریف کی اور کہا۔

"اب مجھے اس گپھا تک لے چلو۔ جب میں دیوداسی ناگن کو دیکھ لوں گا تو تمہیں وہ خاص منتر بتا دوں گا جس کو سیکھنے کے بعد تم سب پجاری اور پجارنوں کی رانی بن جاؤ گی۔"

دوسرے دن جب رات آدھی گزر چکی تھی تو کانچی اور میں دو لچھوں پر سوار اس گپھا کی طرف جا رہے تھے جس کے تہہ خانے میں پاروتی موجود تھی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہم برف پوش پہاڑیوں میں چلے جا رہے تھے۔

کاچی خچر پر سوار میرے آگے آگے تھی۔ میرا خچر اس کے پیچھے تھا۔ چترلی پگ ڈنڈی پر برف جمی ہوئی تھی اگرچہ آدھی رات کا وقت تھا مگر اندھیرے میں برف کی سفیدی صاف نظر آ رہی تھی۔ ہوا تیز چل رہی تھی اس وجہ سے سردی ناقابل برداشت تھی۔ ہمالیہ کے برفانی پہاڑوں میں جب تیز ہوا چلتی ہے تو سردی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ ہم کوئی ایک گھنٹہ خچروں پر بیٹھے سفر کرتے رہے۔ اس دوران ہم کئی برف پوش ٹیلوں اور گھاٹیوں میں سے گزرے آخر اس مقام پر پہنچ گئے جہاں بڑی بڑی برف پوش چٹانیں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان ایک گلی سی بن گئی تھی۔ یہاں آ کر کاچی نے خچر روکا اور نیچے اتر آئی۔ اس نے مجھے بھی خچر سے اترنے کا اشارہ کیا۔

خچروں کو چٹان کی دیوار کے پاس لے جا کر ایک پتھر سے باندھ دیا۔ میں سامنے والی چٹان کے نیچے کھڑا تھا۔ کاچی میرے پاس آئی اور آہستہ سے بولی۔

"ہم راج گرو پجاری کے تہ خانے کے قریب آ گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا "یہ تہ خانہ کہاں ہے؟"

اس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"جہاں یہ سامنے والی چٹان ختم ہوتی ہے وہاں چٹان کے اندر ایک شگاف ہے اس

شگاف میں سے ایک راستہ نیچے پجاری کی تہ خانے والی کھلا کو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے مہاراج آپ کی ناگن دیوداسی وہاں موجود ہو گی۔"

میں نے کاچی سے کہا۔

"تم خچروں کے پاس میرا انتظار کرو میں پہلے خود تہ خانے میں جاتا ہوں۔"

کاچی خچروں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ میں چٹان کے ساتھ ساتھ ہو کر آگے چلنے لگا۔ پچھلی رات اونچے نیچے پتھروں کی وجہ سے غیر ہموار تھا۔ میں سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ چٹان جہاں ختم ہوئی وہاں کاچی کے بتانے کے مطابق اندر کی جانب ایک گہرا شگاف تھا۔ میں جھک کر اس کے اندر چلا گیا اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے دیواروں کو ہاتھوں سے ٹٹولا۔ ایک جگہ چٹان کے شگاف کی دیوار پر تاک کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے اوپر اٹھایا تو مجھے نیچے بجلی جلتی روشنی میں چہرہ نظر دکھائی دیا۔ یہ روشنی کسی چراغ کی تھی جو نیچے تہ خانے میں روشن تھا۔ اس کی روشنی زینے پر پڑ رہی تھی۔

میں دبے پاؤں زینہ اترنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں ہوں گی۔ آخری سیڑھی کے قریب پہنچا تو ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے کوئی عورت دھیمی آواز میں منتر پڑھ رہی ہو۔ میں زینے کی دیوار کے ساتھ لگ کر آخری سیڑھی پر آ گیا اور گردن آگے کر کے دیکھنے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا تہ خانہ تھا۔ سامنے والی دیوار پر سانپ کا بت بنا ہوا تھا۔ اس کے آگے چوکور پتھر پر پیتل کی تھالی میں دو چراغ جل رہے تھے۔ ان کے پاس ایک عورت بیٹھی دونوں ہاتھ زانوؤں پر رکھے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے بال کمر تک کھلے تھے۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے پاروتی کے بال فوراً پہچان لئے۔ یہ پاروتی ہی تھی۔ میں زینے سے ہٹ کر تہ خانے کے فرش پر دو قدم چلا ہوں گا کہ پاروتی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس نے بڑے غصے سے پوچھا۔

"کون ہو؟ یہاں کیوں آئے ہو؟"

افسوس ۔۔۔ اس مکار راج گرو پجاری نے پاروتی پر منتر پڑھ کر اس کی یادداشت

Prepared By: S.Sohail Hussain

معطل کر دی تھی۔ پاروتی میری طرف دیکھ رہی تھی اور مجھے بالکل نہیں پہچان رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے کہا۔

"پاروتی! میں ہوں۔ تمہارا پرانا ساتھی کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

پاروتی غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اس نے دیوار کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر ایک سانپ باہر نکال لیا اور بولی۔

"اگر تم یہاں سے باہر نہ گئے تو میں سانپ سے ڈسوا دوں گی۔ یہ اتنا زہریلا سانپ ہے کہ تم کھڑے کھڑے پگھل جاؤ گے۔"

پاروتی کا رومال میرے پاس تھا۔ میں نے رومال جیب سے نکال لیا اور کہا۔

"پاروتی! یہ دیکھو۔ یہ وہ رومال ہے جس میں میں تمہاری لاش کے ٹکڑے ڈال کر کیلاش پربت کے تالاب پر لایا تھا۔ اس میں تمہارے جسم کی بو ہے۔ تم اپنے فلک سانپ مجھ پر پھینک دو۔"

میں پاروتی کی طرف بڑھا تو اس نے سانپ مجھ پر پھینک دیا۔ سانپ میرے بچے سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ میں نے رومال اس کی طرف کر دیا۔ سانپ اسی وقت کنڈلی مار کر اب سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

"یہ دیکھو۔ یہ تمہارے جسم کی بو کا کرشمہ ہے کہ سانپ نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ تم پاروتی ہو۔ راج گرو نے تم پر جادو کر کے تمہاری یادداشت غائب کر دی ہے۔"

مگر پاروتی پر میری کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں اس کے لئے بالکل اجنبی بن چکا تھا۔ اس نے سانپ کو جھک کر پکڑ لیا اور بولی۔

"تم کوئی مکار سپیرے ہو۔ یہ میرا رومال نہیں ہے۔ تم اس پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا ہے جس کی وجہ سے سانپ تمہارے آگے جھک گیا ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ نہیں تو راج گرو پجاری تمہیں جلا کر راکھ کر دے گا۔"

میں نے سوچا پاروتی کو اس حالت میں قائل کرنے کی کوشش کرنا بیکار وقت ضائع

کرنے اور حالات کو مزید خطرناک بنانے کے مترادف ہو گا۔ مجھے کوئی دوسرا طریقہ سوچنا چاہئے۔ میں نے رومال جیب میں رکھ لیا اور پاروتی سے کہا۔

"اگر دیوی جی! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں تمہیں اپنا دوست سمجھ بیٹھا تھا۔ اصل میں تمہاری شکل میری دوست پاروتی سے بہت ملتی ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں الٹے پاؤں کچھلہ سے نکل گیا۔ باہر آ کر میں نے ساری بات کاپالی کو بتائی۔ وہ کہنے لگی۔

"میں جانتی تھی کہ تم راج گرو پجاری کے منتر کا توڑ نہیں کر سکو گے۔"

میں نے کہا۔ "کاپالی! مجھے کوئی ترکیب بتاؤ جس سے میری دیوداسی کی یادداشت واپس آ جائے اور میں اسے لے کر یہاں سے چلا جاؤں۔"

کاپالی نے کہا۔ "مہاراج! کیا آپ کے پاس ایسا کوئی منتر نہیں ہے جس سے آپ کی دیوداسی کی یادداشت واپس آ جائے؟"

میں نے جواب دیا۔

"اگر میرے پاس کوئی ایسا منتر ہوتا تو میں تمہیں کیوں کہتا۔"

کاپالی مچھروں کی رسی کھولنے لگی۔

"مہاراج! اس وقت یہاں سے چلے چلیں۔ مندر میں جا کر کچھ سوچیں گے۔ پیچھے پجاری راج گرو کو پتہ چل گیا کہ میں غائب ہوں تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔"

ہم مچھروں پر سوار ہو گئے اور برفانی راستوں سے ہوتے ہوئے مندر واپس آ گئے۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ میں اس کے مکان پر ہی رہا۔ رات کو وہ میرے لئے کھانا لے کر آئی تو کچھ پریشان تھی۔ کہنے لگی۔

"راج گرو تمہاری دیوداسی کو ناگن بنا کر اپنے ساتھ ناگ پور لے جا رہا ہے جہاں وہ پاروتی کی مدد سے بڑے مندر میں جمع کیا ہوا سارا سونا نکلوا کر اپنے قبضے میں کر لے گا۔ اس طرح وہ آگے ترچناپلی کے ناگ مندر میں جا کر وہاں بھی جتنا سونا اور ہیرے جواہرات ہیں وہ اپنے قبضے میں کر لے گا۔ یہ مہاپاپ ہے۔ میں یہ پاپ نہیں ہونے دوں

Prepared By: S.Sohail Hussain

گی۔"

مجھے ناگ مندر یا تریتا پلی کے مندروں کے سونے اور ہیرے جواہرات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان مندروں کے خزانے چاہے چور لے جائیں یا راج گرو لے جائے۔ میں تو صرف پاروتی کو وہاں سے کسی طرح نکال کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تاکہ شہر میں جا کر اس کا علاج کرواؤں کہ شاید اس کی یادداشت واپس آ جائے۔ اس وقت کانچی بھی پاروتی کو وہاں سے فرار کروانے میں میری مدد کرنے پر مجبور تھی۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اگر ان مندروں کا سارا خزانہ راج گرو نکال کر لے گیا تو دیوتا اس سے ناراض ہو کر اسے بددعا دیں گے کہ اس نے یہ معلوم ہوتے ہوئے کہ راج گرو پجاری ان مندروں کا خزانہ چرانے والا ہے اس کو روکنے کا کوئی جتن کیوں نہیں کیا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"اب تو پاروتی دیوداسی کا یہاں سے غائب کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

کانچی سخت پریشان تھی کہنے لگی۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ پجاری دولت کی ہوس میں پاگل ہو گیا ہے۔ اگر میں نے ان مندروں کی دولت کو نہ بچایا تو مجھ کو دیوتاؤں کی بددعا لگ جائے گی۔"

میرا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ میں نے کہا۔

"تو پھر پاروتی کو غائب کرنے کی کوئی ترکیب سوچو۔ اس کو ہوش میں ہم نکل کر نہیں لے جا سکتے۔ اسے کسی طرح بے ہوش کرنا پڑے گا اور یہ کام تم کر سکتی ہو۔"

کانچی کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"بھنگا دیوداسی پاروتی کے لئے رات کا کھانا لے کر جاتی ہے۔ وہ میری سہیلی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس سے کیا ہو گا؟"

کانچی بولی۔ "میں اس کے ساتھ مل کر پاروتی کے کھانے میں ایک ایسا سلوف ملا دوں گی، جس کے بعد وہ کھانا کھاتے ہی بے ہوش ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ کام تو تم بھنگا دیوداسی کو اپنے ساتھ ملائے بغیر بھی کر سکتی ہو۔ اس کو اعتماد میں لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اس نے راج گرو کو بتا دیا اور وہ کسی پاروتی کو لے دیا تو تمہاری خیر نہیں ہو گی۔"

کانچی غور کرنے لگی۔ بولی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ کام میں بھنگا کو بتائے بغیر بھی کر سکتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "راج گرو پاروتی کو یہاں سے ناگ پور کب لے جانے والا ہے؟"

اس نے بتایا کہ پرسوں رات کو وہ اسے لے کر یہاں سے نکل جائے گا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم وہ سلوف تیار رکھو۔ کل رات ہوتے ہی جب بھنگا پاروتی کے لئے کھانا لے کر جائے تو موقع پا کر کھانے میں سلوف ملا دینا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکل کر پچھلے پر پہنچ جائیں گے اور بے ہوش پاروتی کو اٹھا کر فرار ہو جائیں گے۔"

کانچی کہنے لگی۔

"ہاں۔ تمہارے ساتھ مجھے بھی یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ کیونکہ پجاری کو ضرور میری سازش کا پتہ چل جائے گا اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

ہم نے سارا پروگرام طے کر لیا۔ ایک فائٹو بجر اصطبل میں پہلے سے تیار کر لیا۔ اس پر وہ کمبل بھی ڈال دیئے۔ رات کو کانچی نے مجھے آ کر یہ خوش خبری سنائی کہ بھنگا کھانا لے کر پاروتی کی کوٹھڑی میں چلی گئی ہے اور اس نے کھانے میں بے ہوشی کا سلوف ملا دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ اس سلوف کا اثر کتنی دیر تک رہے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ پاروتی دو تین گھنٹوں کے بعد ہی ہوش میں آ جائے۔ ہم راستے میں ہوں گے۔ اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ شور مچا کر بھاگ جائے گی اور واپس راج گرو کے

Prepared By: S.Sohail Hussain

پاس پہنچ جائے گی۔"

کانچی نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ بے ہوشی کے سفوف کا اثر ساری رات اور سارا دن رہے گا۔ اتنی دیر میں ہم ان پہاڑیوں سے نکل کر کسی شہر یا قصبے میں پہنچ گئے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "تم سفوف اپنے پاس ہی رکھنا۔ اگر راستے میں پاروتی کو ہوش آنے لگا تو ہم یہ سفوف پانی میں گھول کر اس کے حلق میں ٹپکا دیں گے۔"

کانچی بولی۔ "تم نے ٹھیک کہا ہے۔ میں بے ہوشی کا سفوف اپنے پاس رکھ لیتی ہوں۔ ایسا کرو۔ تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں سفوف کی ڈبی لے کر ابھی آتی ہوں۔"

کانچی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد آئی اور کہا۔

"میں سفوف کی ڈبی لے آئی ہوں۔ چلو۔ اب اوپر کیلاش کی طرف چلتے ہیں۔"

کیلاش پربت سے یہ میرے فرار کی رات تھی۔

ہم دونوں خچروں پر سوار ہو کر اوپر کیلاش کی طرف چل پڑے۔ ایک خالی خچر ہمارے ساتھ تھا جس پر ہمیں بے ہوش پاروتی کو ڈال کر لے جانا تھا۔ جب ہم کیلاش کی چٹانوں کے پاس پہنچے تو کانچی خچر سے اتر آئی کہنے لگی۔

"تم یہاں خچروں کو لے کر ایک طرف کھڑے رہو۔ میں کیلاش میں جا کر صورت حال کا پتہ کرتی ہوں۔"

میں وہیں خچروں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کانچی برف پوش چٹانوں کے درمیان جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ آتے ہی کہنے لگی۔

"ناگن دیوی بے ہوش پڑی ہے۔ جلدی سے خچر لے آؤ۔"

میں خچر کی باگ پکڑ کر کانچی کے پیچھے پیچھے کیلاش کے شگاف کے پاس آیا۔ خچر کو باہر چھوڑا اور ہم دونوں کیلاش میں آ گئے۔ دیکھا کہ چراغ جل رہا تھا اور پاروتی بے ہوش پڑی تھی۔ ہم اسے اٹھا کر باہر لے آئے۔ اسے خچر پر بڑے آرام سے اس طرح بٹھا دیا

کہ وہ ہوش میں ہو اور خود بھی ہوش میں ہو۔ کانچی نے کہا۔

"مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا۔ ورنہ یہ راستے میں گر پڑے گی۔"

اس کا خیال ٹھیک تھا۔ کانچی بے ہوش پاروتی کے پیچھے اس طرح بیٹھ گئی کہ اس نے اسے ایک ہاتھ سے تھام کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں خچر کی باگ تھام لی۔ میں دوسرے خچر پر بیٹھ گیا۔ تیسرے خالی خچر کو ہم نے وہیں چھوڑنے کی بجائے ساتھ ہی لے لیا اور یوں ہمارا قافلہ کیلاش پربت کی پہاڑیوں سے نیچے کی طرف چل پڑا۔

باقی ساری رات ہم برفانی راستوں پر چلتے رہے۔ صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو ہم کافی نیچے اتر آئے تھے۔ اب برف اتنی زیادہ نہیں تھی اور سبز پہاڑیاں شروع ہو گئی تھیں۔ کانچی نے یہاں پہنچ کر راستہ تبدیل کر لیا۔ کہنے لگی۔

"صبح کو اگر پجاری کو ہمارے فرار کا پتہ چل بھی گیا اور وہ ہمارے پیچھے آیا تو جس راستے پر اب میں تمہیں لے جا رہی ہوں اس طرف وہ کبھی نہیں آئے گا۔"

یہ نیا پہاڑی راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ جگہ جگہ گھاٹیاں اور خشک نالے تھے۔ خچر آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ راستے میں ہم نے ایک جگہ بیٹھ کر بے ہوشی سے بیٹھتے کیلاش پاروتی کو ہم نے وہیں پتھروں پر لٹا دیا تھا۔ وہ بالکل بے ہوش تھی۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! تمہارے خیال میں ہمیں اسے کہاں لے جانا چاہئے جہاں اس کا علاج بھی ہو سکے اور اس کی یادداشت واپس آ جائے۔"

کانچی کہنے لگی۔

"نیچے دوگج میں ایک بوڑھا سپیرا رہتا ہے۔ میں اسے جانتی ہوں۔ وہ تبت میں بھی ایسے لوگوں کا علاج بھی کیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ ناگن دیوی کو ٹھیک کر دے گا۔"

مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے کہا۔

"تو پھر چلو ہم اسی بوڑھے کے پاس چلتے ہیں۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

"میں نے اسی کے پاس جانے کا سوچ رکھا تھا ایک بار ناگن دیوی کی یادداشت واپس آ گئی تو پھر پجاری کے منتر کا اثر اپنے آپ اتر جائے گا اور منتروں تک دیوی کے خزانے محفوظ ہو جائیں گے۔"

باتیں کرنے کے بعد ہم پھر آگے چل پڑے۔ اسی طرح نئے اور دشوار گزار پہاڑی علاقے میں سفر کرتے کرتے ہم شام کے وقت بیروگج پہنچ گئے۔ کانچی وہاں سے مجھے سیدھا بوڑھے تبتی کے گھر لے گئی۔

ایک چھوٹی سی جھاڑی سفید داڑھی والا بوڑھا اپنی کوٹھڑی میں صف پر لیمپ جلائے بیٹھا کوئی پرانی کتاب پڑھ رہا تھا۔ آگے چائے کی چینک اور پیالی پڑی تھی۔ اس نے کانچی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! بہت دنوں کے بعد تم سے ملاقات ہوئی۔ کیلاش پربت سے اب آئی ہو؟ یہ کون ہے؟ اور یہ بے ہوش لڑکی کون ہے؟"

کانچی نے بوڑھے تبتی سے میرا تعارف کرایا۔ پھر پاروتی کے متعلق اسے سارا قصہ بیان کر دیا۔ بوڑھے نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ پاروتی کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ پھر اس کی آنکھیں کھول کر غور سے ان کا معائنہ کیا اور بولا۔

"اس پر تمہارے پجاری نے سنگرینی منتر پڑھا ہے۔ میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔"

بوڑھے نے پاروتی کی ہتھیلی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور اونچی آواز میں کوئی منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ تین چار منٹ تک وہ منتر پڑھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے بے ہوش پاروتی کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بولا۔

"سنگرینی! سنگرینی! میں تاپتی کا داس ہوں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس عورت کے جسم سے نکل جا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس عورت کے جسم سے نکل جا۔"

اس کے ساتھ ہی پاروتی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ جیسے کوئی بات کہہ رہی ہو۔ بوڑھے نے اس کے ہونٹوں کے ساتھ اپنا کان لگا دیا۔ وہ کچھ سن رہا تھا۔ کان پیچھے ہٹا کر بوڑھے نے کانچی کی طرف دیکھا اور

"اونچی بیٹی! سنگرینی نے کہا ہے کہ میں اس عورت کا جسم چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ مگر اس کو اپنی پچھلی زندگی کی باتیں یاد نہیں آ سکیں گی۔"

میں نے کہا۔ "بابا! اس کا کیا فائدہ ہوا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ اس کی یادداشت واپس آ جائے۔"

بوڑھے نے کہا۔

"یہ بات شاید تم دونوں کو معلوم نہیں کہ سنگرینی پر جو منتر پھونکا گیا تھا وہ آتشی دیوی کا منتر تھا۔ سنگرینی اسی منتر کی آتشی دیوی ہے۔ ایک سال کے بعد اس منتر کی آگ نے اس عورت کو جلا کر راکھ کر دینا تھا۔ میرے کہنے سے سنگرینی اس کے جسم سے نکل گئی ہے۔ اب اس عورت پر منتر کی آگ حرام ہو گئی ہے۔ اس کی یادداشت واپس لانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ہوش میں آنے کے بعد تم لوگوں کو بھی نہیں پہچانے گی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں ہو گا کہ اس پر راج گرو پجاری نے منتر پھونکا تھا اور یہ اس کے پاس رہ رہی تھی۔"

یہ ایک اچھی بات ہوئی تھی۔ مگر میں پاروتی کی یادداشت واپس لانا چاہتا تھا۔ میں نے بوڑھے سے پاروتی کی حالت میں تبدیلی دیکھنا چاہتا تھا۔ کانچی نے بوڑھے سے پوچھا۔

"بابا! کیا کسی طریقے سے اس عورت کی یادداشت بھی واپس آ سکتی ہے؟"

بوڑھے نے کہا۔ "ایک منٹ ٹھہرو۔"

اس نے صندوق میں سے ایک پرانی کتاب نکالی اور لیمپ کی روشنی میں اس کے ورق الٹنے شروع کیے۔ ایک جگہ اس نے انگلی رکھ کر کچھ سطریں غور سے پڑھیں اور بولا۔

"ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا ہے بابا؟" کانچی نے جلدی سے پوچھا۔

بوڑھے تبتی نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور بولا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"اس عورت کو لے کر بنارس شہر چلو وہاں چتر دیدی ہم کا ایک پنڈت رہتا ہے۔ وہ شکرتی منتر کا توڑ جانتا ہے۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو اس عورت کو وہی پنڈت ٹھیک کر سکتا ہے۔"

ہم نے وہ رات وہاں رہنے کی بجائے جونپور سے ریل گاڑی پکڑی اور بنارس کی طرف روانہ ہو گئے۔

ریل گاڑی گورکھپور پہنچی تو پاروتی کو ہوش آ گیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ ہوش میں آتے ہی شور مچا دے گی کہ تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟ میں بیچاری راج گرو کی داسی ہوں۔ مجھے اس کی پاس پہنچا دو۔ اس طرح لوگ اکٹھے ہو جاتے اور یہی سمجھتے کہ ہم ایک عورت کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتے اور میں ایک نئی مصیبت میں پھنس جاتی مگر ایک عجیب بات ہو گئی۔ ہوش میں آتے ہی پاروتی نے آنکھیں کھول کر پہلے مجھے دیکھا۔ پھر کاشی کو دیکھا۔ پھر گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو دیکھا اور کہنے لگی۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔ مجھے پیاس لگی ہے۔"

کاشی نے اس وقت تھیلے میں سے میٹھی روٹی نکال کر اسے دی۔ ایک مسافر کی صراحی میں سے پانی پیالے میں ڈال کر اسے دیا۔ پاروتی بڑے آرام سے روٹی کھانے لگی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پاروتی کی اب پجاری راج گرو والی یادیں بھی اس کے ذہن سے غائب ہو گئی تھیں۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ پجاری کے پاس کس کیفیت میں رہتی تھی۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ وہ مجھے بالکل ایک نئی عورت لگ رہی تھی جس کو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ روٹی کھانے کے بعد پاروتی نے پانی پیا اور بولی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

اور وہ جس پہلے لیٹی ہوئی تھی وہیں لیٹ گئی اور سو گئی۔ کانچی کہنے لگی۔

"یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ اسے مکار پجاری راج گرو بھی یاد نہیں رہا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ اس کی زندگی شمشیری کے متر کی آگ سے محفوظ ہو گئی ہے۔ اس کمینے پجاری نے یہی سوچا تھا کہ جتنا عرصہ میں اس کی مدد سے منتروں اور خزانوں کی دولت سمیٹ سکتا ہوں سمیٹ لوں اس کے بعد اگر شمشیری متر کی وجہ سے اس کا جسم جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو بے شک راکھ ہو جائے۔"

کانچی کہنے لگی۔

"اب بھگوان کرے کہ بنارس والا پنڈت اس کو ٹھیک کر دے۔ اس کی پرانی یادداشت واپس آ جائے۔"

میں نے کہا۔ "اور یہ پجاری کو بھی بھول جائے۔"

"پرانی یادداشت واپس آ گئی تو پجاری کو یہ اپنے آپ بھول چکی ہو گی۔"

کانچی نے یہ کہہ کر پاروتی کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔

"تم پہلے کبھی بنارس گئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "شہر کے اندر کبھی نہیں گیا۔ ریل گاڑی میں ایک بار شہر کے قریب سے گزرا ضرور تھا۔"

کانچی بولی۔ "میں نے بنارس میں ایک سال گزارا ہے۔ میں اس شہر کے سارے گلی کوچوں سے واقف ہوں۔ یہ پنڈت چترویدی ضرور کوئی مشہور پنڈت ہو گا۔ بنارس شہر میں ایسے پنڈتوں کی کمی نہیں ہے۔ وہاں سے ہمیں اس کے گھر کا پتہ چل جائے گا۔"

میں اس اعتماد سے مطمئن ہو گیا تھا کہ پاروتی کو ہوش آ گیا ہے اور ہوش میں آنے کے بعد وہ مکار پجاری کی ساری یادیں بھول چکی ہے۔ ورنہ وہ شور مچا کر ہم سب کو حوالات میں بند کرا سکتی تھی۔ یہ بہت ہی سخت مرحلہ تھا جو آسانی سے گزر گیا تھا۔

اس کے لئے میں آج بھی ہنگلاج میں پاروتی ماتا کی کھلی لکھ رہا ہوں اس بڑے جنتی کا شکر گزار ہوں۔

گورکھپور سے ہم نے ٹرین بدلی اور بنارس جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اس دوران پاروتی جاگ پڑی تھی اور چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھی خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی کو بھی نہیں پہچانتی تھی۔ اس کے لئے سارا ماحول اجنبی تھا۔ وہ کوئی بات بھی نہیں کرتی تھی۔ جس وقت بات کرنے کی بہت سخت ضرورت ہوتی تو صرف ایک بات کرتی اور خاموش ہو جاتی۔ جب ہم گورکھپور کے سٹیشن پر بنارس جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے پاروتی سے کہا۔

"پاروتی! کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟"

وہ میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے اسے ماضی کے کئی ایک واقعات یاد دلائے۔ مگر پاروتی کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہ ابھرا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے میری کوئی بات نہ سنی ہو۔ کانچی نے مجھے آنکھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور میں نے اس کے بعد پاروتی سے کوئی بات نہ کی۔

ٹرین دوپہر کے بعد بنارس پہنچی۔ پاروتی جاگ رہی تھی۔ اس نے نہ مجھ سے پوچھا نہ کانچی سے پوچھا کہ یہ کونسا شہر ہے۔ ہمارے ساتھ خاموشی سے ڈبے سے اتر کر سٹیشن سے باہر آ گئی۔ وہ اپنے آپ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔ لیکن بھاگنا تو دور کی بات ہے وہ ہم سے الگ بھی نہیں ہوتی تھی۔ کانچی کے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ کانچی نے ایک دو بار اس سے بات بھی کی لیکن پاروتی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بنارس پہنچنے کے بعد کانچی ہمیں ایک محلے میں لے گئی جس کی ایک تنگ سی گلی میں اس کی ایک سہیلی رہتی تھی۔ وہاں ہم تھوڑی دیر ٹھہرے۔ کانچی نے اس سے پنڈت چترویدی کے بارے میں پوچھا۔ اس کی سہیلی نے کہا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"یہ پنڈت تو سادھوؤں کے ساتھ رہتا ہے۔ تم اس کے پاس کیوں جا رہی ہو؟"

کانچی نے پاروتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ اس کو بیماری لگ گئی ہے یا کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ یہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ کسی سے بات نہیں کرتی۔ پنڈت جی سے ہم اس کا علاج کرانے آئے ہیں۔"

کانچی کی سہیلی نے بڑے غور سے پاروتی کو دیکھا اور کہا۔

"یہ پنڈت شہر سے باہر دریا کی ساتویں گھاٹ کے پیچھے ایک جھونپڑی میں رہتا ہے وہ کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ بس جھونپڑی میں ہی سارا دن گزار دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ رات کے اندھیرے میں دریا پر جاتا ہے اور ایک ٹانگ دریا میں کھڑی کر کے کوئی چلہ کاٹتا ہے۔"

میرے لئے یہ باتیں کوئی انوکھی نہیں تھیں۔ بھارت میں میں نے تقریباً ہر سادھو جوگی سنیاسی کو اس قسم کی واہیات حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ کانچی کو بھی کوئی حیرانی نہ ہوئی تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ہم پاروتی کو لے کر دریائے گنگا کے ساتویں گھاٹ پر آ گئے۔ بنارس کے باہر دریائے گنگا کے کنارے کئی گھاٹ ہیں۔ ہر گھاٹ کو کسی نہ کسی جوگی نے سنبھال رکھا ہے وہیں ضعیف الاعتقاد ہندو مرد اور عورتیں اس جوگی کے پاس آ کر اس کو اپنی دنیاوی مشکلیں بیان کرتی ہیں اور جوگی ان سے روپے پیسے لے کر ان کی مشکلات کے لئے سیدھے حل بتا دیتا ہے جن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اگر ان میں سے کسی ایک عورت یا مرد کی مشکل اس کی اپنی کوشش کے نتیجے میں حل ہو جاتی ہے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ جوگی سادھو کی وجہ سے اس کی مشکل آسان ہوئی ہے اور یوں جوگی کی مشہوری ہوتی رہتی ہے۔

ساتواں گھاٹ دریا کے جنوب میں درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب تھا۔ ان درختوں میں ہمیں ایک جھونپڑی نظر آئی۔ کانچی نے کہا۔

"ضرور یہی پنڈت جی کی جھونپڑی ہو گی۔ چلو چل کر پتہ کرتے ہیں۔"

پاروتی خاموش کھڑی یہاں ہماری باتیں سن رہی تھی۔ جیسے اسے ہماری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جیسے ہم کسی ایسی زبان میں باتیں کر رہے ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ ہم جھونپڑی کی طرف آ گئے۔ یہاں ایک بوڑھا ہمیں دریا کی طرف جاتا ملا۔ کانچی نے اس سے پوچھا۔

"بابا پنڈت چترویدی کی جھونپڑی یہی ہے؟"

بوڑھے نے کان کو ہاتھ لگا کر کہا۔

"یہی ہے۔"

اور یوں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے نکل گیا جیسے خوف زدہ ہو گیا ہو۔ پنڈت کی جھونپڑی کے آگے ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

"پنڈت جی پرنام!"

اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دوسری بار آواز دی۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے پنڈت جی اندر نہیں ہیں۔"

تب کانچی نے آواز دی تو اندر سے کسی نے غصیلی آواز میں جھڑک کر کہا۔

"کون ہو تم جو مجھے تنگ کرنے آ گئے ہو چلے جاؤ یہاں سے۔"

میں نے کہا۔ "پنڈت جی! ہم بڑی دور سے آپ کے درشنوں کو آئے ہیں۔"

کانچی نے بھی کہا۔ "گورو دیو! ہم کیلاش پربت سے چل کر آئے ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ اس کے بعد پنڈت جی کی آواز آئی۔

"آ جاؤ اندر۔"

میں کانچی اور پاروتی پردہ ہٹا کر جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ جھونپڑی میں لوبان جل رہا تھا۔ ایک طرف سادھوؤں کی پنڈیاں قطار میں پڑی تھیں۔ ایک موٹا تازہ بھاری تندوالا آدمی صرف دھوتی باندھے، شانوں پر گرم چادر ڈالے چوکڑی مار کر اس طرح

Prepared By: S.Sohail Hussain

بیٹھا تھا جیسے گیان دھیان میں مصروف ہو۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ پنڈت چترویدی تھا۔ اس نے ہماری طرف بے نیازی سے دیکھا۔ ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ یوں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس کا اس ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو۔

پنڈت نے پوچھا۔

"کس لئے آئے ہو۔ جلدی بتاؤ۔"

کانچی نے بات شروع کی۔ اس نے پنڈت کو بتایا کہ پاروتی میری چھوٹی بہن ہے۔ اس کے سر پر درخت گرنے کی وجہ سے چوٹ لگ گئی تھی۔ تب سے یہ چپ ہو گئی ہے۔ بہت کم بات کرتی ہے اور اسے کچھ یاد نہیں رہا کہ یہ کون ہے۔ اس کی یادداشت غائب ہو گئی ہے۔ پنڈت چترویدی نے پاروتی کو اپنے قریب بلایا۔ پاروتی خاموشی سے اٹھ کر پنڈت کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ پنڈت نے پاروتی کے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ کو ناک کے پاس لے جا کر سونگھا۔ میں پنڈت کے چہرے کو تک رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر اچانک ایک تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔

پنڈت نے پاروتی کو بے نیازی سے کہا۔

"پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاؤ۔ چلو۔"

پاروتی ہمارے پاس آ کر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ پنڈت نے ایک پوتھی نکالی۔ اس کو غور سے پڑھا۔ پھر خالی کاغذ پر چند ایک لکیریں ڈال کر ان لکیروں کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ میں اور کانچی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ پنڈت نے پوتھی ایک طرف رکھ دی اور کانچی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"تمہاری بہن پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے اس کی یادداشت درخت کے گرنے کی وجہ سے گم نہیں ہوئی۔"

میں نے فوراً کہا۔

"مہاراج! آپ بہت بڑے گیانی ہیں۔ میری بہن کو ٹھیک کر دیں۔ ہم بڑی آس لگا کر اتنی دور سے آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ ہی اسے ٹھیک کر سکتے ہیں۔"

پنڈت نے آنکھیں بند کر لیں۔ گہرا سانس لیا۔ ایک اور گہرا سانس لیا۔ آنکھیں کھول کر پاروتی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"میں نے اس بچی پر کئے گئے جادو توڑنے کا توڑ معلوم کر لیا ہے۔"

ہم بڑے خوش ہوئے۔ پنڈت نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"لیکن اس کے لئے مجھے اس پر خاص چلہ کرنا ہو گا۔ یہ چلہ تین راتوں کا ہو گا۔"

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کانچی نے جھٹ کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے مہاراج! آپ یہ چلہ ضرور کریں ہماری بہن کو کسی طرح اچھا کر دیں۔ اس کی یادداشت واپس آ جائے۔ ہم آپ کی بڑی سیوا کریں گے۔"

پنڈت نے ایک بار پھر دو گہرے سانس لئے اور بولا۔

"آج رات تم اس بچی کو میری جھونپڑی میں چھوڑ کر خود دریا کے گھاٹ پر چلے جانا۔ دوسری رات بھی ایسا ہی کرنا۔ تیسری رات بھی یہی عمل دہرایا جائے گا۔ بھگوان نے چاہا تو تیسری رات کے بعد تمہاری بہن کی یادداشت واپس آ جائے گی۔ چلو جاؤ۔ اب یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ مجھے گیان دھیان کرنا ہے۔"

پنڈت نے آنکھیں جھپک کر جھونپڑی سے باہر نکال دیا۔ میں تذبذب میں تھا۔ کانچی کہنے لگی۔

"تم دیکھ لینا اب پاروتی دیوی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ پنڈت بڑا گیانی دھیانی آدمی لگتا ہے۔"

میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں رات کے وقت اس پنڈت کے پاس پاروتی کو اکیلا چھوڑوں مگر دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اوپر سے کانچی کا بھی مجھ پر دباؤ تھا۔ یہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے یہ پنڈت اپنے منتر منتر سے پاروتی پجاری کے ہو گئے منتر پھونکا ہوا ہے اس کا جادو ٹوٹ جائے اور پاروتی پھر سے نارمل حالت میں آ جائے دل نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے دل کے اشاروں پر عمل نہ کرتے ہوئے پاروتی کو پنڈت کی جھونپڑی میں تین راتیں بسر کرنے کی اجازت دے دی۔ رات کے وقت ہم بنارس شہر سے نکل کر پنڈت کی جھونپڑی پر آ گئے۔

لگتا تھا کہ وہ پہلے سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے پاروتی کو ہمارے سامنے جھونپڑی کے فرش پر بچھی ہوئی ہرنی کی کھال پر آلتی پالتی مار کر بٹھا دیا۔ پیتل کی تھالی میں لڈو سجا دیا اور خود بھی اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ہمیں کہا کہ ہم دریا کے گھاٹ پر چلے جائیں اور سورج نکلنے کے بعد آ کر پاروتی کو لے جائیں۔ ہم پاروتی کو پنڈت کی جھونپڑی میں اکیلی چھوڑ کر دریا کے گھاٹ پر آ کر ایک خالی چبوترے پر بیٹھ گئے۔ یہاں سے ہمیں دور گھنے درختوں کے بیچ جھونپڑی کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھونپڑی کے دروازے کو دیکھ لیتا تھا۔ جھونپڑی پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

دریا کے اس ساتویں گھاٹ پر دن بھر مسافروں سے بھری ہوئی کشتیاں آتی جاتی رہیں۔ ہم نے ایک کھوکھے کے باہر بیٹھ کر دوپہر کو تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ گنگا کے دریا کی سطح سنہری ہو رہی تھی۔ بنارس شہر کی عمارتوں پر بھی ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ سورج کی روشنی آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئی۔ میں اور کاچی دونوں چبوترے پر بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی وقت ہم پنڈت کی جھونپڑی پر نگاہ ڈال لیتے تھے۔ جھونپڑی رات کے اندھیرے میں بے معلوم سی نظر آ رہی تھی۔ میری طبیعت کو نہ جانے کیوں ایک بے چینی سی لگ گئی تھی۔ میں اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کاچی نے پوچھا۔

"کیا بات ہے تم مجھے پریشان لگ رہے ہو۔"

میں آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کاچی! یہ پنڈت کہیں کوئی بدمعاش آدمی تو نہیں ہے؟"

کاچی نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔

"یہ آدمی اگر ایسا ہوتا تو سارے بنارس شہر میں بدنام ہو گیا ہوتا۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ میری سہیلی نے بھی اس کے بارے میں بری رائے نہیں دی تھی۔"

"مگر جو بوڑھا ہمیں راستے میں ملا تھا اس نے تو پنڈت کی جھونپڑی کی طرف اشارہ کر کے ہاتھوں کو ہاتھ لگایا تھا۔"

کاچی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ پنڈت نے قسم قسم کے زہریلے سانپ پال رکھے ہیں اور وہ کسی سے نہیں ملتا۔ اس لئے لوگ اس سے ڈرنے لگے ہیں۔ اس کے سوا کوئی بات نہیں ہے۔ بے فکر ہو کر بیٹھو۔ تم دیکھ لینا پاروتی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر پجاری راج گرو کا منتر اس پر کبھی نہیں چل سکے گا اور ہاگ پور ترینا پلی کے مندروں کے خزانے محفوظ ہو جائیں گے۔"

کاچی کو اپنے مندروں کے خزانوں کی پڑی تھی اور مجھے پاروتی کی فکر تھی کہ پنڈت اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کر بیٹھے۔ پاروتی نے تو آگے سے کچھ بولا ہی نہیں تھا۔ کبھی خیال آتا کہ یہ پنڈت چھٹا ہوا بدمعاش ہے اور کبھی خیال آتا کہ نہیں۔ پنڈت بڑا پارسا اور پاکباز آدمی ہے۔ اسی کش مکش میں کبھی میں اٹھ کھڑا ہوتا۔ دو قدم دریا کے کنارے ٹہلتا اور کبھی کاچی کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ کاچی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"آخر تمہیں کونسی چیز اتنی پریشان کر رہی ہے؟"

میں نے صاف صاف کاچی کو اپنے دل کی کیفیت بیان کر دی۔ اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"خبردار پنڈت بڑا رشی منی ہے۔ اس کے بارے میں ایسے خیال دل میں مت لانا۔ اس کی شہرت ایسی نہیں ہے۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

اسی الجھن میں رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ کھلے پر بھی خاموشی طاری تھی۔ دریا کا پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں دریا کے دوسرے کنارے پر بنارس شہر کے مکانوں کی روشنیاں کہیں کہیں جھلملا رہی تھیں۔ ان کا عکس بھی دریا کے پانی میں جھلملا رہا تھا۔

جب آسمان پر پچھلے پہر کی نیلی روشنی پھیلنے لگی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"مجھے مت روکنا۔ میں پاروتی کو دیکھنے جھونپڑی میں جا رہا ہوں۔"

اور میں اٹھ کر تیز تیز قدموں سے جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔ کانچی بھی میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہ مجھے روک رہی تھی۔ مگر میں نے اس کی بالکل پروا نہ کی۔ اور جھونپڑی کے پاس جاتے ہی ٹاٹ کا پردہ اٹھا دیا۔ جھونپڑی خالی پڑی تھی۔ وہاں صرف تھا۔ تھالی میں لوبان سلگ سلگ کر ختم ہو گیا تھا۔ وہاں نہ پنڈت تھا اور نہ پاروتی۔

میں نے غصے میں چلا کر کہا۔

"کانچی! جھونپڑی خالی ہے۔ تمہارا رشی ہی پنڈت پاروتی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔"

کانچی بھی جھونپڑی میں آ گئی۔ حیران نظروں سے خالی جھونپڑی کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور باہر چلا گیا ہو گا۔"

ہم نے دیکھا کہ جھونپڑی کی عقبی دیوار کا گھاس پھوس ایک جگہ سے ہٹا ہوا تھا اور وہاں ایک سوراخ بنا ہوا تھا۔ میں نے پنڈت کو گالی دی اور کانچی سے کہا۔

"وہ یہاں سے پاروتی کو بھگا کر لے گیا ہے سامنے سے اس لئے نہیں گیا کہ ہم اسے دیکھ لیں گے۔"

ہم دیوار کے شگاف میں سے نکل کر جھونپڑی کی دوسری طرف آ گئے۔ رات کے اندھیرے میں وہاں گہرا سناٹا تھا۔ کسی طرف کوئی نہیں تھا۔ میں نے پاروتی کو دو تین

آوازیں دیں۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ پاروتی میری آواز کا جواب نہیں دے گی۔ لیکن میں غصے اور پریشانی کی حالت میں تھا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"وہ حرامی پنڈت زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہئے۔ کہ میرے ساتھ۔"

کانچی بھی حیران و پریشان تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پنڈت پاروتی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ جھونپڑی کے پیچھے اندھیرے میں کہیں کہیں درخت تھے۔ دور شاید سڑک کی بتیاں تھیں جو روشن تھیں۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"وہ کوئی سڑک معلوم ہوتی ہے۔ جلدی سے آؤ۔"

ہم تیز تیز چلتے درختوں اور اونچے نیچے ٹیلوں سے گزرتے سڑک پر آ گئے۔ سڑک ٹوٹی پڑی تھی۔ میرا دماغ کھول رہا تھا۔ میں سخت طیش کی حالت میں تھا کہ پنڈت کہیں مل جائے تو میں اس کی گردن اتار دوں۔ مگر میں مجبور تھا۔ اتنے میں ایک طرف سے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔

اردو پوئنٹ ڈاٹ کام

Prepared By: S.Sohail Hussain

یہ ایک بس کی روشنیاں تھیں جو ہمارے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہم بس سٹاپ پر کھڑے تھے۔ میں نے کاچی سے کہا۔

"بس بس میں بیٹھ جاتے ہیں۔ پنڈت آگے گیا ہو گا۔"

بس میں مزدور پیشہ لوگ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ یہ بس صبح سے اندھیرے مزدوروں کو لے کر کارخانوں کی طرف جا رہی تھی۔

کاچی نے کہا "نہیں نہیں۔ ہم آگے نہیں جائیں گے۔"

بس بمشکل ایک دو سیکنڈ رکی اور آگے چل دی۔ کاچی کہنے لگی۔

"ہمیں سب سے پہلے شہر چل کر پنڈت کو تلاش کرنا ہو گا۔ وہ اتنی جلدی یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔"

میں نے کہا "ہمیں کیا معلوم کہ وہ پاروتی کو لے کر کب کا یہاں سے نکل چکا ہے؟"

کاچی نے میرا بازو پکڑا اور مجھے کھینچتے ہوئے دریا کے گھاٹ کی طرف چلنے لگی۔

"ہم شہر میں اپنی سکھی کے پاس جا کر معلوم کرتے ہیں۔ اسے پنڈت کے ٹھکانوں کا ضرور علم ہو گا کہ وہ کہاں کہاں جا سکتا ہے؟"

ہم ایک گھاٹ پر کشتی میں بیٹھ گئے۔ دریا پار کر کے بنارس شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کی گلیوں کے مندروں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ لوگ پوجا پاٹھ کے لئے گھروں سے

نکل کر دریا کی طرف چل پڑے تھے۔ کاچی کی سکھی بھی جاگ رہی تھی۔ جب ہم نے اسے بتایا کہ بدمعاش پنڈت پاروتی کو اغوا کر کے فرار ہو گیا ہے تو اسے یقین نہ آیا۔ کہنے لگی۔

"اس سے پہلے ہم نے پنڈت کے بارے میں ایسی کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ آپ لوگوں کو ضرور کوئی مغالطہ ہوا ہے۔ وہیں جا کر تلاش کرو۔ پنڈت دریا پر کہیں ہو گا۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ پنڈت کی بھونپڑی کی مٹی دیوار میں شگاف پڑا ہوا ہے اور وہ وہیں سے پاروتی کو لے کر فرار ہوا ہے تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"ہم نے سنا ہے کہ پنڈت کبھی کبھی ناگ پور کے مہاناگ مندر میں یاترا کرنے چلا کرتا تھا۔ وہ ضرور وہیں گیا ہو گا۔"

بھارت کے ملک میں اپنی آوارہ گردیوں اور جنگل جنگل شہر شہر پھرنے کے دوران مجھے کافی شہروں سے واقفیت ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"ناگ پور تو یہاں سے بہت دور ہے۔"

کاچی کی سکھی نے کہا۔

"میرا من کہتا ہے کہ پنڈت ضرور پاروتی کو لے کر ناگ پور ہی گیا ہو گا۔ اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" کاچی نے پوچھا۔

اس کی سکھی کہنے لگی۔

"ناگ پور کے مہاناگ مندر میں ایسی دیوداسیاں رکھی جاتی ہیں جو سانپوں کی پوجا کرتی ہیں۔ یہ دیوداسیاں مندر کے پجاری دوسرے شہروں سے عورتوں کو اغوا کر کے لاتے ہیں۔ عام طور پر یہ ایسی عورتیں ہوتی ہیں جن کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا۔ مندر کا مہنت پجاری ایسی عورتوں کو بھاری رقم دے کر خرید بھی لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے پاروتی کو دیکھ کر پنڈت کے دل میں خیال آ گیا ہو کہ کیوں نہ اسے ناگ پور کے مندر میں لے جا کر فروخت کر دیا جائے۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

کانچی کی سہیلی نے کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ لیکن ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ جب میں نے کانچی کی سہیلی سے کہا۔

"کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ پنڈت یہیں کسی جگہ چھپا ہوا ہو؟"

اس کے جواب میں وہ عورت بولی۔

"کسی عورت کو اغوا کر کے وہ اس شہر میں کبھی نہیں رہے گا۔ میری بہنو تم لوگ ہاگ پور جاؤ۔ وہ تمہیں وہیں ملے گا۔ اب یہ میں نہیں بتا سکتی کہ تمہاری پاروتی بھی اس کے پاس ہو گی یا نہیں؟"

کانچی کو بھی معلوم تھا کہ ہاگ پور کا شہر بنارس سے بہت دور ہے اور ہمارے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ اس نے اپنی سہیلی سے کچھ روپے ادھار مانگے تو وہ بولی۔

"میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ میں کسی کو ادھار بھی دے سکوں۔"

ہم مایوس ہو گئے۔ اس کی سہیلی نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! تم تو مندر کی دیوداسی ہو۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ بھارت کی ریل گاڑیوں میں سفر کرنے والے سادھو جوگی اور جوگنوں سے کوئی ٹکٹ نہیں پوچھتے۔ تم لوگ جوگی جوگن بن کر ہاگ پور کیوں نہیں جاتے؟"

کانچی کی سہیلی نے بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔ اس طریقے سے ہمارا حلیہ بھی بدل جاتا اور پنڈت اگر وہاں ہوا تو وہ ہمیں پہلی نظر میں پہچان کر فرار ہونے کی بھی کوشش نہیں کرے گا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! تمہاری سہیلی نے بڑا اچھا مشورہ دیا ہے۔ ہم جوگی جوگن بن کر سفر کریں گے۔ اس طرح پنڈت بھی ہمیں اتنی جلدی نہیں پہچان سکے گا۔"

کانچی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔"

کانچی کے گھر میں ہی ہم نے جوگی جوگنوں والا لباس پہن لیا۔ کانچی نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہن لی۔ بال کھول لئے۔ گلے میں رنبھوں کی مالا پہن لی۔ جب ہم

کانچی کی سہیلی کے گھر سے نکلے تو دن کافی ڈھل آیا تھا۔ ہم دونوں بھوکی اور جوگن بنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں کرمنڈل تھے۔ میرے ہاتھ میں ترشول بھی تھا۔ ماتھوں پر راکھ مل کر تلک لگایا ہوا تھا۔

ہم وہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن پر آ گئے۔ یہاں ایک بابو سے پوچھا کہ ہاگ پور کو کونسی گاڑی جاتی ہے۔ اس نے دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کو پڑھ کر بتایا کہ ہاگ پور کو گاڑی ایک گھنٹے بعد جائے گی۔ ٹکٹ ہم نے نہیں لئے تھے۔ کیونکہ جیسا کہ کانچی کی سہیلی نے بتایا تھا اور میرا بھی تجربہ تھا بھارت ریل گاڑیوں میں سفر کرنے والے لفنگے، جوگی، سادھو اور بابا لوگ ٹکٹ نہیں خریدتے۔ انہیں ریلوے ٹکٹ معاف ہوتا ہے۔ ہم پوچھتے پوچھتے اس پلیٹ فارم پر آ گئے جہاں سے ہاگ پور جانے والی گاڑی نے چلنا تھا۔ پلیٹ فارم پر بہت سے مسافر اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ ٹرین ابھی نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔

گاڑی نے پیچھے کلکتہ جبل پور سے آنا تھا۔ اپنے وقت پر گاڑی چھک چھک کرتی پلیٹ فارم میں داخل ہو کر رک گئی۔ وہاں شور مچ گیا۔ مسافروں میں دھکم پیل شروع ہو گئی۔ ہم ایک ڈبے میں داخل ہوئے۔ وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہندو لوگ جوگی جوگنوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمیں کوئی بددعا نہ دے دیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جوگی کی بددعا کبھی خالی نہیں جاتی۔ چنانچہ کوئی جوگی کسی کے گھر چلا جائے تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ہمیں کھڑے دیکھ کر دو مسافر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں بڑی عزت و تکریم کے ساتھ اپنی سیٹوں پر بٹھا دیا۔ ہم بھی بڑے مزے سے بیٹھ گئے۔ سادھو اور جوگی لوگ ہندوستان میں ہر جگہ مل جائیں گے۔ اسی طرح گائے اور بیل بھی بھارت کے شہروں میں عام چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے آوارہ بیل نظر آ جائیں تو لوگ فوراً اسے ذبح کر کے کھا جائیں۔ مگر ہندو لوگ ایسا نہیں کرتے۔ وہ گائے کو گئو ماتا اور بیل کو وشنو بھگوان کا اوتار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہندی بیل وسطی ہند میں ہندوؤں کا

Prepared By: S.Sohail Hussain

ایک دیوتا بھی بتایا جاتا ہے جس کی پوجا ہوتی ہے۔

ٹرین چل پڑی۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہمیں ان مسافروں کی وجہ سے راستے میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ یہ ایک رات' ایک دن اور پھر پوری ایک رات کا سفر تھا۔ دوسری رات کی صبح کو معلوم ہوا کہ ناگ پور قریب آ رہا ہے۔ سارا رستہ مسافروں نے ہمیں خوب کھلایا پلایا۔ پہلے مسافر اتر جاتے تو دوسرے مسافر آ کر ہماری خدمت شروع کر دیتے۔ آخر گاڑی ناگ پور پہنچ گئی۔ ناگ پور بھارت کے وسط میں واقع ہے۔ یہاں کے ناگ پوری سنگترے کسی زمانے میں بڑے مشہور تھے۔ لیکن پاکستان کے کھوکھوں نے اس کی شہرت ختم کر دی ہے۔ ہندو سکھ پاکستان آتے ہیں تو پاکستان کے کینو سوغات کی طرح ٹوکروں میں بھر کر ساتھ لے جاتے ہیں اور بھارت میں جا کر دوستوں رشتے داروں کو بطور تحفہ دیتے ہیں۔

ناگ پور کا سٹیشن کافی وسیع تھا۔ شہر بھی کافی بڑا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو ہم اور کاچی باہر آ گئے۔ میں نے کاچی سے کہا۔

"اب ہمیں معلوم کرنا چاہئے کہ یہاں مہاناگ مندر کس جگہ پر ہے۔"

ہم نے سٹیشن پر ہی معلوم کر لیا کہ مہاناگ مندر بھاگیری ندی کے دوسرے کنارے پر سرخ چٹانوں کے درمیان واقع ہے۔ ٹرین میں ہی مسافروں نے ہمیں دوست بشتہ وغیرہ کروا دیا تھا۔ ہمیں بالکل بھوک نہیں تھی۔ ناگ پور شہر میں رکشے چل رہے تھے۔ یہ سائیکل رکشے تھے۔ ابھی وہاں موٹر رکشے نہیں آئے تھے۔ ہمارے پاس تھوڑے سے پیسے تھے۔ ہم نے ایک رکشے والے کو روک کر کہا کہ ہمیں مہاناگ مندر جانا ہے۔ کتنے پیسے لو گے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! میں تو آپ کا سیوک ہوں۔ بیٹھئے میں مندر لئے چلتا ہوں۔"

اس نے ہمیں ناگ مندر پہنچا دیا اور ایک پیسہ بھی نہ لیا۔ ہم نے دور سے ایک اونچی جگہ پر سرخ چٹانوں کے درمیان مندر کے کلس کو دیکھا تو وہیں اتر گئے۔ ہمارا ارادہ مندر کی پچھلی جانب سے داخل ہونے کا تھا۔ تاکہ اگر بلاست مندر میں گیٹ کے

پاس کہیں موجود ہو تو ہمیں نہ دیکھ لے۔ یہ جگہ غیر آباد تھی۔ سرخ چٹانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ کہیں کہیں آم کے درخت بھی تھے۔ مندر کے اردگرد املی کے کچھ درخت کھڑے تھے۔

مندر کے عقب میں ایک صحن تھا جہاں جگہ جگہ سائبانوں کے نیچے بنا کر چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر رکھے ہوئے تھے۔ یاتری اور پوجا کرنے والے مرد اور عورتیں آ کر ان پر پھول چڑھاتیں اور ماتھا ٹیکتیں۔ سامنے مندر کا مرکزی دروازہ تھا۔ دروازے کے آگے ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کی سیڑھیوں پر مجھے کچھ عورتیں اور مرد نہاتے ہوئے نظر آئے۔ عورتوں نے باریک ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے کوئی شرم و حیا محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے کاچی سے کہا۔

"کیا خیال ہے ہمیں مندر میں داخل ہونا چاہئے یا باہر بیٹھ کر جائزہ لینا چاہئے؟"

کاچی بولی۔ "میرا خیال ہے ہم یہاں ایک طرف تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔"

یہاں اور بھی کئی سادھو وغیرہ دھونی رما کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے دھونی تو نہیں رمائی۔ بس ویسے ہی ایک درخت کے پاس بیٹھ گئے۔ ہم دیر تک بیٹھے رہے۔ تب کاچی نے کہا۔

"اس طرح کب تک بیٹھے رہیں گے۔ تم ٹھہرو۔ میں اندر جا کر حالات کا جائزہ لیتی ہوں۔"

کاچی مندر کے مرکزی دروازے میں سے اندر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ایک لوہیڑ عمر عورت اپنے ادھیڑ عمر مرد کے ساتھ میرے پاس آئی۔ دونوں نے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ باری باری میرے پاؤں چھوئے اور میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے جوگی سمجھ کر آ گئے ہیں۔ میں نے بھی جوگیوں کے انداز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے بچہ۔۔۔ میرے پاس کس لئے آئے ہو؟"

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہم نے ہاتھ باندھ کر عاجزی سے کہا

"مہاراج! ہم پر بڑی چتا آن پڑی ہے۔ ہماری مدد کریں۔"

میں نے سوچا یہ خوامخواہ اپنی چتا سنا کر میرے کان کھائے گا میں خود چتا میں پڑا ہوا ہوں۔ میں نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کہا

"بھئی بابا جاؤ کسی دوسرے سادھو کو جا کر اپنی چتا سناؤ۔"

وہ بولا "مہاراج! میری چتا یہاں کوئی نہیں سنتا۔ ہو سکتا ہے اسے یقین نہیں آئے۔"

مجھے تھوڑی سی دلچسپی پیدا ہوئی۔ میں نے پوچھا

"کیا ہے تمہاری چتا؟"

وہ کہنے لگا

"مہاراج! میرا ایک ہی جوان بیٹا ہے۔ اس کا نام رامو ہے مہاراج ——— وہ شہر کے سب سے بڑے سیٹھ کی کوٹھی میں ملازم تھا سیٹھ نے اس پر چوری کا جھوٹا الزام لگا کر حوالات میں بند کرا دیا ہے۔ مہاراج میرا بیٹا بے گناہ ہے۔"

میں نے بیزاری سے کہا

"جا کر کسی وکیل سے بات کرو۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

وہ بولا "مہاراج! اصلی چور کو میں جانتا ہوں میں نے اسے چوری کرتے بھی دیکھا ہے۔ مگر میری بات کا کسی کو یقین نہیں آئے۔"

میں نے تعجب سے کہا

"کیسے پاگل آدمی ہو۔ اگر اصلی چور کو جانتے ہو اور تم نے اسے چوری کرتے بھی دیکھا ہے تو تھانیدار کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ جا کر اسے کہو کہ اصلی چور کو گرفتار کر لے اور تمہارے بیٹے کو چھوڑ دے۔"

وہ آدمی بولا "مہاراج! اصلی چور ایک سانپ تھا۔ نیلے رنگ کا سانپ۔ اسے اب کون پکڑے گا وہ تو چوری کر کے نکل گیا تھا۔"

میرے تھوڑے سے کان کھڑے ہوئے میں نے پوچھا

"اس نیلے سانپ نے کیا تجھے چوری کی تھی؟ بھلا سانپ بھی کبھی چوری کرتا ہے؟"

اب اس آدمی نے مجھے جو کہانی سنائی وہ یہ تھی۔ جس مل دار سیٹھ کے ہاں اس کا بیٹا ملازم تھا وہ شہر کا بڑا امیر سیٹھ تھا۔ اس کی ایک انگوٹھی تھی جس میں ایک انمول ہیرا جڑا ہوا تھا۔ اس ہیرے کی قیمت کروڑوں روپے میں تھی۔ شہر بھر میں اس ہیرے کا بڑا چرچا تھا۔ شہر میں سب کی زبان پر تھا کہ سیٹھ رام داس کے پاس ایک ایسا ہیرا ہے اس کی انگوٹھی میں جڑا ہوا۔ جس کی قیمت برطانیہ کے ملک کا بادشاہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ وہ ہیرا آج تک کوئی چور اچکا بھی چوری نہیں کر سکا تھا کیونکہ سیٹھ ہمہ اوقات انگوٹھی پہنے رکھتا تھا۔ صرف رات کے وقت ہیرے والی انگوٹھی اتار کر اپنے کسی نوکر کے کوانٹر میں رکھ دیتا تھا کہ غریب نوکر کے بارے میں کون یقین کرے گا کہ اس کے پاس اتنی قیمتی انگوٹھی ہو گی۔ ایسا وہ چوروں ڈاکوؤں کو دھوکا دینے کے لئے کرتا تھا۔ وہ ہیرے والی انگوٹھی باری باری اپنے گیارہ ملازموں کے کوانٹر میں چھپا دیتا تھا۔ اور نوکروں کو اس نے خبردار کر رکھا تھا کہ اگر ان کے ہاں سے انگوٹھی چوری ہوئی تو وہ انہیں ساری عمر کے لئے جیل بھجوا دے گا۔ ایسا وہ اس خیال سے کہتا تھا کہ اگر کسی نوکر کے دل میں خیال آ جائے کہ وہ کسی چور ڈاکو کے ساتھ مل کر انگوٹھی چوری کروا دے تو وہ اس ارادے سے باز رہے۔ اس کے ساتھ ہی سیٹھ نے کچھ بڑے کتے بھی گھر پر ملازم رکھے ہوئے تھے جو اس رات کو گھر کے باہر چھپ کر پہرہ دیتے تھے کہ کوئی چور انگوٹھی چرانے کے لئے وہاں نہ آ جائے۔

اس آدمی نے داستان سناتے ہوئے کہا

"مہاراج! آج صبح صبح منہ اندھیرے کی بات کرتا ہوں۔ آج رات کو سیٹھ کی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی ہمارے کوانٹر میں رکھی گئی تھی۔ میرے بیٹے نے اسے گتے کی ایک ڈبی میں بند کر کے اپنے سرہانے کے پاس رکھ دیا تھا۔ اس رات ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ساری رات جاگ کر گزاریں گے۔ میں، میری بیوی اور میرا اکلوتا بیٹا ہم ساری رات

Prepared By: S.Sohail Hussain

جاگتے رہے اور چوکی پر رکھی اس ڈبی کی حفاظت کرتے رہے جس میں سیٹھ رام داس کی قیمتی انگوٹھی بند تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم اسے نکال کر دیکھ بھی لیتے تھے۔ جس وقت رات کا پچھلا پہر ہوا تو ایک عجیب بات ہوئی۔ میری بیوی سو گئی تھی۔ میں اور میرا بیٹا ہم دونوں جاگ رہے تھے کوٹھڑی میں بجلی کا بلب روشن تھا۔ میرے کی انگوٹھی والی ڈبی چوکی پر ہمارے سامنے پڑی تھی کہ اچانک مجھے سرسراہٹ کی آواز آئی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ پھر ہلکی سی پھنکار کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک نیلے رنگ کا لمبا سانپ پھن اٹھائے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں اور میرا بیٹا اٹھ کر پرے ہٹ گئے۔ میں نے بیٹے سے کہا اسے مار ڈالو۔ سانپ ہے۔ وہ کوئی ڈنڈا وغیرہ تلاش کرنے لگا۔ اتنے میں نیلے سانپ کے منہ سے ایک شعلہ سا نکلا۔ ہم ڈر کر دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ سانپ ہماری طرف آنے کی بجائے چوکی کی طرف گیا جس پر میرے کی انگوٹھی والی گتے کی ڈبی پڑی تھی۔ سانپ نے ہمارے دیکھتے دیکھتے انگوٹھی والی ڈبی کو منہ کھول کر پکڑا اور جدھر سے آیا تھا ادھر کو واپس چلا گیا۔ ہم سہمے ہوئے سانپ کو تکتے ہی رہ گئے۔ جب ذرا ہوش آیا تو ہم نے باہر نکل کر شور مچا دیا کہ سانپ سیٹھ صاحب کی انگوٹھی لے کر بھاگ گیا ہے۔ کوٹھڑ کے پاس سیٹھ کے جو خفیہ پولیس کا دستہ پیچھے ہوئے تھے وہ بھی نکل آئے۔ کوٹھڑ کے دوسرے ملازم بھی جاگ پڑے۔ کسی نے میری بات کا یقین نہ کیا۔ سب یہی کہتے تھے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ مہاراج! یہ میری بپتا ہے جو میں نے آپ کو سنا دی۔ سیٹھ کو پتہ چلا تو اس نے میرے اکلوتے بیٹے کو حوالات میں بند کروا دیا۔"

اپنی عجیب و غریب کہانی سنانے کے بعد وہ آدمی اور اس کی بیوی آنسو بہانے لگے۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو وہ بھی اس کی بات پر یقین نہ کرتا اور یہی کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سیٹھ کی قیمتی انگوٹھی تم دونوں باپ بیٹے نے چرائی ہے۔ لیکن میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ واردات ناگ پور شہر میں ہوئی تھی۔ پنڈت چترویدی پاروتی ناگن کو اغوا کر کے اسی شہر میں لایا تھا۔ پاروتی میں یہ طاقت تھی کہ وہ

درخت سے ناگن میں جاتی تھی اور ناگن سے دوبارہ عورت کے روپ میں آ جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ ناگن بنتی تھی یعنی سانپ کا روپ بدلتی تھی اس سانپ کا رنگ نیلا ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پنڈت سانپوں کے علم کا ماہر ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ جس عورت پاروتی کو ہم اس کے پاس علاج کے لئے لے کر آئے تھے اصل میں وہ بڑی طاقت والی عورت ہے مگر اس کی طاقت کچھ وقت کے لئے یادداشت کے ساتھ غائب ہو گئی ہے۔ پنڈت نے اپنے علم کے زور سے یہ بھی معلوم کر لیا ہو گا کہ یہ عورت ناگن ہے اور ناگن کا روپ بدل سکتی ہے اور اس سے ناگن کے روپ میں بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسے اغوا کر کے ناگ پور لے آیا کیونکہ ناگ پور کا مہاناگ کا مندر اپنی دولت جیسے جواہرات کے خزانے کے لئے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ پنڈت نے سکیم بنائی ہو گی کہ وہ پاروتی ناگن کو اپنے خاص حکموں کی مدد سے سانپ کے روپ میں بدل لے گا اور شہر میں کسی خفیہ جگہ ٹھکانہ بنا کر اس کے ذریعے ناگ مندر کے قیمتی جیسے جواہرات چوری کر لے گا۔ مہاناگ مندر کی دولت چرانے سے پہلے اس نے بطور امتحان پاروتی کو ناگن کے روپ میں سیٹھ رام داس کی انگوٹھی چرانے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ پنڈت نے معلوم کر لیا ہو گا کہ سیٹھ رات کو اپنی انگوٹھی کسی نوکر کے گھر میں رکھتا ہے اور آج رات وہ اپنی انگوٹھی اس غریب آدمی کے کوٹھڑ میں رکھنے والا ہے جو میرے پاس بیٹھا مجھے اپنی کہانی سنا کر آنسو بہا رہا تھا۔ چنانچہ پنڈت نے رات کے پچھلے پہر پاروتی ناگن کو سانپ کے روپ میں کوٹھڑ کے کوٹھڑ میں بھیجا۔ سانپ انگوٹھی منہ میں ڈال کر پنڈت کے پاس لے گیا۔

واقعات کی کڑیاں آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئی تھیں اور میرے سامنے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسوائی پنڈت اسی شہر میں کسی خفیہ جگہ پر موجود ہے۔ کم از کم وہ اس مندر سے نہیں گئی ہے۔ اور پاروتی ایک سانپ کی شکل میں اس کے پاس ہی ہے۔ اس دوران ایک عورت وہاں آ گئی۔ اس نے میرے پاس ایک بوڑھی عورت اور مرد کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو کوئی خاص خیال نہ کیا۔ مجھے کہنے لگی۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نے سارا مندر چھان مارا ہے۔ وہ آدمی جس کی ہمیں تلاش ہے۔ کہیں نہیں ہے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جس آدمی کی ہمیں تلاش ہے اس کا سراغ مل گیا ہے۔"

کاپی حیرت سے مجھے تکنے لگی۔

"کہاں ہے وہ؟"

"بیٹھو تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

کاپی حیرت سے مورت بنی میرے پاس بیٹھ گئی۔

میں کاپی کو وہ ساری کہانی سنانے لگا جو مجھے اس بوڑھے آدمی نے سنائی تھی تو مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں کے سامنے مجھے پاروتی ناگن کے بارے میں بات نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے دونوں بوڑھے میاں بیوی سے کہا۔

"تم سامنے والے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی تمہیں بلاؤں گا۔"

دونوں بے چارے میرے اور کاپی کے پاؤں چھو کر اٹھے اور سامنے والے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے جس طرح ان لوگوں کی چھان بین کی تھی اور جس قسم کے سوال پوچھے تھے ان سے دونوں بوڑھے میاں بیوی کو امید پیدا ہو گئی تھی کہ میں ان کے دکھ کا علاج کر سکوں گا۔

تب میں نے نیلے سانپ کے ہیرے کی انگوٹھی چرا کر لے جانے کی ساری کہانی کاپی کو بیان کر دی۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہی۔ کہنے لگی۔

"ہو نہ ہو یہ تمہاری ناگن یا دیوی ہی سانپ کے روپ میں انگوٹھی چرانے ان کے گھر میں گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مکار پنڈت بھی اسی شہر میں ہے جس کو میں نے سارا دیکھ لیا ہے۔ وہ مندر میں نہیں ہے۔"

میں نے کاپی سے کہا۔

"سب سے پہلے ہمیں پنڈت کی بجائے ناگن پاروتی کا کھوج لگانا ہو گا۔"

کاپی نے پوچھا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"ناگن دیوی تو سانپ کے روپ میں ہو گی اس کا سراغ ہمیں کیسے ملے گا؟"

میں نے جیب سے وہ رومال نکال کر اسے دکھایا جس میں سے پاروتی کے جسم کی بو آتی تھی۔ میں نے کہا۔

"یہ پاروتی کا رومال ہے۔ اس میں اس کی بو رچی ہوئی ہے۔"

میں نے کاپی کو پاروتی کے بارے میں اصل واقعات بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کاپی نے رومال کو پکڑ کر سونگھتے کہے کہا۔

"مجھے تو اس میں سے کوئی بو محسوس نہیں ہوئی۔"

میں نے اسے بتایا کہ اس بو کو صرف کوئی سانپ ہی محسوس کر سکتا ہے۔

"اور اگر ہمیں کوئی سانپ مل جائے تو ہم اسے رومال کو سونگھا کر پاروتی کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ سانپ اس رومال میں سے ناگن پاروتی کی بو سونگھ کر اس کی تلاش میں چل پڑے گا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

میں نے کہا کہ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں پاروتی دیوی اس کی طاقت سے واقف ہوں۔

"اور پھر میں سانپ کو حکم دوں گا کہ اس رومال میں سے جس ناگن کی بو آ رہی ہے اس کی تلاش میں نکل پڑے۔"

کاپی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہو سکے گا۔ مگر اس کو بھی دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ مکار پنڈت کو اتنے بڑے شہر ناگ پور میں تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا اور اگر فرض کر لیا جائے اگر ہم اس کو ڈھونڈ بھی لیتے ہیں تو وہ پاروتی ناگن کو یقیناً سانپ کے روپ میں ہو گی چھپا دے گا اور کبھی ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔ اس لئے سب سے بہتر ترکیب یہی تھی کہ مکار پنڈت کی بجائے ناگن پاروتی تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے کاپی سے کہا۔

"ہمیں کوئی ایسا سانپ حاصل کرنا ہو گا جس کی عمر دوسرے سانپوں کے مقابلے

میں زیادہ ہو۔"

کاپی کہنے لگی۔

"یہاں صلاک مندر میں بڑے بڑے پرانے سانپ ہیں چل کر دیکھتے ہیں۔ ہمیں کوئی نہ کوئی بوڑھا سانپ مل جائے گا۔"

دونوں بوڑھے میاں بیوی کچھ فاصلے پر درخت کے نیچے بیٹھے ہمیں باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔ کاپی نے کہا۔

"ان دونوں کو تم نے کس لئے بٹھا رکھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔"

میں نے اشارے سے دونوں بوڑھے میاں بیوی کو بلایا۔ وہ ہاتھ پکڑے جلدی سے ہمارے پاس آ کر ادب سے بیٹھ گئے۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔ ہم تمہارے ساتھ تمہارے کوارٹر میں جا کر وہ جگہ دیکھیں گے جہاں سے نیلے سانپ نے ہیرے کی انگوٹھی چرائی تھی۔"

"جو حکم مہاراج!"

ہم دونوں میاں بیوی کو وہیں چھوڑ کر صلاک مندر کی طرف چلے۔ مندر میں داخلوں اور پوجا کرنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ ہم دونوں جوگیوں کے بھیس میں تھے۔ کاپی مجھے مندر کے پیچھے جو صحن تھا وہاں لے گئی۔ یہاں پتھروں کے سانپوں کے بڑے بڑے کتبے لگے تھے جن کے درمیان ہر قسم کے سانپ رینگ رہے تھے۔ کاپی کہنے لگی۔

"مہاراج! تمہیں سانپ کچھ نہیں کہتے۔ تم کوئی سانپ جو ذرا زیادہ عمر کا ہو پکڑ لو۔ اگرچہ اس مندر کے سانپوں کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ کسی کو نہیں ڈستے مگر پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔"

پاروتی کے جسم کی بو والا رومال میرے پاس تھا۔ میں ایک ایسی جگہ پر آ گیا جو ایک اونچے پتھر کی اوٹ میں تھی۔ یہاں قسم قسم کے رنگوں اور سائز کے سانپ ادھر ادھر

Prepared By: S.Sohail Hussain

رینگ رہے تھے۔ میں نے ایک سانپ کو دیکھا جو سب سانپوں سے الگ پھولے ہوئے پتھر کے پاس کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ مجھے یونہی محسوس ہوا کہ یہ سانپ باقی سارے سانپوں سے سمجھدار اور سنجیدہ سانپ ہے۔ یقیناً اس کی عمر بھی زیادہ ہو گی۔ اسی لئے یہ سب سے الگ بیٹھا ہے۔ میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اچانک سانپ نے اپنی گردن اونچی کی۔ پھر ہلکی سی پھنکار مار کر اپنا پھن کھول دیا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ سانپ نے آہستہ سے اپنا پھن میرے آگے کر کے جھکا دیا۔

سانپ نے ناگن پاروتی والے رومال کی بو محسوس کر لی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سانپ کو پکڑا اور اسے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کاچی دو قدم پیچھے کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ سانپ ٹھیک رہے گا ناں؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے یہ ان سب سانپوں کا جوگی سانپ ہے۔ سب سے الگ گیان دھیان میں لگا تھا۔ چلو اب دونوں میاں بیوی کے ساتھ ان کے گھر چلتے ہیں۔"

سانپ کو میں نے کلائی کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ یہ زیادہ لمبا سانپ نہیں تھا۔ ہم مندر کے صدر دروازے والے صحن میں درخت کے پاس آ گئے۔ دونوں اوجھل مگر میاں بیوی ہمیں دیکھ کر اوٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔

"چلو۔ ہمیں اپنے کوارٹر میں لے چلو۔"

اس کا کوارٹر مہاکال مندر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ شہر کے شمال کا علاقہ تھا۔ کھیتوں کے پاس غریبانہ چھ سات کوارٹر تھے۔ دونوں میاں بیوی ہمیں اپنے کوارٹر میں لے گئے اور کوٹھڑی میں وہ چارپائی دکھائی جس کے پاس وہ چوکی پڑی تھی جہاں سے سانپ نے ہیرے کی انگوٹھی والی ڈبی اٹھائی تھی۔

اس کوٹھڑی میں ناگن پاروتی کی بو ابھی تک موجود تھی۔ یہ ہمیں محسوس نہیں ہوا تھا مگر میری کلائی کے ساتھ لپٹے ہوئے سانپ کو فوراً محسوس ہو گیا۔ وہ میری کلائی سے

اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے سانپ کی یہ کیفیت دیکھ کر کاچی سے کہا۔

"کاچی! اس سانپ نے ناگن کی بو محسوس کر لی ہے۔ یہ رومال والی بو کے مقابلے میں زیادہ تیز ہے۔ کیونکہ ناگن نیلے سانپ کے روپ میں پچھلی رات کو یہاں آئی تھی۔"

وہ بولی۔ "تو پھر اپنا عمل شروع کر دو۔"

میں نے سانپ کو نیچے چوکی کے پاس اتار دیا اور اس کی طرف ذرا سا جھک کر کہا۔

"اگر تم میری زبان سمجھ رہے ہو تو سنو! یہاں تمہاری دیوی ناگن رات کو آئی تھی۔ یہاں اس کی بو تم نے سونگھ لی ہے۔ ہمیں اس کے پاس لے چلو۔"

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا لیکن مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ سانپ نے میرے الفاظ سمجھے ہوں گے۔ مگر میں حیران رہ گیا جب سانپ نے چوکی کے ساتھ اپنا منہ لگا دیا۔ جیسے وہ چوکی کو سونگھ رہا ہو۔ اس کے بعد وہ کوٹھڑی کے صحن میں نکل گیا۔ میں اور کاچی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ دونوں میاں بیوی پر میرے اس عمل کا بہت اثر ہوا۔ وہ ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ اپنے کوارٹر میں ہی رہیں اور ہمارے ساتھ نہ آئیں۔

"سانپ ہمیں وہاں لے جا رہا ہے جہاں سیٹھ ہیرے کی انگوٹھی چرانے والا سانپ رہتا ہے۔ ہم انگوٹھی لے کر تمہارے پاس آ جائیں گے۔"

دونوں میاں بیوی ہمیں دعائیں دیتے وہیں بیٹھ گئے۔ اس دوران سانپ کوارٹر کے صحن میں سے گزر کر باہر نکل چکا تھا۔ کاچی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس نے مجھے اشارے سے بلایا میں تیز تیز قدموں سے چلتا اس کے پاس آ گیا۔ ہم نے دیکھا کہ سانپ کوارٹروں کے آگے جو کچا راستہ تھا اس کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ رات کو ناگن پاروتی نیلے سانپ کے روپ میں قیمتی انگوٹھی لے کر اسی راستے سے گزری تھی۔ اندا سانپ اسی راستے پر پاروتی کی بو لیتا چلا جا رہا تھا۔

دوسرے کوارٹروں میں سے کچھ مرد عورتیں اور بچے باہر نکل کر یہ تماشہ دیکھنے لگے

Prepared By: S.Sohail Hussain

کہ ایک سانپ زمین پر رینگتا ہوا آگے آگے جا رہا ہے اور ایک جوگی اور جوگن اس
کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ سانپ ایک جگہ پہنچ کر کھیتوں میں اتر گیا۔ ہم بھی اس کے
پیچھے کھیتوں میں اتر گئے۔ کچھ دور تک تماشہ دیکھنے والے رہے اور پھر ہمارے ساتھ
آ گئے۔ پھر وہ واپس چلے گئے۔ اس وقت سانپ کھیتوں میں سے نکل کر ایک کھلے
میدان میں آ گیا ہوا تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ ہم بھی اس کے پیچھے آہستہ
آہستہ چل رہے تھے۔ کاپی کہنے لگی۔

"اب مجھے پورا وشواش ہے کہ یہ سانپ ہمیں ناگن دیوی کے ٹیلے سانپ کے
پاس لے جائے گا۔"

میں بھی بہت حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔

سانپ میدان میں سوکھی گھاس اور جھاڑیوں میں سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ میدان
ختم ہوا تو سامنے ریلوے لائن آ گئی۔ سانپ ریلوے لائن پر چڑھ گیا۔ اس وقت ایک
ٹرین ناگ پور ریلوے سٹیشن کی طرف آ رہی تھی۔ انجن ڈرائیور نے لائن کے قریب
ہمیں دیکھ کر زور سے وسل دیا۔ سانپ ریل کی پٹڑی پر چڑھ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ
ریلوے لائن عبور کر کے دوسری طرف جانا چاہتا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ گاڑی کے
نیچے نہ آ جائے۔ کیونکہ گاڑی بہت قریب آ گئی تھی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم دونوں
لائن پار کرتے۔ ہم وہیں ریلوے لائن سے چند قدم دور لائن پر بیٹھ گئے۔ ہماری نظریں
ریل کی پٹڑی پر لگی تھیں۔ میں نے سانپ کو لائن کے اوپر سے بڑی تیزی سے
گزرتے دیکھا۔ اتنے میں ٹرین آ گئی اور شور مچاتی دھڑ دھڑاتی ہمارے سامنے سے
گزرنے لگی۔ ریل گاڑی کے گزرتے ہی ہم نے دوڑ کر ریلوے لائن پار کی اور سانپ
کو تلاش کرنے لگے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سانپ لائن کی دوسری طرف نیچے
ایک جھاڑی کے پاس کنڈلی مار کر یوں بیٹھا تھا جیسے ہمارا انتظار کر رہا ہو۔

ہم اس کے قریب آئے تو وہ آگے چل پڑا۔ میں نے کاپی سے کہا۔

"کاپی! لگتا ہے سانپ کو پتہ چل گیا ہے کہ ہمیں ناگن دیوی کی تلاش ہے۔"

کاپی پہلے ہی توہم پرست تھی کہنے لگی۔

"ہاں راج! یہ سانپ ضرور کوئی رشی منی ہے اس سے کوئی پاپ ہو گیا ہو گا کہ اس
نے سانپ کے روپ میں جنم لیا۔"

میں ان باتوں پر یقین رکھتا تھا نہ مجھے ان سے کوئی دلچسپی تھی۔ ہم سانپ کے پیچھے
پیچھے چل پڑے۔ سانپ کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی جگہ رک
جاتا۔ گردن اٹھا کر اپنی زبان بار بار باہر نکالتا۔ اتنا مجھے معلوم ہو گیا ہوا تھا کہ سانپ اپنی
زبان کے ذریعے فضا کو سونگھتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر آگے چل پڑتا۔ اسی طرح
سانپ کے پیچھے پیچھے چلتے جب ہمیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو ہم تھک گئے۔ ہم ناگ
پور شہر کے جنوب کی جانب کافی دور نکل آئے تھے۔ آہستہ آہستہ شہر ناگ پور کی
عمارتیں پیچھے رہتی جا رہی تھیں۔ کاپی بہت تھک گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"سانپ کو پکڑ لو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

میں نے آگے بڑھ کر سانپ کو پکڑ لیا اور وہیں بیٹھ گئے۔ سانپ کو میں نے کالائی
کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ وہ اپنا سر اٹھائے منہ سامنے کی طرف کئے بار بار زبان باہر نکال رہا
تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے سامنے کی جانب سے ناگن پاروتی کے سانپ کی مسلسل
بو آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے وہ بدمعاش پنڈت پاروتی کو لے کر شہر سے بہت دور نکل گیا
ہے۔"

کاپی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"کہیں وہ اور آگے نہ نکل جائے؟"

مجھے بھی فکر لگا کہ اگر پنڈت ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو ہماری ساری محنت
رائیگاں چلی جائے گی۔ چنانچہ تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد میں نے سانپ کو چھوڑ
دیا۔ سانپ تیزی سے آگے چل پڑا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ آگے ایک ندی
آئی۔ ندی پر پل بنا ہوا تھا۔ ہم پل پر سے گزر کر ندی پار کر گئے۔ آگے ایک میدان

Prepared By: S.Sohail Hussain

تھے۔ میدان میں کہیں کہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔ ہم میدان سے بھی گزر گئے۔ اس کے بعد ویران علاقہ شروع ہو گیا۔ ہماری بائیں جانب کچھ کارخانوں کی چمنیاں آہستہ آہستہ ہم سے دور ہوتی چلی گئیں۔ ایک کچا راستہ تھا جس پر کچھ آدمی سائیکلوں پر سوار جا رہے تھے۔ ایک بیل گاڑی گزر گئی۔ سانپ اس کچے راستے کو پار کر کے سامنے کی جانب جا رہا تھا جدھر جھاڑیاں تھیں اور دور درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔

سانپ رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد دو تین مکان تھے۔ سانپ ان کے قریب سے نکل گیا۔ ہمیں سانپ کے پیچھے پیچھے چلتے مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ایک اونچی جگہ تھی۔ جیسے کسی نے بند باندھا ہوا ہو۔ اس کی دوسری جانب آئے تو دیکھا کہ سامنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ یہ وہی جھنڈ تھے جو ہمیں دور سے نظر آ رہے تھے۔ کاچی کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے آگے کوئی جنگل ہے۔"

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ہاگ پور کے جنوب میں آگے جا کر گھنا جنگل آ جاتا تھا۔ یہ جنگل اس قدر گھنا اور ویران تھا کہ دن کے وقت بھی ادھر لکڑیاں کاٹنے والے چھ سات آدمیوں کی ٹولی بنا کر جاتے تھے کہ اگر کوئی جنگلی درندہ حملہ کر دے تو اس کا مقابلہ کر سکیں۔ سانپ درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا تھا۔ کاچی کا سانس چلتے چلتے پھول گیا تھا۔ کہنے لگی۔

"سانپ کو روک لو۔ مجھ سے اب چلا نہیں جاتا۔"

میں نے دوڑ کر سانپ کو زمین پر سے اٹھا لیا۔ ہم ایک بار پھر وہیں بیٹھ کر آرام کرنے لگے۔ ہم اونچے اونچے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ اس جنگل کے درختوں کی یہ پہلی قطار تھی۔ آگے اونچی اونچی جنگلی جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ کاچی کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ کہنے لگی۔

"مجھے تو اس جنگل میں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن سانپ اندر جا رہا ہے۔ مجھے تو اس کا پیچھا کرنا ہی پڑے گا۔ ایسا کرتے ہیں تم ان درختوں کے نیچے بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں سانپ کے ساتھ جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ مکار پنڈت نے اس جنگل میں ہی کہیں ٹھکانہ بنایا ہوا ہو گا۔"

کاچی نے دائیں بائیں ایک نگاہ ڈالی اور کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی میں یہاں اکیلی نہیں ٹھہر سکتی۔ یہاں مجھے بہت ڈر لگے گا۔"

دس پندرہ منٹ تک ہم وہاں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد میں نے سانپ کو چھوڑ دیا اور اس کے پیچھے چلنے لگے۔ آگے اونچی اونچی گھاس تھی۔ سانپ کو نگاہ میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہمیں سانپ کے بالکل ساتھ لگ کر چلنا پڑ رہا تھا۔ خطرہ تھا کہ سانپ ایک لمحے میں اوجھل ہو گیا تو گھنی گھاس میں وہ پھر دکھائی نہیں دے گا۔

ہم گھاس کو ادھر ادھر ہٹا کر سانپ پر نگاہ رکھے آگے بڑھ رہے تھے۔ جنگل میں ایک دہشتناک قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی درخت پر سے پرندے کی بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جیسے جیسے ہم جنگل میں آگے جا رہے تھے جنگل زیادہ سنسان اور گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ کاچی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کہیں یہ سانپ بھی ہمیں دھوکہ تو نہیں دے رہا۔ کہیں یہ خود تو نہیں بھٹک گیا۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ایسی بات نہیں ہے۔ سانپ اس وقت سے بالکل سیدھ میں چلا جا رہا ہے۔ اگر وہ بھٹک گیا ہوتا یا اسے ناگن پاروتی کی بو نہ آ رہی ہوتی تو سیدھا جانے کی بجائے ادھر ادھر دوڑ جاتا۔"

اونچی گھاس کا سلسلہ ختم ہوا تو پتھریلی زمین شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے پتھروں کے درمیان سے ہو کر سانپ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ ایک دو اونچی اونچی سیاہ رنگ کی چٹانوں کے قریب سے گزرے۔ پھر ایسے درخت دیکھے کہ جن کی جڑیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان کی گھنی شاخیں نیچے تک آ گئی تھیں۔ ان کے تنوں پر جنگلی بیلیں

Prepared By: S.Sohail Hussain

چڑھی ہوئی تھیں۔ کانچی میرے چلنے کی بجائے اب ڈر کے مارے بالکل میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی اور تھوڑی دور چلنے کے بعد پیچھے گردن پھیر کر دیکھ لیتی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"تم پیچھے کیوں دیکھتی ہو؟"

وہ بولی۔ "مجھے ڈر ہے پیچھے سے کوئی شیر چیتا حملہ نہ کر دے۔"

اس کا ڈر خوف حق بجانب تھا۔ مجھے خود کسی وقت ڈر لگنے لگتا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی شیر یا چیتا نکل آیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہمارے پاس تو پنسل بنانے والا چاقو تک نہیں تھا۔ ہم جنگل میں جب کافی دور نکل آئے تو اچانک سانپ رک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر پھن کھول لیا اور سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے بار بار پھنکارنے لگا۔ سامنے اونچی اونچی جنگلی جھاڑیوں نے ایک دیوار سی بنا رکھی تھی۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! میرا خیال ہے ہم پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے سانپ کو اٹھا لیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جھاڑیوں کی دیوار کو ایک جگہ سے ہٹایا تو دیکھا کہ آگے ایک پرانا تالاب تھا۔ تالاب کے کنارے کسی حویلی کا بوسیدہ کھنڈر تھا۔ تالاب کی سطح پر بڑے بڑے پتے پھیلے ہوئے تھے۔ کانچی بھی میرے پاس جھک کر یہ منظر دیکھنے لگی۔ میں نے سانپ کو درمیان سے پکڑ کر ذرا آگے کیا تو وہ اپنا سر کھنڈر کی طرف بار بار اٹھانے اور پھنکارنے لگا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! مجھے یقین ہے کہ مکار چڑیل اس کھنڈر میں رہتا ہے اور ناگن پارو بھی وہاں موجود ہے۔"

کانچی اور میں اس جگہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ میں نے سانپ کو کلائی کے گرد لپیٹ کر اس کی گردن پکڑے رکھی تاکہ وہ میری کلائی سے اتر نہ جائے کیونکہ وہ کھنڈر کی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کانچی کہنے لگی۔

"میں پہلے آگے جا کر دیکھتی ہوں کہ کھنڈر خالی ہے یا وہاں کوئی رہتا ہے۔"

میں نے اسے روک دیا۔

"نہیں نہیں۔ ابھی ٹھہرو۔ ہمیں بہت سوچ کر کوئی قدم اٹھانا ہو گا۔"

میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں اکیلا آگے جاتا ہوں۔ جب کانچی کو بتایا کہ میں اکیلا جا رہا ہوں تو اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو پکڑ لیا۔ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

"بھگوان کے لئے مجھے اکیلی چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ چلو۔ مگر میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

تالاب کے کناروں پر بہت جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے چل رہے تھے۔ کھنڈر کے قریب پہنچے تو میری کلائی میں لپٹا ہوا سانپ بے چین ہو گیا۔ اس نے پھن کھول لیا اور پھنکارنے لگا۔ وہ میری کلائی سے نکل جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے پکڑے رکھا۔ یہ کسی پرانی حویلی کا کھنڈر تھا جس کا آدھے سے زیادہ حصہ ڈھے چکا تھا۔ جس طرف سانپ کا منہ تھا ہم اس طرف سے کھنڈر میں داخل ہو گئے۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں میں مٹی اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ آگے ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہم رک گئے۔

سانپ نے پھنکارنا بند کر دیا تھا مگر وہ کونے کی جانب کوٹھڑی کا جو دروازہ نظر آ رہا تھا اس طرف منہ کر کے بار بار اپنی دوشاخہ زبان کھول رہا تھا۔ میں نے کانچی سے سرگوشی میں کہا۔

"اس کوٹھڑی میں کچھ ہے۔ سانپ اس طرف اشارہ کر رہا ہے۔"

کانچی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر خوف طاری تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کونے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

پاروتی اسی کوٹھڑی میں بند ہے اور منکار پنڈت بھی یقیناً اندر ہی ہو گا۔ دروازے کے قریب آ کر دیکھا کہ اس کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے سانپ کی طرف دیکھا۔ سانپ بند دروازے کی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کانچی سے کہا کہ پنڈت تالا لگا کر کہیں گیا ہے۔ ناگن پاروتی اندر ہی ہو گی۔ میں نے ایک پتھر اٹھا کر تالے کو توڑ دیا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ سانپ ایک دم سے میری کلائی کے ساتھ چمٹ گیا۔ جیسے خوف زدہ ہو گیا ہو۔ دروازے میں سے دن کی روشنی کوٹھڑی میں داخل ہونے لگی تھی۔ ہم کوٹھڑی میں آ گئے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کونے میں ایک پٹاری پڑی ہے جس کے اوپر بڑا سا پتھر رکھا ہوا ہے۔ میں نے پتھر اٹھا کر پٹاری کھولی تو اس کے اندر سے ایک نیلے رنگ کا سانپ پھنکارتا ہوا باہر آ گیا۔

یہ پاروتی تھی جو نیلی ناگن کے روپ میں تھی۔

پٹاری سے باہر نکلتے ہی نیلے سانپ نے پھن کھول دیا۔ میری طرف دیکھا اور پھن سیدھا کر زمین کے ساتھ لگا لیا۔ کانچی میرے پیچھے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا یہی وہ سانپ ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں کانچی! میں نے سانپ کو سانپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یہ پاروتی ناگن ہی سانپ کے روپ میں ہے۔"

وہ بولی۔ "تمہارے پاس جو پاروتی کا رومال ہے ہو سکتا ہے یہ اس کی بو پا کر بیہوش ہو کر بیٹھ گیا ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں اسے پہچانتا ہوں۔ میں نے پاروتی ناگن کو اس سے پہلے اسی نیلے سانپ کی شکل میں کئی بار دیکھا ہے۔"

اس دوران سانپ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا میرے قریب آیا۔ پھر میرے سامنے سر نکالنے کی بجائے اچھل کر میرے کیوے کرتے پر چڑھ گیا۔ میری کلائی پر لپٹا ہوا سانپ کانپ کر دور جا گرا۔ جیسے وہ نیلے سانپ سے ڈر گیا ہو۔ نیلا سانپ میرے کرتے پر رینگتا ہوا اپنے آپ میری کلائی پر آ کر لپٹ گیا۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"دیکھا تم نے؟ یہ پاروتی ہی ہے۔ اگر کوئی دوسرا سانپ ہوتا تو دور سر جھکا کر بیٹھا رہتا مگر یہ پاروتی ناگن ہے۔ میری دوست پاروتی ناگن۔ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سانپ کے روپ میں آنے کے بعد اس کی یادداشت بھی واپس

Prepared By: S.Sohail Hussain

آ گئی ہے۔"

کانچی خوش ہو کر بولی۔

"یہ تو بڑے اچھی بات ہوئی ہے۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ یہ انمول سانپ پنڈت کے قبضے سے کسی طرح نکل جائے اور ہمارے مندروں کے ہیرے جواہرات چوری ہونے سے بچ جائیں۔ اب اسے لے کر یہاں سے نکل چلتے ہیں۔ اگر منگل پنڈت آگیا تو کہیں ہم پر کوئی جادو ٹونا نہ کر دے۔"

جو سانپ ہمیں پری تک لایا تھا۔ میں نے اسے کوٹھری میں ادھر ادھر دیکھا۔ مگر وہ خدا جانے کہاں روپوش ہو چکا تھا۔ میں نے پاروتی کے لیلے سانپ کو کلائی سے اتار کر اس کے اپنے رومال میں ڈالا اور اپنے لمبے کرتے کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد ہم کوٹھری سے نکلے اور یوں تیز تیز ایک طرف چلنے لگے جیسے ہم چوری کر کے بھاگ رہے ہوں۔ ہم جس طرف سے آئے تھے اس طرف سے واپس نہ گئے۔ بلکہ کھنڈر کے پچھلی طرف سے ہو کر آگے ایک گہرے پہاڑی کھڈ میں اتر گئے۔ اس کھڈ کے اندر چھوٹے بڑے پتھر بکھرے پڑے تھے۔ کھڈ سے باہر نکلنے کی بجائے ہم اسکے اندر ہی مشرق کی طرف چلتے گئے۔

کانچی کہنے لگی۔

"اب تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ ہمارا صحیح سلامت مندر میں واپس جانا ٹھیک نہیں۔ ہمیں تو جتنی جلدی ہو سکے ہانگ پور شہر سے نکل جانا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ وہ کمینہ پنڈت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پھر بھی ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم ہانگ پور شہر کی طرف جانے کی بجائے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ نیچے جنوب کی جانب کسی دوسرے شہر کی طرف چلے جائیں۔ پھر وہاں جا کر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

کانچی کہنے لگی۔ "میرا فرض تو پورا ہو گیا ہے۔ اس سانپ کے مل جانے سے اور پنڈت کے ہاتھ سے نکل جانے سے دیوتاؤں کا خزانہ پنڈت کے ہاتھ لگنے سے محفوظ ہو

"گیا ہے۔ میں اب واپس کیلاش پربت چلی جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "وہاں جا کر پنڈت تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کو پتہ چل چکا ہو گا کہ اس کو قیمتی سانپ سے تم نے ہی محروم کیا ہے۔"

کانچی نے کہا۔ "میں اس کے مندر میں نہیں جاؤں گی۔ میں کیلاش پربت سے آگے جیت اپنے آبائی وطن کی طرف چلی جاؤں گی۔"

ہم کھڈ میں چلے جا رہے تھے۔ کانچی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟ کیا پاروتی دیوی پھر سے انسانی شکل میں واپس آ جائے گی؟ میرا تو خیال ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔ اگر انسانی شکل میں واپس آنا اس کے اختیار میں ہوتا تو تمہیں دیکھ کر جب اس کی یادداشت واپس آ گئی ہے تو وہ انسانی شکل میں بھی واپس آ جاتی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ پنڈت نے اس پر کچھ ایسا منتر پھونکا ہوا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے دوبارہ انسانی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔"

کانچی بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔ پاروتی کی یادداشت خواہ سانپ کے روپ میں آتے ہی یا سانپ کے روپ میں آنے کے بعد مجھے دیکھ کر یا کسی بھی وجہ سے واپس آ گئی تھی۔ مگر انسانی شکل میں واپس آنے یا سانپ کے روپ میں ہی مجھ سے باتیں کرنے کا اختیار اس کے پاس نہیں رہا تھا۔ پہلے جب کبھی وہ لیلے سانپ کا روپ رکھتی تھی تو مجھ سے انسانی آواز میں باتیں کر لیا کرتی تھی۔ لیکن اب اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ جب میں نے ان خیالات کا اظہار کانچی سے کیا تو وہ بولی۔

"تم اس سے بات کر کے دیکھو۔ ہو سکتا ہے تمہارے بات کرنے سے اس کے اندر کی چھپی ہوئی طاقت بیدار ہو جائے وہ انسانی آواز میں باتیں کرنے لگے۔"

ہم وہیں رک گئے۔ میں نے جیب سے لیلے سانپ کو نکال کر اپنے سامنے کیا اور کہا۔

"پاروتی مجھے یقین ہے کہ تم ہی پاروتی ہو تمہاری یادداشت واپس آ گئی ہے اور تم مجھے پہچان رہی ہو۔ مجھ سے بات کرو۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

نیلا سانپ اپنی گردن اٹھا کر جیسے گھٹی ہوئی آواز سے میری طرف تکنے لگا۔ مجھے پاروتی کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں نے ایک بار پھر کہا

"پاروتی! میں تمہارا وہی ساتھی ہوں مجھ سے پلیز اپنی آواز میں بات کرو۔"

میں نے دو تین بار یہ جملہ دہرایا مگر نیلے سانپ نے کوئی بات نہ کی۔ بس اپنی گردن میری کلائی کے ساتھ بے بسی کے عالم میں بار بار لگاتا رہا۔ کانچی بولی۔

"یقین کرو پاروتی دیوی تمہاری بات سن رہی ہے۔ سمجھ رہی ہے مگر وہ پنڈت کے طلسمی منتر کی وجہ سے کچھ بولنے سے معذور ہے۔ وہ بات نہیں کر سکتی۔ نہ اصلی شکل میں واپس آ سکتی ہے۔ تمہیں سب سے پہلے پاروتی پر جو طلسم کیا گیا ہے اسے توڑنا ہو گا۔"

میں نے نیلے سانپ کو جیب میں رکھا اور کہا

"پہلے یہاں سے نکلو۔ یہاں سے نکلنے کے بعد سوچیں گے کہ پنڈت کے طلسم کو کس طرح توڑا جا سکتا ہے؟"

ہم کھڈ میں چلے جا رہے تھے۔ ہماری دونوں جانب کھڈ کی اونچی دیواریں تھیں۔ ان دیواروں پر جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہم کافی دیر تک اس گھاٹی کے اندر چلتے رہے۔ آخر ایک جگہ باہر نکلے تو سامنے کچھ فاصلے پر ریلوے سگنل پر نظر پڑی۔ کانچی اسے دیکھ کر بولی۔

"یہ ریلوے لائن ناگ پور سے اوپر کی جانب صوبہ بہار کو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے ہم اسی طرف چلتے ہیں۔ لیکن ہمیں کسی سٹیشن سے ٹرین پکڑنی ہو گی ہم پیدل کب تک چلتے رہیں گے۔"

ہم ریلوے لائن کے ٹریک پر چڑھ گئے اور مشرق کی طرف چلنے لگے۔ ناگ پور کا سٹیشن ہمارے پیچھے رہ گیا تھا۔ اچانک ہمیں گڑگڑ کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ریلوے لائن پر ایک ٹرالی چلی آ رہی تھی۔ اس کے اوپر سرخ جھنڈی لہرا رہی تھی۔ میں نے کانچی سے کہا

"رک جاؤ! ہم اس ٹرالی پر آگے سفر کریں گے۔"

میں نے ٹرالی کو ہاتھ دیا۔ ٹرالی میں ریلوے کے افسر یا کمیشن چپ گوری سوار تھے۔ دو تین ٹرالی کو دھکا لگا رہے تھے۔ جوگی اور سادھو لوگوں کی بھارت میں بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ ٹرالی پر بیٹھے ہوئے ریلوے افسروں نے ایک جوگی اور جوگن کو ہاتھ اٹھائے دیکھا تو اس نے ٹرالی رکوا لی اور ہم سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا

"ہم جوگی لوگ ہیں۔ یاترا کو ادھر آئے ہوئے ہیں۔ چلتے چلتے تھک گئے ہیں۔ ہمیں اپنی ٹرالی پر بٹھا لو۔"

ریلوے افسر نے کہا "بیٹھو مہاراج! بیٹھ جاؤ۔"

میں اور کانچی ٹرالی پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹرالی ریلوے لائن پر آگے چل پڑی۔ ریلوے افسر نے پوچھا

"مہاراج! آپ کہاں جائیں گے؟"

میں نے اس سے سوال پوچھا

"آگے کونسا شہر ہے؟"

وہ کہنے لگا "مہاراج آگے تو رائے پور کا شہر ہے مگر وہ شہر تو یہاں سے بہت دور ہے۔"

میں نے کہا "بھیا ہم صوبہ بہار کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ وہاں کے مندروں کی یاترا کرنے کا ارادہ ہے۔"

ریلوے افسر نے کہا

"مہاراج! صوبہ بہار تو رائے پور کے آگے شروع ہوتا ہے اور پہلے بڑا شہر رانچی آتا ہے۔"

میں نے کہا "بس ہمیں رانچی ہی پہنچا دو۔"

ریلوے افسر ہنسنے لگا بولا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

صدارن! میری ٹرالی تو اگلے سٹیشن گڑھ تک جائے گی۔ وہاں سے آپ کسی ٹرین میں سوار ہو جائیں اور رائے پور چلے جائیں۔ رائے پور سے آپ کو رانچی کی گاڑی مل جائے گی۔"

مجھے اطمینان ہو گیا۔ اس ریلوے افسر نے ہمیں اس علاقے سے نکل کر صوبہ بہار میں پہنچنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔ ٹرالی ایک خاص رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ اس کی چال ذرا کم ہوتے تھی تو وہ قلی ریلوے لائن پر اتر جاتے اور لائن پر دوڑتے ہوئے اسے دھکا لگانا شروع کر دیتے۔ جب ٹرالی اپنی خاص رفتار پکڑ لیتی تو وہ اچک کر ٹرالی پر بیٹھ جاتے۔ اسی طرح کوئی آدھے گھنٹے کے ٹرالی سفر کے بعد گڑھ کا مضافاتی ریلوے سٹیشن آ گیا۔ ہم ٹرالی سے اتر کر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے اور رائے پور جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ ایک قلی نے ہمیں بتایا کہ رائے پور گاڑی شام کو جائے گی۔ ہم نے وہیں تھوڑا بہت کھانا کھایا اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ نیلا سانپ میری جیب میں تھا اور بڑے سکون کے ساتھ تھا جیسے سو رہا ہو۔ میں نے کانچی سے کہا۔

"کانچی! تمہارے خیال میں مجھے پاروتی ناگن کو پھر سے انسانی روپ میں لانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ تم اس قسم کی باتوں کو اچھی طرح سے سمجھتی ہو۔ تم کیلاش پربت کے بالک مندر میں بھی رہ چکی ہو۔ کیا تمہیں کوئی ایسا چلہ یاد ہے جس کو کر کے پاروتی سانپ سے واپس انسانی شکل اختیار کر لے؟"

کانچی کچھ دیر غور کرتی رہی۔ پھر بولی۔

"مجھے ایسا کوئی چلہ نہیں آتا۔ یہ باتیں میری طاقت سے باہر ہیں۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"کیا بہار کے کسی مندر میں کوئی ایسا سادھو وغیرہ نہیں ہے جو اپنا منتر پھونک کر پاروتی پر کئے گئے طلسم کو ختم کر دے۔"

اچانک کانچی کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ کہنے لگی۔

"ایک بات ہو سکتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

اس نے کہا۔ "مجھے یاد آ گیا۔ رانچی شہر میں سنا ہے ایک پاگلی ہے جہاں ایک سنیاسی درویش رہتا ہے۔ وہ بڑا کرنی والا فقیر ہے۔ لوگ بڑی دور دور سے اپنی مرادیں پوری کرانے اس کے پاس آتے ہیں۔ اس کے پاس چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ پاروتی کو سانپ سے دوبارہ انسانی شکل میں لے آئے۔"

"اس بزرگ کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

کانچی نے کہا۔

"نام تو مجھے معلوم نہیں سنا ہے اسے پاگلی والا فقیر کہتے ہیں۔ رانچی چل کر اس کا پتہ پوچھ لیں گے۔"

مجھے تھوڑی سی امید پیدا ہو گئی۔ جب رائے پور جانے والی ریل گاڑی آئی تو ہم اس میں سوار ہو گئے۔ ٹکٹ تو ہمیں لینی نہیں تھی۔ ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ مسافروں نے ہمارے لئے جگہ بنا دی اور ہماری سارا راستہ خدمت کرتے رہے۔ رائے پور کا شہر وہاں سے بہت دور تھا۔ دوسرے دن ہم رائے پور پہنچے۔ وہاں سے گاڑی بدل کر رانچی والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اس طرح سفر کرتے کرتے ہم جس وقت رانچی کے ریلوے سٹیشن پر اترے تو دن کافی نکل آیا تھا۔ ہم نے سٹیشن سے باہر آ کر ایک قلی سے پاگلی والے فقیر کے بارے میں پوچھا۔ وہ آدمی بولا۔

"تمہیں پاگلی والے بابا جی کے درشنوں کو جانا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں بھیا! ہم جوگی لوگ ضرور ہیں۔ مگر پاگلی والے بابا جی کی ہم بڑی عزت کرتے ہیں۔ وہ بڑی کرنی والے فقیر ہیں۔ ہم ان کے درشنوں کو جا رہے ہیں۔"

وہ آدمی کہنے لگا۔

"یہاں سے یکے میں بیٹھ جاؤ۔ وہ تمہیں پاگلی والے بابا جی کے استھان پر پہنچا دے گا۔"

سامنے تانگوں کا اڈہ تھا۔ وہاں ہمارے پنجاب کی طرح کے تانگے نہیں تھے بلکہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

یکے تھے جو ریڑھے کی طرح کے تھے مگر ان پر چار سیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اکے والے سے کہا

"بابا لوگ ہمیں بابا جی بلوئی والے کے استھان پر پہنچا دو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔"

اکے والا نیچے اتر آیا۔ کہنے لگا

"پدھاریے مہاراج!"

میں اور کاپی اکے پر سوار ہو گئے۔ اکے والا آگے ڈنڈے پر بیٹھ گیا اور اکا روانہ ہو گیا۔ سڑک غیر ہموار تھی۔ اکا خوب ہچکولے کھا رہا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد دور سے ہمیں ایک ٹیلہ نظر آیا۔ یکے والا کہنے لگا

"مہاراج! اس ٹیلے کے پاس بابا جی رہتے ہیں۔"

سارا راستہ کوچوان ہمیں بابا جی کی کرامتیں سناتا آیا کہ انہوں نے کس طرح ایک کوڑھی کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور کوڑھی ٹھیک ہو گیا۔ کس طرح ایک بھینگا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اس کی بینائی واپس آ گئی۔ ہم خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔

ٹیلے کے پاس جا کر یکا ایک پیپل کے درخت کے پاس رک گیا۔ وہاں پہلے سے دو تین اکے کھڑے تھے۔ عورتیں مرد اور بچے ایک طرف بیٹھے تھے۔ سامنے پتھر کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا جہاں ایک دربان پہرہ دے رہا تھا۔ جو کوئی آدمی یا عورت اندر جانے کی کوشش کرتی وہ اسے پیچھے ہٹا کر کہتا

"ابھی تمہاری باری نہیں آئی۔ کل آنا۔"

ہم اکے سے اتر کر دربان کے پاس گئے۔ دربان نے ایک جوگی اور جوگن کو دیکھا تو کسی قدر تعجب سے پوچھا

"آپ تو ہندو ہیں۔ بابا جی مسلمان ہیں آپ کس لئے آئے ہیں؟"

دربان مسلمان تھا۔ اس نے سبز لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید رومال بندھا ہوا تھا۔ میں اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ بھائی میں بھی مسلمان ہوں۔ کیونکہ کاپی پر میں اپنا

مسلمان ہونا ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا

"بھیا! ہم بابا جی کے درشنوں کرنے آئے ہیں۔"

دربان بولا۔ "بابا لوگو۔ آپ اپنی باری کا انتظار کریں۔ جو لوگ پہلے آئے ہوئے ہیں وہ بھگت لیں تو پھر آپ کو اندر جانے کی اجازت ملے گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے بھیا ہم اپنی باری کا انتظار کر لیتے ہیں۔ مگر ہماری باری کب آئے گی؟"

دربان نے حساب لگا کر کہا

"شام تو ہو جائے گی۔"

میں اس وقت جسے زور سے پھنکار کی آواز آئی اور نیلا سانپ میری جیب سے اچھل کر زمین پر آ گیا اور پھن لہراتے ہوئے پھنکارنے لگا۔ دربان ڈر کر پرے ہو گیا اور بولا۔

"اس کو پکڑو۔ اس کو پکڑو۔"

میں نے جلدی سے نیلے سانپ یعنی پاروتی کو پکڑا اور جیب میں ڈالتے ہوئے دربان سے کہا

"بھائی ہمیں معاف کر دو۔ ہم تمہیں ڈرانا بالکل نہیں چاہتے تھے۔ یہ سانپ اپنے آپ باہر نکل آیا ہے۔ ہم اپنی باری پر ہی بابا جی کے درشن کریں گے۔"

میں اور کاپی واپس جانے ہی لگے تھے کہ اندر سے ایک آدمی دوڑتا ہوا دروازے پر آیا اور دربان سے بولا۔

"رکھو! بابا جی کا حکم ہے کہ جو دو جوگی اور جوگن آئے ہیں انہیں میرے پاس بھیج دو۔"

میں تو حیران رہ گیا۔ کاپی نے میری طرف بڑے فخر کے ساتھ دیکھا اور آہستہ سے کہا

"دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ بلوئی والے بابا جی بڑے کرنی والے فقیر ہیں۔ دیکھ

Prepared By: S.Sohail Hussain

لو انہیں ہمارے آنے کی فوراً خبر ہو گئی۔ حالانکہ انہیں کسی نے اندر جا کر نہیں بتایا۔"

دربان نے اسی وقت ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی اور دروازے سے پرے ہٹ گیا۔ جو آدمی پیغام لے کر آیا تھا اس نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔

"تشریف لائیے۔ بابا جی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ہم اس آدمی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ آگے ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی۔ دونوں جانب جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ سب سے آخر میں بھی ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ اس جھونپڑی کے باہر آگ پر دیگ چڑھی ہوئی تھی۔ شاید زائرین کے لئے بھنڈارہ پک رہا تھا۔ جھونپڑی کے باہر دو فقیر آمنے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے مراقبے میں ہوں۔ ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے وہ آدمی خود جھونپڑی کا ٹاٹ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ فوراً ہی باہر آیا اور اشارے سے ہمیں اندر جانے کو کہا۔ خود ایک طرف ہٹ گیا۔ میں آگے آگے تھا۔ کانچی میرے پیچھے پیچھے تھی۔ میں ٹاٹ اٹھا کر اندر گیا تو دیکھا کہ فرش پر بھی ٹاٹ بچھا ہوا ہے جس پر سفید ریش بزرگ بیٹھا ہے۔ سر پر سبز عمامہ ہے۔ بدن پر سبز رنگ کا چغہ ہے۔ میں بے اختیار ہو کر جاتے ہی انہیں کہا۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

بزرگ نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اور کانچی بزرگ کے قدموں میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ بابا جی نے مجھ پر بھرپور نگاہ ڈالی اور بڑی نرم آواز میں کہا۔

"بیٹا! مسلمان ہو تو مسلمان بن کر دکھاؤ۔ ہمیشہ مسلمان بنے رہو۔ ہندو کیوں بنے ہو؟"

میں نے دیکھا کہ کانچی چونک کر مجھے تکنے لگی تھی۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ میں

ہندو نہیں ہوں بلکہ مسلمان ہوں۔ مجھے کانچی کی پروا نہیں تھی۔ میں صرف پاروتی کی خاطر اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرتا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"بابا جی! آپ میرے دل کا حال جانتے ہیں کہ میں نے ہندوؤں والا بھیس کس لئے بدلا۔"

بابا جی نے کہا۔

"چاہے کچھ بھی ہو۔ تمہیں اللہ کا دروازہ نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔"

وہ چپ ہو گئے۔ جھونپڑی میں خاموشی چھا گئی۔ مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ بھی خیال تھا کہ بابا جی شاید میرے دل کا حال جان گئے ہیں۔ کانچی بھی چپ چاپ بڑے ادب سے بیٹھی تھی۔ اتنے میں بابا جی کہنے لگے۔

"میں جانتا ہوں تم کس لئے میرے پاس آئے ہو۔ میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔ بھگوان نے مجھے میرے خدا نے اختیار دیا ہوا ہے اتنی ہی مدد کروں گا۔ تمہاری جیب میں جو سانپ ہے اسے باہر نکالو۔"

میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نیلا سانپ نکال کر وہیں نیچے اپنے سامنے ٹاٹ پر رکھ دیا۔ پاروتی یعنی نیلے سانپ پر بھی بابا جی کا اتنا اثر ہو چکا تھا کہ وہ بھی اب سے سر جھکا کر سمٹ سمٹا کر بیٹھ گیا۔ نہ اس نے اپنی گردن اٹھائی اور نہ پھنکار ماری۔ بابا جی نے گہری نگاہ سانپ پر ڈالی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ہم اس قسم کی شعبدہ بازیوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ ہم تو بیماروں دکھی اور بیمار لوگوں کی خدمت کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر جس سانپ کو تم ہمارے پاس لائے ہو۔ یہ ایک ایسی عورت ہے جس کے دل میں ہمیں اسلام کے نور کی کرن پھوٹتی نظر آ رہی ہے۔"

مجھے یاد آ گیا کہ پاروتی کو شروع ہی سے بتوں کی پوجا سے نفرت تھی اور وہ مجھے کہا کرتی تھی کہ ایسا لگتا ہے کسی روز میں ان سب بتوں کو توڑ پھوڑ کر تمہارے مذہب

Prepared By: S.Sohail Hussain

اسلام میں داخل ہو جاؤں گی۔ میں بابا جی کی روشن ضمیری کا زبردست قائل ہو گیا تھا۔ میں کچھ کہنے لگا تو بابا جی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اور کہا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنے والے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہم اس سانپ کو پھر سے عورت کی شکل میں لے آئیں۔"

میں نے کہا۔ "جی ہاں بابا جی!"

بابا جی نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

اردو فینز ڈاٹ کام

تھوڑی دیر کے بعد بابا جی نے آنکھیں کھولیں۔ ہماری طرف دیکھا اور کہا۔

"اس کا ہمیں اختیار تو ہے مگر اجازت نہیں ہے۔ تمہیں اپنی مراد پوری کرنے کے لئے دلی شہر میں لال پہاڑی کے پیچھے بابا سدا رنگ کی خانقاہ میں جانا ہو گا۔ بابا سدا رنگ کا درجہ مجھ سے بہت اونچا ہے۔ وہ اگر چاہیں تو اس سانپ کو دوبارہ انسانی شکل میں واپس لا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بابا جی! کیا آپ۔۔۔؟"

انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"اب تمہارا ہمارے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ بابا سدا رنگ کے پاس جا کر اپنی فریاد پیش کرو۔ اور سنو اب کبھی ہندو نہ بننا۔ مسلمان ہو کر بت پرستوں والا حلیہ نہ بنانا۔ جاؤ۔"

میں نے لیلیٰ سانپ کو اٹھا کر جیب میں ڈالا۔ بابا جی کو سلام کیا۔ کالچی نے بھی بڑے ادب سے بابا جی کو سلام کیا اور ہم دونوں جھونپڑی سے باہر آ گئے۔ کالچی خاموش تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اسے کبھی گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ میں ہندو نہیں ہوں مسلمان ہوں۔ جب ہم احاطے کی دیوار کے دروازے میں سے نکل کر باہر آئے تو کالچی نے آہستہ سے کہا۔

"تم مسلمان تھے تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟ مجھے تو بتا دیتے۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نے کہا۔ "کانچی تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ میرے سامنے کیسی کیسی مجبوریاں
تھیں۔ میں نے غیر مسلموں والا بھیس صرف پاروتی کی بھلائی کی خاطر اختیار کیا
تھا۔ تم پاروتی کی اگر دردناک کہانی سنو تو تمہاری آنکھ سے آنسو نہ تھمیں کہ کس طرح
ایک شریف گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی کو تمہارے ہندو بھیڑیوں اور ہوگیوں نے اغوا کیا
اور پھر اس کے ساتھ کیسے کیسے مظالم کئے۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے چلا؟ کہاں پہنچ گیا
اور پاروتی سے میری ملاقات کیسے ہوئی؟ یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔ اس داستان کو
سنانے کا وقت نہیں۔"

ہم اکے میں بیٹھ کر سٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے
مسلمان ہونے کا راز کھل جانے پر کانچی کو نفسیاتی طور پر دھچکا لگا ہے۔ وہ خاموش تھی۔
میں نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی۔ یکے سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ جب ہم کافی دور نکل
گئے تو میں نے کانچی سے کہا۔

"کیا بات ہے؟ تم چپ چپ ہو۔"

حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ چپ کیوں ہے۔ کہنے لگی۔

"ویسے ہی چپ ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

رانچی کے سٹیشن پر پہنچنے کے بعد میں نے دلی جانے والی گاڑی کے بارے میں
ایک قلی سے پوچھا تو وہ بولا۔

"یہاں سے کوئی گاڑی سیدھی دلی نہیں جاتی آپ کو مرزا پور جانے والی گاڑی
پکڑنی ہوگی۔ مرزا پور سے آپ کو دلی جانے والی گاڑی ملے گی۔"

قلی نے یہ بھی بتایا کہ یہ بڑا لمبا سفر ہے۔ کانچی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

"میں سوچتی ہوں اب میرا تمہارے ساتھ دلی جانا کوئی اتنا ضروری نہیں ہے۔ یہ
کام تم خود بھی کر سکتے ہو۔ میں دیوتاؤں کا خزانہ پنڈت سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ محفوظ
ہو گیا ہے۔"

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ میں ہندو نہیں مسلمان ہوں کانچی کا دل مجھ سے

اکھڑ گیا تھا۔ میں بھی اسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"اگر تم واپس جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ لیکن ایک بات ضرور
کہوں گا کہ میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔ تمہاری مدد کے بغیر میں پاروتی تک کو
حاصل نہیں کر سکتا تھا۔"

کانچی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کہنے لگی۔

"اس میں احسان والی کوئی بات نہیں ہے۔"

ہم خاموش ہو گئے۔ اس وقت ہم پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"یہاں سے تم کس طرف جاؤ گی؟"

وہ بولی۔ "میں سوچتی ہوں درگا پوجا کا تہوار شروع ہونے والا ہے۔ پہلے کلکتے کی
یاترا کروں اس کے بعد اپنے وطن تبت چلی جاؤں۔"

مرزا پور جانے والی گاڑی پہلے آ گئی۔ میں یہاں کانچی سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو
گیا۔ مرزا پور پہنچ کر میں نے گاڑی بدلی اور دلی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ آگے
بھی بڑا لمبا سفر تھا۔ ٹرین الہ آباد، کان پور اور علی گڑھ سے ہوتی ہوئی ایک دن اور ایک
رات کے سفر کے بعد دلی پہنچی۔ میں ابھی تک ہندو جوگیوں والے بھیس میں تھا۔ اب
اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مگر میرے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے۔ اتنے
روپے بھی نہیں تھے کہ نئے کپڑے خرید لوں۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ ماتھے پر جو تلک
لگا تھا وہ مٹا دیا اور کرمنڈل بھی راستے میں ٹرین سے باہر پھینک دیا۔ دلی کے سٹیشن پر
گاڑی صبح کے وقت پہنچی تھی۔ میں نے سٹیشن پر ہی تھوڑا سا ناشتہ کیا۔ ویٹنگ روم
کے باتھ روم میں جا کر جیب سے پاروتی کے نیلے سانپ کو نکال کر دیکھا۔ سانپ بالکل
ٹھیک تھا اور سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے پاروتی مجھے دیکھ رہی
ہے۔ میں نے اسے رومال میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ اب مجھے دلی
شہر کی لال پہاڑی والی خانقاہ میں جانا تھا جہاں سدا رنگ بابا کا ڈیرہ تھا۔ نیلے سانپ کو
پاروتی کی شکل میں واپس لانے کی یہی ایک امید باقی تھی کہ سدا رنگ بابا ہی یہ کام کر

Prepared By: S.Sohail Hussain

(13)

سنتے ہیں۔

میں سواریوں والے تانگے میں بیٹھ کر لال پہاڑی والی خانقاہ پر پہنچ گیا۔ وہاں بابا جی کے عقیدت مند کافی تعداد میں خانقاہ کے باہر درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک ہندو جوگی کو یعنی مجھے دیکھا تو حیرت سے تکنے لگے۔ میں لوگوں سے دور ایک الگ تھلگ جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ بابا جی ایک گھنٹے بعد عقیدت مندوں سے ملاقات کریں گے۔ اس دوران وہاں قوالی شروع ہو گئی۔ لوگ قوالی سننے جمع ہو گئے۔ میں نے سوچا چلو قوالی سنتے ہیں۔ اس طرح وقت بھی گزر جائے گا۔ میں بھی لوگوں کے مجمع میں آ کر بیٹھ گیا۔ قوال کسی شاعر کا فارسی کلام گا رہے تھے۔ ساز اور ڈھولک بج رہی تھی۔ جب قوالی کا رنگ خوب جم گیا اور قوالی تیز ہو گئی تو نیلا سانپ یعنی پاروتی میری جیب سے زور لگا کر باہر نکل آئی۔ میں اسے پکڑتا ہی رہ گیا اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے قوالوں کے سامنے جا کر پھن اٹھا کر رقص کرنے لگی۔ سب لوگ ایک سانپ کو یوں قوالی کی دھن پر رقص کرتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

قوال پہلے تو کچھ خوف زدہ ہوئے مگر جب دیکھا کہ سانپ انہیں کچھ نہیں کہہ رہا بلکہ ان کی قوالی پر رقص کر رہا ہے تو انہوں نے بھی دھن تیز کر دی۔ نیلے سانپ نے بھی رقص کو تیز کر دیا۔ میں خاموش بیٹھا یہ منظر دیکھتا رہا۔ آخر قوالی ختم ہو گئی۔ نیلا سانپ یعنی پاروتی رینگتی ہوئی چپ چاپ میرے پاس آ گئی۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ لوگ مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ سانپ کہاں سے لیا ہے؟ میں نے کہا

"بابا لوگ ہم تو فقیر آدمی ہیں۔ ایک جنگل سے مل گیا۔ زخمی تھا۔ ہم نے اس کا زخم دھویا۔ مرہم لگایا اور پھر جنگل میں چھوڑا تو یہ واپس نہ گیا۔ بس اسی روز سے ہمارے ساتھ رہ رہا ہے۔ آج ہم بابا جی کے درشن کرنے آئے۔ قوالی ہونے لگی تو سانپ وجد میں آ گیا۔"

میں اس سے زیادہ لوگوں کو اور کیا بتاتا۔ اتنے میں بابا جی سدا رنگ نے لوگوں سے ملنا شروع کر دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد عقیدت مند خانقاہ کی کوٹھڑی میں

جاتے اور بابا جی کی دعائیں وصول کر کے پرسکون حالت میں واپس آ جاتے۔ آخر میری باری بھی آ گئی۔ جب میں بابا جی کی کوٹھڑی میں داخل ہوا تو باپ جی نے جلال آواز میں کہا

"تو نے ابھی تک اپنے اندر کے بت نہیں توڑے۔ جا پہلے مسلمانوں والا اپنا حلیہ بنا کے پھر ہمارے پاس آ۔ جا۔"

میں اسی وقت باہر نکل آیا۔

سوچنے لگا دوسرے کپڑے کہاں سے حاصل کروں۔ میں نے باہر سڑک پر آ کر اپنی جیب میں سے پیسے نکال کر دیکھے۔ کل ساڑھے سات روپے تھے۔ اتنی رقم ہفتہ بھر کے ایک سال بعد تک بہت ہوا کرتی تھی۔ میں لوگوں سے پوچھتا پوچھتا ریلوے کے ایک بازار میں آ گیا۔ جہاں ریڈی میڈ سستی قسم کے کرتے پاجامے وغیرہ بکتے تھے۔ سردیوں کا موسم جا رہا تھا۔ دن کے وقت اتنی سردی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے ایک پاجامہ ایک کرتہ اور ایک واسکٹ خریدی۔ اور دکان کے اندر ہی جوگیوں والا لباس اتار کر کرتے پاجامے واسکٹ پہن لی۔ دکاندار بیچارا حیران ہوا۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"حضور حضور! کیا آپ سی آئی ڈی کے جاسوس ہیں؟"

میں نے اسے رازداری سے کہا

"تم نے ٹھیک پہچانا۔ مگر اس کا ذکر کسی کے آگے مت کرنا۔ میں سپیشل پولیس کا جاسوس ہوں اور مسلمان ہوں۔"

دکاندار خوش ہو کر بولا

"بھائی صاحب ہم گاہکوں کے راز کسی کو نہیں بتایا کرتے۔ ورنہ ہماری دکانداری رہ جائے۔"

اب میرا حلیہ مسلمانوں والا بن گیا تھا۔ نیلے سانپ کو میں نے واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہاں سے میں واپس بابا سدا رنگ کی خانقاہ پر آ گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں بابا جی نے مجھے اندر بلا لیا۔ مجھے مسلمانوں والے لباس میں

Prepared By: S.Sohail Hussain

دیکھ کر کہا۔

"اب کبھی بت پرستوں والا لباس نہ پہننا۔"

میں نے عرض کی۔

"انشاء اللہ آپ کے حکم پر پورا عمل کروں گا۔"

میں بلاجی کے آگے اپنا مدعا بیان کرنے کے واسطے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ بلا سدا رنگ نے فرمایا۔

"وہ سانپ نکالو جسے تم اپنے ساتھ لائے ہو۔"

میں نے جلدی سے رومال جیب سے نکال کر سامنے رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ پاروتی کا سانپ رومال کے اندر ہی رہا۔ وہ باہر نہ نکلا۔ بلا سدا رنگ نے سانپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"رومال میں کیوں چھپ کر بیٹھی ہو؟ باہر آ جاؤ۔"

انہیں اپنے کشف سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سانپ اصل میں ایک عورت ہے۔ بلا سانپ بلاجی کا حکم سنتے ہی آہستہ آہستہ رومال سے نکل آیا اور بلاجی کے سامنے آ بیٹھا کر بیٹھ گیا۔ بلا سدا رنگ کچھ دیر سانپ پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ پھر میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور فرمایا۔

"اس کو خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر لے جاؤ اور وہاں اسے حوض کا پانی پلاؤ۔ خدا نے چاہا تو آدھی رات کے بعد یہ اپنی اصلی شکل میں واپس آ جائے گی اور سنو۔ جس رات یہ اپنی اصلی شکل میں واپس آ جائے گی اس کے دوسرے دن تمہیں درگاہ شریف کی مسجد کے سامنے درخت کے نیچے بیٹھا ایک فقیر ملے گا۔ وہ اس لڑکی کو سیدھی راہ پر لے آئے گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں سلام کر کے تعظیم بجا لا کر بلا سدا رنگ کی کوٹھڑی سے نکل آیا۔ بلے سانپ کو میں نے اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہاں سے میں تانگے میں بیٹھ کر شہر سے باہر حضرت خواجہ صاحبؒ کی درگاہ پر حاضری دینے آ گیا۔ میں سب سے پہلے مزار

شریف پر جا کر فاتحہ خوانی کرنا اور سلام عرض کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس ملیالی سے رک گیا کہ ایک بغدو عورت سانپ کے روپ میں میری جیب میں ہے کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔ میں دوسری طرف والے دروازے سے ہو کر درگاہ شریف کے حوض پر آ گیا۔ درگاہ کے باہر ہی سے میں نے مٹی کا ایک چھوٹا سا کٹورا خرید لیا تھا۔ میں نے حوض میں سے تھوڑا سا پانی کٹورے میں ڈالا اور اپنے پاؤں وہاں سے واپس ہوا۔ حوض کا پانی مجھے آدھی رات کے بعد بلے سانپ کو پلانا تھا۔ اس کے لئے کسی ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں میں رات بسر کر سکوں اور جہاں مکمل تنہائی ہو اور میرے سوا وہاں کوئی نہ ہو۔

اب تو خواجہ صاحبؒ کی درگاہ شریف کے آس پاس بہت آبادی ہو گئی ہے۔ اس زمانے میں اتنی آبادی نہیں تھی۔ میری پاس صرف دھلائی روپے باقی رہ گئے تھے۔ وہاں کوئی ہوٹل یا سرائے نہیں تھی جہاں میں اکیلے میں رات بسر کر سکتا۔ جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو میں نے یہی فیصلہ کیا کہ بستی سے دور کسی تنہا آباد جگہ پر چل کر بیٹھ جاؤں۔ ایک طرف مجھے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ میں اس طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ پندرہ بیس قبریں ادھر ادھر بنی ہوئی تھیں۔ کونے میں ایک بارہ دری میں آ کر بیٹھ گیا۔ حوض کے پانی والا کٹورا میرے پاس ہی تھا۔ قبرستان میں آتے وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ اس حساب سے مجھے تین گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ رات جیسے جیسے گہری ہوتی گئی رات کی خاموشی پراسرار ہو گئی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ مجھے قبرستان میں کبھی بھی ڈر نہیں لگا تھا۔ میں بڑے سکون کے ساتھ بارہ دری کے ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ اس دوران مجھے نیند بھی آنے لگی۔ مگر میں نے اپنے اوپر نیند طاری نہ ہونے دی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ آسمان پر ستارے نظر آ رہے تھے۔ جب مشرق کی طرف آسمان پر سات ستاروں کی ٹولی ایک طرف کو جھکی ہوئی دکھائی دی تو میں سمجھ گیا کہ آدھی رات گزر گئی ہے۔ میری خانہ بدوشی کے زمانے میں مجھے اس بات کا تجربہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے مزید آدھا گھنٹہ انتظار کرایا۔ جب آدھا گھنٹہ بھی گزر گیا تو میں تیار ہو گیا۔

میں نے جیب سے نیلے سانپوں والا رومال نکال کر سامنے رکھ لیا۔ حوض کے پانی والا کٹورا اپنے قریب کر لیا۔ پھر رومال میں سے نیلے سانپ یعنی پاروتی کو آہستہ سے ہاتھ میں پکڑا اور اس کا منہ پانی کے کٹورے کے ساتھ لگا دیا۔ سانپ نے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا اظہار نہ کیا۔ اس نے فوراً کٹورے میں سے پانی پینا شروع کر دیا۔ اس وقت واقعی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ کیونکہ میرے سامنے ایک کرامت ہونے والی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ سانپ عورت کی شکل اختیار نہیں کرے گا۔ کبھی خیال آتا کہ نہیں سانپ ضرور پاروتی کی شکل میں آ جائے گا۔ نیلے سانپ نے کٹورے میں سے آدھے سے زیادہ پانی پی لیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے سر اٹھا کر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بارہ دری کے فرش پر لیٹ گیا۔ اس طرح سانپ کو لیٹتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

قبرستان میں چاروں طرف سناٹا اور رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ بارہ دری کا فرش سفید سنگ مرمر کا تھا۔ جس کی وجہ سے اندھیرے میں بھی نظر آ رہا تھا۔ میری نگاہیں نیلے سانپ پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک سانپ میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اپنی جگہ پر گول دائرے میں رینگنے لگا۔ کوئی ایک منٹ تک وہ اسی طرح اپنے دائرے میں رینگتا رہا۔ پھر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اپنا پھن کھول لیا اور دائیں بائیں گھومنے لگا۔ میں گھٹنے باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے سانپ میری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ وہ جس جگہ تک سنگ مرمر کا فرش بالکل خالی رہا۔ پھر جس جگہ سانپ بیٹھا ہوا تھا وہاں دھواں سا جمع ہونا شروع ہو گیا۔ اس دھوئیں نے آہستہ آہستہ انسانی جسم کی شکل اختیار کرنا شروع کر دی۔ پھر ہلکی سی روشنی دھوئیں میں ہوئی۔ جیسے بہت کمزور سی بجلی بادلوں میں چمک کر غائب ہو گئی ہو۔ اس روشنی کے بجھتے ہی پاروتی ظاہر ہو گئی۔ وہ میرے سامنے سانپ والی جگہ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھی۔ اندھیرے میں اس کی کیسری رنگ کی آنکھیں انگاروں کی طرح دمک رہی تھیں۔ میں نے اس کو آواز دی۔

"پاروتی پاروتی۔"

پاروتی کے چہرے پر مسکراہٹ کی نمود ہوئی۔ پھر میں نے ایک طویل عرصے کے بعد اس کی آواز سنی۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں انسانی شکل میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ پاروتی نہ صرف انسانی شکل میں واپس آئی تھی بلکہ اس کی کھوئی ہوئی یادداشت بھی واپس آ گئی تھی۔ اس نے چاروں طرف غور سے دیکھا اور پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟ یہ کونسی جگہ ہے؟"

تب میں نے اس سے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی بیان کر دی۔ وہ حیرت سے سنتی رہی۔ جب میں نے کہانی ختم کی تو اس نے کہا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ کسی نے مجھ پر اس وقت حملہ کیا تھا جب میں سانپ کے روپ میں تھی اور میرے جسم کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ایک پجاری نے مجھ پر منتر پھونکا تھا اور میں انسانی شکل سے سانپ کی شکل میں آ گئی تھی۔ پھر میں نے تمہیں دیکھا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا تھا مگر تم سے اپنی بات نہیں کر سکتی تھی۔ جس طرح پہلے جب میں سانپ کے روپ میں ہوتی تھی تو انسانی آواز میں تم سے بات کر لیا کرتی تھی۔ اس حالت میں میں کسی کسی وقت بالکل مدہوش ہو جاتی تھی۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ تم مجھے لے کر ایک مسلمان بزرگ کے پاس گئے تھے۔ میں نے ان کے چہرے کے گرد نور کی روشنی دیکھی تھی۔ اور میں نے ان کی بے حد تعظیم و تکریم کی تھی۔

میں نے پاروتی سے کہا۔

"پاروتی میں صبح بھی تمہیں ایک بزرگ کے پاس لے کر جا رہا ہوں۔ بابا سدا رنگ جس نے تم پر کئے گئے منتر کے طلسم کو توڑنے کا طریقہ بتایا تھا۔ انہوں نے ہی مجھے حکم دیا کہ میں درگاہ شریف خواجہ خواجگان کے حوض کا پانی تمہیں پلاؤں۔ میں نے ایسا

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہی کیا اور تم انسانی شکل میں واپس آگئیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ صبح پاروتی کو لے کر درگاہ شریف کی مسجد کے سامنے درخت کے نیچے ایک فقیر بیٹھا ملے گا۔ اس کے پاس چلنا۔ کیا تم اس فقیر کے پاس جانا چاہتی ہو؟"

پاروتی نے کہا "کیوں نہیں، میں ضرور جاؤں گی۔ مجھے تو اب معلوم ہوا ہے کہ تم مسلمانوں کا مذہب اسلام کوراتی مذہب ہے اور تمہارا دین ہی سچا ہے۔ میں تو شروع ہی سے اسلام کو دل سے مانتی تھی۔ مگر کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس فقیر کے پاس ضرور لے چلو۔ میں چاہتی ہوں کہ اس فقیر کے ہاتھ پر مسلمان ہو جاؤں۔"

یہ بات میں چاہتا تھا کہ پاروتی خود کہے۔ اور اپنی مرضی سے اسلام کا دین اختیار کرلے۔ اب جبکہ اس نے اس خواہش کا حرف حرف اظہار کردیا تو میں نے اسے کہا "ٹھیک ہے صبح مسجد والے فقیر کے پاس چلیں گے۔ ان کے آگے تم خود اس خواہش کا اظہار کرنا۔ وہ تمہیں کلمہ پڑھا کر مسلمان کردیں گے۔"

پاروتی بڑی خوش ہوئی۔ ہم نے قبرستان کی باقی ساری میں اسی طرح پرانے دنوں کو یاد کرکے ان کی باتیں کرکے باقی کی رات گزار دی۔ جب صبح کا اجالا پھیلا تو میں اسے ساتھ لے کر درگاہ شریف والی مسجد کے پاس آگیا۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کے سامنے بڑ کا سایہ دار درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ایک فقیر بوریئے پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا تھا۔ میں نے اور پاروتی نے قریب جاکر سلام کیا اور خاموشی اور ادب سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ فقیر کی آنکھیں بند تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور پاروتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بیٹی تم بڑی خوش قسمت ہو کہ اللہ نے تمہیں سیدھی راہ دکھا دی۔"

میں نے پاروتی کو اشارہ کیا۔ اس نے فقیر سے کہا

"بابا جی میں ہندو عورت ہوں۔ لیکن میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ مجھے مسلمان کردیں۔"

فقیر کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ اس نے کہا "تم پر خدا کی رحمت ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ فقیر ہمیں مسجد میں لے گیا۔ یہاں اس نے اپنی نگرانی میں پاروتی کو وضو کرایا۔ اپنے سامنے بٹھایا اور کلمہ شریف پڑھا کر مسلمان کیا اور کہا۔

"بیٹی ہم نے تمہارا نام پاروتی سے پروین رکھ دیا ہے۔ اب تم مسلمان ہو اور خدا کریم نے تمہیں اپنی رحمتوں کے سائے میں لے لیا ہے۔"

پاروتی نے دعا مانگ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور فقیر سے پوچھا۔

"بابا جی میرے پاس ایک طاقت تھی کہ میں انسان سے ناگن اور ناگن سے پھر انسان بن جاتی تھی۔ کیا یہ طاقت اب بھی میرے پاس رہے گی؟"

فقیر نے کہا "وہ طاقت تم نے اپنی جان پر سخت مصیبتیں اٹھا کر دن رات کی چلہ کشی اور محنت سے حاصل کی ہے۔ وہ طاقت تمہارے پاس ہی رہے گی۔ لیکن اس طاقت کو تم انسانوں کی بھلائی کے لئے استعمال کرو گی۔ اپنی اس طاقت سے کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔"

پاروتی یعنی پروین نے کہا "میں وعدہ کرتی ہوں بابا کہ ایسا ہی کروں گی۔"

فقیر نے اسے دعا دی اور کہا "جاؤ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔"

ہم نے فقیر کو سلام کیا اور مسجد سے نکل آئے۔ باہر آکر پروین (اب میں بھی بابا جی کو پروین ہی لکھوں گا) نے مجھ سے کہا۔

"میں کلکتہ جاکر ایک بار اپنا پرانا مکان دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔ لیکن دل میں ایک خیال ضرور آیا کہ کہیں اس علاقے کی گرو پجاری سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ ہم پھر کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نے پروین سے کہا۔

"ہمارے پاس ریل کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ ہم نے ریل میں بغیر ٹکٹ سفر کیا تو پکڑے جائیں گے۔"

پاروتی یعنی پروین سوچ میں پڑ گئی۔ تھوڑی دیر غور کرتی رہی۔ پھر بولی۔

"میرے کپڑے بھی بڑے پرانے ہو گئے ہیں اور یہ ہندوؤں کا لباس ہے۔ میں پہنا چاہتی ہوں کہ مسلمان عورتوں کی طرح شلوار قمیض اور دوپٹہ اوڑھوں۔ میں یہ ساڑھی کبھی نہیں پہنوں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ایک بات ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" پروین نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"میں دلی میں کسی دکان یا کارخانے میں نوکری کر لیتا ہوں۔ ہم پیسے جمع کر کے لکھنؤ کا کرایہ بھی اکٹھا کر لیں گے اور تم اپنا نیا لباس بھی بنوا لینا۔"

پروین کہنے لگی۔

"تمہاری یہ بیوقوفوں والی باتیں نہ گئیں اس طرح تو ہمیں نہ جانے کتنے دن دلی میں رہنا پڑے۔ نہیں۔ میں اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ میرے پاس جتنے پیسے تھے وہ تو ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو صرف اتنے پیسے ہیں کہ جن سے ہم دوپہر کا کھانا ہی کھا سکتے ہیں۔"

پروین کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے پوچھا۔ "کہاں جانا چاہتی ہو؟"

پروین نے کہا۔ "میں تمہیں اسی قبرستان میں لے جانا چاہتی ہوں جہاں ہم نے رات بسر کی تھی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ہم درگاہ شریف کی بستی کے پیچھے سے ہوتے ہوئے اس قبرستان میں آ گئے جو درختوں کے جھنڈ میں تھا اور جہاں ایک پرانی بارہ دری میں ہم نے رات گزاری تھی اور پروین سانپ سے انسانی شکل میں واپس آئی تھی۔ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ قبرستان میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس قبرستان میں کچھ ہی قبریں تھیں اور کچھ پرانی بھی تھیں۔ پروین نے کہا۔

"بارہ دری والی قبر پر چلو۔"

ہم بارہ دری میں آ گئے۔ پروین نے قبر کے گرد ایک چکر لگا کر اس کا جائزہ لیا۔ پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس قبرستان میں کسی بادشاہ کا کوئی خزانہ دفن ہے۔"

میں اس کا منہ تکنے لگا۔

"خزانہ؟ بادشاہ کا خزانہ؟"

"ہاں" پروین نے کہا۔

میں نے پوچھا۔ "لیکن اس خزانے کا سراغ کون لگائے گا؟"

پروین نے کہا۔ "اس کا سراغ نہ تم لگا سکتے ہو۔ نہ میں لگا سکتی ہوں۔ اس کا سراغ ایک سانپ لگائے گا۔"

"کون سا سانپ؟ مجھے تو یہاں کوئی سانپ دکھائی نہیں دیتا۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

پروین کہنے لگی۔

"ایک سانپ اس قبرستان میں موجود ہے۔ مجھے اس کی بو آ رہی ہے۔ میں اس کو جانتی ہوں اور خزانے کے بارے میں اس سے بات کرتی ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ پروین ایسا کر سکتی ہے۔ وہ پہلے بھی سانپوں کو بلا کر ان سے ان کی زبان میں بات کیا کرتی تھی۔ میں نے کہا۔

"بھلا بلاؤ سانپ کو۔"

پروین نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے وہ منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہوا میں پھونک ماری اور منہ سے رک رک کر وہ تین ایسی آوازیں نکالیں جیسے وہ سس سس کر رہی ہو۔ وہ کسی ان دیکھے سانپ سے اس کی زبان میں بات کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"جو سانپ اس قبرستان میں رہتا ہے میں نے اسے بلایا ہے۔"

میں بھی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں بارہ دری کے نیچے سامنے کی طرف پرانی قبروں کے درمیان مجھے ایک کالا سانپ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ پروین نے بھی اس سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"وہ دیکھو۔ سانپ آ رہا ہے۔ اس نے میری آواز سن لی تھی۔ میں اس سے خزانے کی بابت پوچھتی ہوں۔ تم اپنی جگہ پر بالکل بے حس و حرکت ہو کر بیٹھے رہنا۔"

میں ساکت ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں سانپ بارہ دری کے فرش پر نمودار ہوا۔ یہ کالے رنگ کا کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا سانپ تھا۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کی دھاریاں بھی تھیں۔ سانپ قبر کے اوپر سے ہو کر آیا اور پاروتی یعنی پروین کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے پھن کھولا اور تین بار سر جھکا کر پروین کو سلام کیا۔ پروین اب اس سے سانپوں کی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ وہ بات کر کے چپ ہو جاتی تو سانپ کے منہ سے بھی سس سس اور سسکار کی آوازیں نکلنے لگتیں۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا انسان اور سانپ کے درمیان یہ عجیب و غریب مکالمہ سن رہا تھا۔

جب ان کا مکالمہ ختم ہوا تو سانپ فرش پر بارہ دری کی سیڑھیوں کی طرف رینگنے لگا۔ پروین نے مجھ سے کہا۔

"سانپ ہمیں ایک دفن شدہ خزانے کے پاس لے کر جا رہا ہے۔ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔"

سانپ سیڑھیاں اتر کر قبروں میں چلنے لگا۔ ہم دونوں بھی اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ جہاں قبرستان کی سرحد ختم ہوتی تھی وہاں ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ کھنڈر کیا تھا محض ایک مٹی دیوار تھی جس کی پرانی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں اور زمین پر ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ سانپ اس بوسیدہ دیوار کے پیچھے آ کر رک گیا۔ پروین اور میں بھی وہاں پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ پروین نے ایک بار پھر سانپ سے اس کی زبان میں باتیں شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد سانپ دیوار کے قریب اینٹوں کے ڈھیر میں گھس گیا۔ میں نے پروین سے پوچھا۔

"سانپ کہاں گیا ہے؟"

وہ بولی۔ "یہاں کسی مغل بادشاہ کا بیش قیمتی خزانہ دفن ہے۔ یہ خزانہ زمین سے کئی گز نیچے دفن ہے۔ میں نے سانپ کو حکم دیا ہے کہ وہ بادشاہ کے مدفون خزانے میں سے کوئی قیمتی ہیرا موتی نکال کر لے آئے۔ کیونکہ ہم نے سارا خزانہ لے کر کیا کرنا ہے۔ جتنی ہمیں ضرورت ہے ہم اتنا ہی لے لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں۔ یہ تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ اتنی زیادہ دولت لے کر ہم کیا کریں گے۔"

ہم وہیں اینٹوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھ کر سانپ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ کوئی اس پانچ منٹ کے بعد سانپ اینٹوں میں سے باہر آتا نظر آیا۔ اس نے منہ میں ایک سرخ رنگ کا انگوٹھے جتنا بڑا موتی پکڑا ہوا تھا۔ سانپ نے وہ سرخ موتی پاروتی کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اگر میں اپنی داستان بیان کرتے کرتے پروین کی جگہ پاروتی کا نام بول جاؤں تو کوئی خیال نہ کیجئے گا بلکہ اسے پروین ہی سمجھئے گا۔ کیونکہ پاروتی کے اسلام

Prepared By: S.Sohail Hussain

قبول کرنے کے بعد اس کا نام نقیر بابا نے پروین رکھ دیا تھا۔ پروین نے موتی اٹھا کر نور سے دیکھا پھر مجھے دکھایا اور کہنے لگی۔

"مجھے میرے موتیوں کی زیادہ پہچان نہیں ہے کیا تمہیں پہچان ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں بھی اس معاملے میں تمہاری طرح اناڑی ہوں۔ یہ تو کوئی جوہری ہی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ موتی کتنا قیمتی ہے۔"

پروین نے سانپ کو اس کی زبان میں واپس جانے کا حکم دیا۔ سانپ سر جھکا کر پروین کو سلام کر کے قبروں کی طرف چلا گیا اور غائب ہو گیا۔ پروین کہنے لگی۔

"چلو اب دلی کے صرافہ بازار میں چل کر اس موتی کو کسی جوہری کے پاس فروخت کرتے ہیں۔ اس کو بیچ کر جو روپے ملیں گے ان سے ہم کلکتہ کے دو ٹکٹ خرید کر نکلتے چلے جائیں گے۔"

ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ موتی کس قدر قیمتی ہے۔ یہ راز تو دلی کے صرافہ بازار میں پہنچنے کے بعد کھلا۔ ہم دونوں قبرستان سے اٹھے اور نظام درگاہ شریف میں سے ایک تانگے میں بیٹھ کر شہر آ گئے۔ شہر پہنچ کر پوچھتے پوچھتے صرافہ بازار میں آئے تو وہاں دکانوں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ دن کے وقت بھی دکانوں میں بڑے بڑے بلب روشن تھے۔ شیشے کی الماریوں میں سونے کے زیورات چمک دمک رہے تھے۔ جوہری اپنی دکانوں پر بیٹھے کاروبار میں مصروف تھے۔

پروین نے پوچھا۔

"کس جوہری کے پاس چلیں گے؟"

میں نے کہا۔ "کسی کے پاس بھی چلے چلتے ہیں۔ ہمیں تو یہ موتی بیچنا ہے۔ ہمیں اس سے کیا کہ جوہری کیسا ہے؟"

میں پروین کو ساتھ لے کر ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ جوہری ہندو سیٹھ تھا۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ توند نکلی ہوئی تھی۔ پیچھے دیوار پر لکشمی دیوی کی تصویر لگی تھی جس پر گیندے کے پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ میں اور پروین لباس ہی سے مسلمان لگتے تھے۔

جوہری نے ہمیں ایک نظر دیکھا اور ہمیں بے حیثیت سمجھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟ کوئی تالا والا لگوانا ہے تو دوسرے بازار میں جاؤ۔ یہاں زیوروں کو تالا لگانے کا کام نہیں ہوتا۔"

اس حقیقت کا شروع ہی سے مجھے تجربہ ہو چکا تھا کہ امارت کے بعد اپنے آپ کو مسلمانوں سے برتر سمجھتے ہیں اور دل میں مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ انہیں حقیر کی حیثیت دیتے ہیں۔ مجھے ہندو سیٹھ کا یہ توہین آمیز رویہ سخت برا لگا۔ اسے پروین نے بھی محسوس کیا۔ خزانے کا موتی میری جیب میں تھا۔ میں نے کہا۔

"ہم کسی زیور کو تالا لگوانے نہیں آئے۔"

ہندو سیٹھ نے چڑ کر کہا۔

"تو پھر منہ اٹھائے اندر کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ایک خاندانی موتی ہے۔ ہمارے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

ہندو سیٹھ نے بے اعتنائی سے کہا۔

"دکھاؤ دکھاؤ میاں کونسا موتی ہے نکالو۔ ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔"

میں نے مخملی خزانے کا سرخ موتی نکال کر سیٹھ کے سامنے شیشے کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ میری نگاہیں سیٹھ کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ موتی کو دیکھتے ہی سیٹھ کے چہرے پر ایک نمایاں تبدیلی ظاہر ہو گئی تھی۔ اس نے آلوچے کے سائز کا سرخ موتی اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس سے زیادہ قیمتی موتی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مگر ہندو سیٹھ بڑا گھاگ اور مکار آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ یہ انمول موتی ہمیں کہیں سے ہاتھ لگ گیا ہے۔ فوراً ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ بے نیازی سے موتی ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ نقلی موتی ہے میاں صاحب۔ اس کو لے جاؤ۔"

پروین نے کہا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"جی ہاں! یہ موتی نقلی نہیں ہے۔ اصلی ہے۔ آپ اسے غور سے دیکھیں۔"

ہندو سیٹھ نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

"جی ہاں! یہ نقلی ہے۔ میں نے غور سے دیکھ لیا ہے۔"

میں نے موتی اٹھا لیا۔ سیٹھ کے پاس اس کا ایک ملازم شیشے کے شوکیس کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ وہ اپنے لباس سے مسلمان لگتا تھا۔ اس نے بھی موتی کو دیکھا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے جس بادشاہ کے خزانے کا یہ موتی ہے اس کو کسی نے نقلی موتی دے دیا ہو۔ اتنے میں ہندو سیٹھ کو اندر سے کسی نے آواز دی۔ وہ کرسی پر سے اٹھ کر دکان کے اندر چلا گیا۔ اسکے ساتھ ہی ملازم نے ہماری طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ موتی اصل ہے اور بڑا قیمتی ہے۔ ہندو لالے کی باتوں میں نہ آنا۔"

یہ کہہ کر مسلمان ملازم شوکیس کی جھاڑ پونچھ کرتا دوسری طرف چلا گیا۔ میں نے پروین سے کہا۔

"لگتا ہے یہ ہندو سیٹھ ہم سے یہ قیمتی موتی لونے پونے اٹھیانا چاہتا ہے۔"

پروین نے کہا۔

"جو دیتا ہے لے لو۔ ہمیں اتنے پیسے لے کر کیا کرنے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مگر ہم بیوقوف بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سیٹھ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔"

اس دوران ہندو سیٹھ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ہماری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"میاں! ایک بات کروں گا۔ میں اس موتی کے تمہیں پانچ روپے دے دوں گا۔ ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں دوں گا۔ منظور ہے تو موتی دے جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "مگر سیٹھ صاحب! یہ بڑا قیمتی موتی ہے۔"

"تو تم اس کا کیا لو گے؟ تم ہی بتا دو۔"

ہندو سیٹھ نے ترش لہجے میں کہا۔ میں نے کہا

"ہم تو اس کے کم از کم پانچ ہزار روپے لیں گے۔"

ہندو سیٹھ بولا۔

"میرا بڑا بھائی اندر کمرے میں بیٹھا ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ سیٹھ اندر پہلے ہی سے اپنے بڑے بھائی سے بات کر آیا تھا کہ مغلیہ دور کا ایک نایاب موتی بکنے کو آیا ہے جو اتنا قیمتی ہے کہ ہم ساری دکان کے بھی اسے نہیں خرید سکتے۔ میں نے موتی جیب میں رکھ لیا اور ہندو سیٹھ کے ساتھ دکان کے اندر جو چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا وہاں آ گئے۔ کمرے میں میز کرسیاں لگی تھیں۔ ایک بڑی سنگار شکل والا ہندو مالک کرسی پر بیٹھا ترازو میں چھوٹے چھوٹے سفید موتی تول رہا تھا۔ یہ سیٹھ کا بڑا بھائی تھا۔ سیٹھ بھی ہمارے ساتھ ہی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔

"یہ نقلی موتی کے پانچ ہزار مانگتے ہیں۔ کمند لال جی!"

کمند لال نے ہماری طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ترازو ایک طرف رکھا اور بولا۔

"اچھا۔ دکھاؤ کونسا موتی ہے؟"

میں نے سرخ موتی اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے موتی کو الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔

"یہ موتی تو چوری کا ہے۔ تم لوگوں نے کہاں سے چرایا ہے؟ سچ سچ بتا دو نہیں تو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا۔

"یہ چوری کا نہیں ہے۔ یہ ہمارا خاندانی موتی ہے۔ ہمارے حالات خراب ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس خاندانی موتی کو فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس دوران کمند لال پولیس کو فون کر چکا تھا۔ ہم ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک دم سے ایک سکھ تھانیدار اور تین سپاہی کمرے میں

Prepared By: S.Sohail Hussain

داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی مجھے اور پروین کو حراست میں لے لیا۔ سکھ تھانیدار نے اسی وقت مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ میں نے سخت احتجاج کیا مگر میری کسی نے نہ سنی۔ سپاہی مجھے اور پروین کو پکڑ کر دکان کے باہر لے آئے۔ باہر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ہمیں زبردستی گاڑی میں دھکیل دیا گیا اور گاڑی تھانے کی طرف روانہ ہو گئی۔

تھانے پہنچ کر مجھے اور پروین کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ میں نے پروین سے کہا۔

"تم دیکھ رہی ہو کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ پھر تم اپنی طاقت سے کام کیوں نہیں لیتی؟"

پروین کہنے لگی۔

"میں ایک خاص وقت کا انتظار کر رہی ہوں۔"

اتنے میں سکھ تھانیدار حوالات کی سلاخوں والے دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بڑی رعونت سے بولا۔

"سچ سچ بتا دو تم نے موتی کہاں سے چرایا ہے۔ نہیں تو عدالت کی طرف سے تم دونوں کو پانچ پانچ سال کی سزا ہو جائے گی۔"

میں نے سکھ تھانیدار کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم چور نہیں ہیں۔ یہ ہمارا خاندانی موتی ہے۔ مگر وہ نہ مانا اور چلا گیا۔ اس حوالات میں پہلے سے ایک ملزم کمبل اوڑھے کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب تھانیدار چلا گیا تو ملزم نے ہم سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ بولا۔

"یہ تھانیدار صرافہ بازار کے ہندو سیٹھوں سے ملا ہوا ہے۔ جب بھی کوئی کم حیثیت کا آدمی کوئی قیمتی زیور یا ہیرا موتی لے کر آتا ہے تو سیٹھ سکھ تھانیدار کی مدد سے اسے حوالات میں پہنچا دیتا ہے اور اس کا مال خود ہضم کر جاتا ہے۔ تھانیدار کو ہندو سیٹھ ہر ماہ ایک خاص رقم رشوت کے طور پر دیتا ہے۔"

میرے ساتھ پروین بھی اس ملزم کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"بیٹا۔ کیا اب بھی تم خاموش رہو گی؟"

پروین کہنے لگی۔

"اب میرا فرض بن گیا ہے کہ میں سادہ لوح لوگوں کو ان ٹھگوں سے نجات دلاؤں۔"

پھر اس نے ملزم کی طرف دیکھا جس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی مگر بھیانک زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ کمزور اور زیادہ عمر کا لگ رہا تھا۔ پروین نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"کیا اس آدمی کے سامنے طاقت کا مظاہرہ کروں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

پروین کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگی۔

"تم حوالات میں میرا انتظار کرو۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گی۔"

ملزم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ارے بی بی! حوالات کو تو باہر سے تالا لگا ہے باہر سنتری بھی پہرہ دے رہا ہے۔ تم کیسے باہر جاؤ گی؟"

پروین نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ دیوار کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ زور سے لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ملزم تعجب سے پروین کو تک رہا تھا کہ یہ عورت لمبے لمبے سانس کیوں لے رہی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بھئی! کیا تمہاری گھر والی کو کوئی بیماری لگی ہوئی ہے؟"

میں نے اسے جھڑک دیا۔

"خاموش رہو۔"

ملزم چپ ہو گیا۔ اس دوران پروین اچانک ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔ اس

Prepared By: S.Sohail Hussain

کی جگہ ایک بالشت بھر کا نیلا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ حوالاتی ملزم کا تو رنگ اڑ گیا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سانپ کو دیکھنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس کی زبان سے صرف اتنا نکلا۔

"س س سانپ"

اور وہ وہیں دہشت کے مارے بے ہوش ہو کر لڑھک گیا۔ مجھے پروین کی آواز آئی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

حوالات کے دروازے پر جو سنتری پہرہ دے رہا تھا وہ سٹول پر بیٹھا تھا اور اس کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ پروین نیلے سانپ کے روپ میں حوالات کی سلاخوں میں سے رینگ کر باہر نکل گئی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ سانپ سنتری کی ٹانگوں کے قریب گیا اور میرے دیکھتے دیکھتے اس نے سنتری کو ڈس لیا۔ سنتری ذرا سا اچھلا اس نے اپنی ٹانگ کو تھپک کر دیکھا اور وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حوالات تھانے کی عمارت کے کونے میں واقع تھی۔ یہاں سے تھانے کے دفتر پر نظر نہیں پڑتی تھی۔ سنتری کے بے ہوش ہوتے ہی پروین سانپ سے انسانی شکل میں واپس آ گئی۔ سنتری کی بیلٹ کے ساتھ چابیوں کا گول رنگ لٹکا ہوا تھا۔ پروین نے رنگ نکالا۔ اس میں سے ایک چابی حوالات کے تالے کو لگتی تھی۔ پروین نے دو تین چابیاں لگائیں۔ چوتھی چابی لگ گئی۔ وہ دروازہ کھول کر بولی۔

"باہر آ جاؤ۔"

میں جلدی سے حوالات سے باہر آ گیا۔ ہم دونوں حوالات کے پیچھے سے تیز تیز چلتے سڑک پر آ گئے۔

سڑک پر آتے ہی میں نے پروین سے کہا۔

"ہمارا موتی اس کمینے ہندو سیٹھ کے قبضے میں ہے۔ ہمیں اس سے اپنا موتی واپس لینا ہے۔"

پروین بولی۔ "ہم وہیں جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تھانیدار کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ ہم حوالات سے فرار ہو گئے ہیں۔ وہ ضرور ہماری تلاش میں پولیس لے کر ہندو سیٹھ کی دکان پر آئے گا۔"

پروین نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ اب میں ان سب معاملوں سے سمجھ لوں گی۔"

میں نے پروین سے پوچھا کہ کیا اس نے سنتری کو ہلاک کر دیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔

"نہیں۔ میں اب کسی بھی انسان کو ناحق ہلاک نہیں کر سکتی۔ مجھے میرا دین اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میری طاقت صرف انسانیت اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف استعمال ہونے کے لئے وقف ہے۔"

ہم جتنی جلدی نکل سکتے تھے پولیس سٹیشن کے علاقے سے نکل گئے۔ ہمارے پاس اب اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ تانگے یا رکشے میں بیٹھ کر صراف بازار پہنچتے۔ ہمیں صراف بازار کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ پوچھتے پوچھتے جب ہم صراف بازار میں آئے تو شام ہو چکی تھی اور بازار کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نے پروین سے کہا۔

"مجھے خطرہ ہے کہ پولیس سیٹھ کی دکان پر ہمارا انتظار نہ کر رہی ہو۔ پولیس اطلاع ملنے پر تلاش میں یہاں ضرور آئی ہوئی ہو گی۔"

پروین بازار میں ایک طرف رک گئی۔ ہندو سیٹھ کی دکان ہم نے پہچان لی تھی۔ وہ ہم سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ بازار میں لوگوں کی کافی آمد و رفت تھی۔ سونے چاندی کے زیورات سے بھری ہوئی دکانیں دن کے مقابلے میں شام کے وقت زیادہ جگمگا رہی تھیں۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہندو سیٹھ سے ہمیں اپنا قیمتی موتی بھی واپس لینا ہے۔"

پروین کہنے لگی۔

"ایک کام کرتے ہیں۔ میں سانپ کا روپ بدلتی ہوں۔ تم مجھے اپنی جیب میں چھپا لینا۔ اس کے بعد سیٹھ کے پاس جا کر اس سے اپنا موتی واپس مانگنا۔ اگر اس نے سیدھے سبھاؤ دے دیا تو بڑی اچھی بات ہو گی۔ ہم سیٹھ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ اس نے موتی دینے سے انکار کیا تو پھر میں معاملہ خود ہی ٹھیک کر لوں گی۔"

بازار میں لوگ آ جا رہے تھے۔ وہاں پروین سانپ کا روپ اختیار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔

"وہ ایک گاڑی کھڑی ہے۔ اس کے پیچھے آ جاؤ۔"

بازار میں ایک دکان کے قریب بند گاڑی کھڑی تھی۔ میں اور پروین اس کے پیچھے چلے گئے۔ اب ہم لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ پروین نے آنکھیں بند کر کے دو تین گہرے سانس لئے۔ دوسرے لمحے میرے سامنے زمین پر ایک نیلے رنگ کا سانپ موجود تھا۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور تیز قدموں سے ہندو سیٹھ کی دکان کی طرف چل پڑا۔

مجھے باہر کوئی پولیس کا سپاہی دکھائی نہ دیا۔ ہندو سیٹھ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہی تھا

کھول کر اس پر کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

"سیٹھ جی! ہمارا موتی واپس کر دو۔ میں اپنا موتی واپس لینے آیا ہوں۔"

ہندو سیٹھ نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک دم غصے میں آ کر بولا۔

"تم چور ہو۔ تم حوالات توڑ کر بھاگے ہو۔ پولیس تمہارے پیچھے گئی ہے۔ میں ابھی تھانیدار صاحب کو فون کرتا ہوں۔"

وہ ٹیلی فون کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے اس کا بازو کھینچ لیا اور کہا۔

"ہم فساد نہیں کرنا چاہتے۔ ہم کسی کو کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ تم نے ہمارا قیمتی موتی پولیس کی مدد سے ہم سے ہتھیا لیا ہے۔ وہ ہمیں واپس کر دو۔"

دکان کے دوسرے ملازم ایک دم وہاں آ گئے۔ سیٹھ نے چلا کر کہا۔

"اس کو پکڑ لو۔ یہ جیل سے بھاگا ہوا چور ہے۔"

جیسے ہی سیٹھ کے نوکر میری طرف بڑھے میں نے جیب سے سانپ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور چلا کر بولا۔

"خبردار! اگر کوئی میرے قریب آیا تو زندہ نہیں بچے گا۔"

میں نے سیٹھ سے ایک بار پھر کہا۔

"سیٹھ میری امانت واپس کر دو۔ یہ ہماری شرافت ہے کہ ہم نے ابھی تک تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"

ایک ملازم نے مجھے پیچھے سے ایسا دھکا دیا کہ سانپ میری ہاتھ سے چھوٹ کر کاؤنٹر پر جا گرا۔ ملازموں نے مجھے قابو کر لیا اور دو نوکر سانپ کو مارنے کے لئے بڑھے۔ سانپ نے ایک خوفناک پھنکار ماری۔ میں نے دیکھا کہ پھنکار کے ساتھ سانپ کے منہ سے چنگاریوں کی پھل جھڑیاں سی نکل کر شراروں کی طرح دکان کے اندر اڑنے لگیں۔ سب خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دبک گئے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں دکان کے اندر جو چھوٹا کمرہ تھا شور سن کر اس کے اندر سے ہندو سیٹھ کا مکار بھائی بھی

Prepared By: S.Sohail Hussain

باہر آگیا۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ سانپ کو کسی شے سے مار
دیں۔ مگر پروین اتنی ناسمجھ نہیں تھی کہ اپنے آپ کو سانپ کے روپ میں ان کے
آگے زیادہ دیر تک رہنے دیتی۔

دوسری پھنکار کے ساتھ ہی اس نے انسانی شکل اختیار کر لی۔ اس کرامت کی وہاں
اشد ضرورت تھی۔ صرف یہی ایک طریقہ ان ضعیف الاعتقاد توہم پرست ہندوؤں کو
مطیع کرنے کا رہ گیا تھا۔ ذرا تصور کریں کہ آپ کے سامنے ایک سانپ بیٹھے بیٹھے
اچانک عورت بن جائے تو آپ کا کیا حال ہو گا۔ آپ تو ششدر ہو کر رہ جائیں گے۔
یہی حال وہاں دکان کے اندر ملازموں اور دکان کے دونوں ہندو سیٹھوں کا ہوا۔ پروین کو
ان لوگوں نے پہچان تو لیا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو میرے ساتھ موتی بیچنے دکان پر
آئی تھی۔ مگر یہ بات وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ عورت حقیقت میں ایک
ناگن ہے جو عورت کی شکل میں چل پھر رہی تھی۔ ان لوگوں پر ایک دہشت طاری ہو
گئی تھی۔ پروین کاؤنٹر سے نیچے اتر آئی۔ اس نے سیٹھ سے کہا۔

"جو موتی ہم تمہارے پاس لائے تھے وہ ہمیں واپس کر دو۔"

ہندو سیٹھ سے مارے دہشت کے بات نہیں ہو رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ رکھے تھے
ہاتھ سوائے مسلمان نوکر کے سب نے جوڑے ہوئے تھے۔ وہ پروین کو کوئی آسمانی دیوی
سمجھ رہے تھے۔ ہندو سیٹھ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے شما کر دو دیوی جی۔"

پروین نے کہا۔

"زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہمارا موتی نکالو۔"

سیٹھ نے اس وقت ایک دراز کھولا۔ اس میں سے ہمارا آلو جتنے کے سائز کا موتی
نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر رحم طلب انداز میں بولا۔

"دیوی میرا میری غلطی معاف کر دو۔ ہم سے بھول ہو گئی تھی۔ ہمیں شما کر دو۔"

پروین نے موتی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"یہی موتی ہے؟"

میں نے موتی کو غور سے دیکھا۔ وہ غرانے والا موتی ہی تھا۔ میں نے کہا۔

"موتی تو وہی ہے مگر ان دھوکے بازوں اور ٹھگوں کو بھی کچھ سزا ملنی چاہیے تاکہ
پھر انہوں نے کسی ضرورت مند غریب لوگوں کو نہیں لوٹنا ہو گا۔"

دونوں سیٹھ ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگے۔ دکان کے ملازموں پر تو سانپ کے
اچانک انسان بن جانے کے شعبدے کا اس قدر شدید اثر ہوا تھا کہ وہ جیسے سکتے کے عالم
میں تھے اور ایک طرف دبکے ہمیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہے تھے کہ یہ لوگ
کہاں سے آئے ہیں۔

پروین نے کہا۔

"میں اگر چاہوں تو صرف ایک پھنکار مار کر تمہاری ساری دکان کو جلا کر راکھ کر
سکتی ہوں۔ مگر میرا دین اسلام مجھے حکم دیتا ہے کہ اگر ایک آدمی اپنے گناہوں سے توبہ
کر لے اور آئندہ وہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کرے تو اسے معاف کر دو۔ اگر تم مجھ سے
یہ وعدہ کرو کہ تم آئندہ کسی کے ساتھ دھوکہ نہیں کرو گے۔ کسی مصیبت زدہ کی
مصیبت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو میں تمہیں معاف کر سکتی ہوں۔ ورنہ میرے
صرف ایک بار پھنکارنے کی دیر ہو گی اور یہ ساری دکان شعلوں میں بھڑکنے لگے گی۔"

دونوں سیٹھ پروین کے آگے سجدے میں گر گئے۔ پروین نے میری طرف دیکھا
اور بولی۔

"دیکھو یہ فرق ہوتا ہے ایک مسلمان اور ہندو میں۔ مسلمان خدا کے سوا کبھی کسی
کے آگے نہیں جھکتا۔ مگر ان دونوں ہندوؤں کی جب جان پر بنی تو میرے آگے سجدے
کرنے لگے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد پروین میں ایک زبردست اور
قیمتی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہندو سیٹھوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن یاد رکھنا اگر اب تم نے کسی کو دھوکا دے

Prepared By: S.Sohail Hussain

کر اس کا بل ہوتا تو میں جہاں بھی ہوں گی اسی وقت یہاں پہنچ جاؤں گی اور تمہاری دکان کو آگ لگا دوں گی۔"

دونوں بھائی بھرے سے سر اٹھا کر روتے ہوئے بولے

"دیوی! ہم کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیں گے۔"

پروین نے کہا

"ٹھیک ہے۔ اب آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

پروین کاؤنٹر سے نیچے اتر آئی۔ اس نے دکان کے ملازموں سے کہا

"تم لوگ بھی اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاؤ۔ یوں سمجھو کہ یہاں کچھ نہیں ہوا۔"

پھر اس نے سیٹھ سے کہا

"لالہ جی! اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر دکان کے پچھلے کمرے میں چلو۔"

دونوں سیٹھ فوراً دکان کے پچھلے کمرے میں آ گئے۔ پروین نے میری طرف گردن موڑ کر کہا

"آخر ہمیں موتی بھی فروخت کرنا ہے۔"

دکان کے عقبی کمرے میں آ کر پروین نے دروازہ بند کر دیا اور مجھ سے کہا

"موتی نکال کر مجھے دو۔"

میں نے جیب سے موتی نکال کر پروین کے حوالے کر دیا۔ اس وقت دونوں سیٹھ میز کے قریب کرسیوں پر سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ پروین نے سرخ موتی ان کے سامنے میز پر رکھ دیا اور کہا

"اب دیانت داری سے بتاؤ کہ اس موتی کی اصل قیمت کتنی ہے؟"

بڑے سیٹھ نے ہاتھ باندھ کر کہا

"دیوی جی! اگر آپ اس کی اصل قیمت پوچھتی ہیں تو وہ اتنی زیادہ ہے کہ میں اپنی ساری دکان زیوروں اور ہیرے جواہرات کے ساتھ فروخت کر دوں تو اس موتی کی

پوری قیمت بھی ادا نہیں ہو گی۔ یہ سرخ موتی نایاب ہے۔ اس ملک کا امیر سے امیر آدمی بلکہ راجہ مہاراجہ بھی اس موتی کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔"

پروین کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے ہم یہ موتی تمہارے پاس فروخت نہیں کریں گے کیونکہ تم اس کی اصل قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ مگر تم نے ہم دونوں کی بے عزتی کی ہے تمہاری وجہ سے ہمیں پولیس چوروں کی طرح ہتھکڑی لگا کر لے گئی اور حوالات میں بند کر دیا۔ تمہیں اس کا ہرجانہ دینا ہو گا۔"

لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا

"میں ہرجانے بھرنے کو تیار ہوں۔ آپ حکم کریں دیوی جی!"

میں دل میں پروین کی ذہانت کی تعریف کرنے لگا۔ اس نے اچھا کیا جو اپنے پہلے موتی ان دھوکے بازوں کے پاس فروخت نہیں کیا۔ یہ اس لائق نہیں تھے کہ اربوں روپے کی مالیت کا قدیم انمول موتی ان کو چند ہزار روپوں کے عوض دے دیا جاتا۔

پروین نے کہا

"تمہاری تجوری میں جتنے کرنسی نوٹ ہیں سب یہاں منگواؤ۔"

"جو حکم دیوی جی!"

لالہ جی نے اپنے چھوٹے بھائی کو چابی دے کر کہا

"کندن لال جی! تجوری کا سارا مال لے آؤ۔"

کندن لال باہر چلا گیا۔ پروین کہنے لگی۔

"تم لوگ دیوی دیوتاؤں کی پوجا بھی کرتے ہو اور لوگوں سے دھوکے بھی کرتے ہو۔ ان کی دولت لوٹتے ہو۔ یقین کرو اگر میں مسلمان نہ ہوتی تو تم دونوں بھائیوں کو کبھی زندہ نہ چھوڑتی۔"

سیٹھ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"دیوی جی! کیا آپ مسلمان ہیں؟"

Prepared By: S.Sohail Hussain

پروین نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

"خاموش ہو کر بیٹھے رہو۔"

سیٹھ وہیں سہم کر دبک گیا۔ اتنے میں اس کا بھائی تھیلے میں تجوری کی ساری دولت ڈال کر آ گیا۔ اس نے سارے نوٹوں کی گڈیاں میز پر الٹ دیں۔ پروین نے مجھ سے پوچھا۔

"کتنی رقم کی ضرورت ہو گی؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے پانچ دس ہزار روپے کافی ہوں گے۔"

میں نے دیکھا کہ دونوں ہندو سیٹھوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی کہ صرف پانچ دس ہزار روپے میں ان کی جان چھوٹ رہی تھی۔ پروین نے دس ہزار روپے کے نوٹ جو کہ سو سو کی شکل میں تھے گن کر نکال لئے اور انہیں رومال میں باندھ کر میرے حوالے کیا اور ہندو سیٹھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"اس دولت میں سے تمہاری جائز کمائی کتنی ہے؟"

سیٹھ آئیں بائیں کرنے لگا۔ پروین نے سخت لہجے میں چلا کر کہا۔

"بکواس بند کرو۔ یہ بتاؤ اس میں سے تمہاری جائز کمائی کتنی ہے۔ خبردار جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں سب کچھ جانتی ہوں صرف تمہاری زبان سے سچ سننا چاہتی ہوں۔"

سیٹھ نے ہاتھ باندھ کر کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں بتاتا ہوں دیوی جی۔"

اس نے میز پر رکھی کرنسی نوٹوں کی گڈیوں کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصہ اپنی طرف کر کے باقی دو حصوں کے نوٹ الگ کر کے بولا۔

"دیوی جی! یہ دو حصے میری جائز کمائی کے نہیں ہیں۔ جتنی میری جائز کمائی تھی وہ میں نے اپنی طرف کر لی ہے۔"

تب پروین نے کہا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔"

دونوں سیٹھ کرسیوں پر سے اٹھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ پروین نے میرے دیکھتے دیکھتے پستول ماری۔ اس کے منہ سے چنگاریاں نکل کر نوٹوں کی گڈیوں پر پڑیں اور انہیں آگ لگ گئی۔ مجھ سے کہا۔

"چلو۔ اب یہاں ہمارا کوئی کام نہیں۔ میں نے اس سیٹھ کی حرام کی کمائی کو آگ لگا دی ہے۔"

دونوں سیٹھ گھبرا کر آگ بجھانے کی کوشش میں لگ گئے اور ہم دونوں کمرے سے نکل کر دکان سے باہر آ گئے۔ میں نے پروین سے کہا۔

"وہ کم بخت تو آگ بجھا کر نوٹوں کو بچا لیں گے۔"

پروین نے مسکرا کر کہا۔

"ان کا باپ بھی اس آگ کو نہیں بجھا سکتا وہ آگ جہنم کی آگ ہے۔"

ہم صرف بازار میں سے گزرتے ہوئے چوک میں آئے تو رکشا ٹیکسی دیکھنے لگے۔ میں نے پروین سے کہا۔

"یہاں سے سیدھا سٹیشن پر چلتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ لکھنؤ کی گاڑی کس وقت جاتی ہے۔"

وہ بولی۔ "ہمارے پاس اتنے پیسے ہیں۔ آخر ان کو بھی تو ٹھکانے لگانا ہو گا۔ میرا دل تاج محل دیکھنے کو چاہتا ہے۔ چلو یہاں سے آگرہ چلتے ہیں۔ آج کل چاندنی راتیں ہیں۔ سنا ہے چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ بڑا دلکش ہوتا ہے۔"

مجھے خود بھی تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ہمارے پاس روپے بھی کافی تھے۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو۔ آگرے چلتے ہیں۔ چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ دیکھیں گے۔"

ہم نے چوک میں سے ایک خالی ٹیکسی پکڑی اور سیدھا دلی کے ریلوے سٹیشن پر

Prepared By: S.Sohail Hussain

آ گئے۔ میرے پاس دس ہزار روپے کی رقم سو سو کے نوٹوں میں موجود تھی جسے میں نے رومال میں لپیٹ کر اپنی قمیض کے اندر کمر کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ صرف سو سو کے دس نوٹ نکال کر واسکٹ کی جیب میں رکھ لئے تھے۔ اس زمانے میں سو روپے کے نوٹ کی بڑی قیمت ہوتی تھی۔ بڑوا لو تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کرنے کے لئے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا تو وہ بولا۔

"صاحب جی میرے پاس چھٹا نہیں ہے۔"

پروین نے پوچھا۔ "تمہارا کیا نام ہے بھائی؟"

ٹیکسی والا بولا۔ "محمد حنیف۔"

پروین نے میرے ہاتھ سے سو روپے کا نوٹ لے کر اسے دیا اور کہا۔

"یہ تم رکھ لو۔ یہ تمہارا ہے۔"

اور وہ ٹیکسی والے کو حیران و پریشان چھوڑ کر مجھے ساتھ لئے سٹیشن کی اصلی کی طرف چلے گئی۔ میں نے پروین کے اس فراخ دلانہ عمل پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

آگرہ جانے والی گاڑی ہمیں رات کے نو بجے ملی۔ اس گاڑی نے ہمیں رات کے پچھلے پہر آگرہ پہنچایا۔ سٹیشن سے باہر آ کر میں نے پروین سے کہا۔

"پروین! ہمارے پاس خرچ کرنے کے لئے بہت پیسے ہیں۔ ہم کسی اچھے ہوٹل میں کمرہ لے لیتے ہیں۔"

پروین مسکرا رہی تھی کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے چلو کسی اعلیٰ ہوٹل میں چلتے ہیں۔"

سٹیشن کے باہر سے ہم نے ٹیکسی لی اور اسے کہا کہ شہر کے سب سے اچھے ہوٹل میں لے چلو۔ اس زمانے میں ابھی فائیو سٹار ہوٹلوں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ انگریزوں کی سہولیات کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑے بڑے شہروں میں دو تین اعلیٰ ہوٹل ضرور بنے ہوتے تھے۔ ٹیکسی والا ہمیں آگرہ شہر کے مضافات میں اسی قسم کے ایک اعلیٰ ہوٹل میں لے آیا۔ یہ ہوٹل ایک بہت عالی شان کوٹھی کی شکل کا تھا۔ اردگرد باغیچہ تھا جس میں

درخت اور پھولوں کے قطعے تھے۔ دوسری منزل کی کھڑکیوں پر بتیاں روشن تھیں۔ ہوٹل کے پورچ میں ایک جانب تین چار موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سارے ہوٹل پر ایک بڑی عجیب قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں اور پروین ہوٹل کی لابی میں اس جگہ آ گئے جہاں کاؤنٹر کے پیچھے ایک خوش پوش نوجوان موجود تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"ہمیں ایک کمرہ چاہئے۔"

اس نے ہم دونوں کو اوپر سے نیچے تک ایک سرسری سی نظر سے دیکھا اور رجسٹر کھول کر بولا۔

"سر! آپ کو سنگل بیڈ روم والا کمرہ چاہئے کہ ڈبل بیڈ روم والا؟"

میں نے کہا۔ "ڈبل بیڈ روم والا۔"

اس نے کاروباری خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ڈبل بیڈ روم والے کمرے کا چوبیس گھنٹے کا کرایہ سو روپے ہو گا۔"

اس زمانے کا سو روپیہ آج کے دو ہزار روپے کے برابر ہوتا تھا۔

میں نے واسکٹ کی جیب سے سو سو کے تین نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم تاج محل کی سیر کرنے آئے ہیں ہو سکتا ہے زیادہ دن ٹھہریں۔ فی الحال آپ تین دن کا کرایہ جمع کر لیں۔"

کاؤنٹر کلرک نے میرا اور پروین کا نام رجسٹر میں درج کیا اور ہمارا ایڈریس پوچھا۔ میں نے دلی شہر کا ایک جعلی ایڈریس لکھوا دیا۔ ہوٹل کا ملازم ہمیں ساتھ لے کر دوسری منزل میں آیا اور کمرہ کھول دیا۔ یہ تین کمرے تھے۔ دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم۔ کچن باتھ ساتھ ہی تھا۔ ہم نے سب سے پہلے باری باری نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے بیڈ روم میں جا کر لیٹ گئے۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

دوسرے دن ہم نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ آگرہ کے بڑے بازار میں جا کر اپنے لئے نئے کپڑے نئے جوتے اور جرسیاں وغیرہ خریدیں۔ پروین نے اپنے لئے معمولی سنگھار کا کچھ سامان خریدا۔ ہوٹل میں واپس آ کر ہم نے بھٹ کیا اور نئے کپڑے پہن کر ٹیکسی لی اور تاج محل کی سیر کو نکل گئے۔

چاندنی رات کو تو ہمیں تاج محل دیکھنا ہی تھا مگر میں دن کے وقت بھی اس تاریخی عمارت اور محبت کی غیر فانی یادگار کو دیکھنا چاہتا تھا۔ دور سے دریا کے کنارے تاج محل کی سفید عمارت ایسے لگ رہی تھی جیسے کسی نے ہیرا تراش کر دریا کنارے رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلے ہم نے ممتاز محل کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ پھر تاج محل کی روشوں پر ٹہلتے رہے۔ غیر ملکی سیاح اور مقامی لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ گرمیاں شروع ہونے ہی والی تھیں۔ دوپہر کے وقت دھوپ میں کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ رات کو معمولی سی خنکی ہو جاتی تھی۔ ہم ایک سرسبز قطعے میں گلاب کے پھولوں کی کیاری کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پروین کہنے لگی۔

"جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے میرے دل کو ایک عجیب سکون محسوس ہو رہا ہے میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی۔۔۔"

میں نے کہا۔ "اللہ نے تم پر اپنا خاص فضل کیا ہے۔ واقعی تم خوش نصیب ہو کہ دین اسلام کے نورانی حلقے میں آ گئی ہو۔"

پروین نے کلی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر جالی دار دوپٹہ تھا۔ اس لباس میں وہ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس کا رنگ اب بھی جامنی رنگ کا تھا۔ مگر سلاخوں کے دھوئے اور سلاخوں کو کھانے سے اسے بہت بل چکی تھی۔ اس کی صحت پہلے سے کافی بہتر ہو رہی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"ہمارے پاس بہت سارے روپے بچ ہو گئے ہیں۔ ان کا ہم کیا کریں گے؟"

پروین کہنے لگی۔

"ہمیں تو اتنے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ اپنی ضرورت کے کچھ روپے ضرور رکھ لیں گے۔"

پھر اس نے اچانک میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کیا تم واقعی پاکستان چلے جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "خیال تو یہی ہے کہ تمہیں کلمے کی سیر کروانے کے بعد پاکستان چلا جاؤں گا۔ لیکن چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے تمہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دوں۔"

"وہ محفوظ جگہ کونسی ہو سکتی ہے؟" پروین نے سوال کیا۔

میں سوچنے لگا کہ اس کے سوال کا کیا جواب دوں۔ جواب تو یہی ہو سکتا تھا کہ پروین کسی شریف آدمی سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لے اور میں اطمینان کے ساتھ اپنے وطن چلا جاؤں۔ مگر میں اس بارے میں اسے کوئی رائے یا مشورہ دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسی جگہ جہاں تم باقی زندگی سکون سے بسر کر سکو۔ تم پڑھی لکھی ہو کلکتہ تمہارا اپنا شہر ہے۔ تم وہاں کسی سکول میں ٹیچر کیوں نہیں لگ جاتیں۔ اس طرح تم لیڈیز ہوسٹل میں بھی رہ سکو گی۔"

پروین نے سر نیچے کر لیا اور انگلی سے زمین پر اگی ہوئی گھاس اکھیڑتے ہوئے بولی۔

"ہو سکتا ہے کبھی مجھے ایسا ہی کرنا پڑ جائے۔"

میں نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"پروین! آج کتنا ہوں جب میں نے سانپ کے روپ میں تمہارے جسم کے ٹکڑے اٹھائے تھے تو مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ تم دوبارہ زندہ ہو جاؤ گی۔ میرا خیال تو کہ پروین کو اب میں انسانی شکل میں کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔"

پروین مسکرائی۔

"بس یہ سانپوں کی دنیا کی باتیں ہیں پہلے مجھے بھی کچھ معلوم نہیں تھا مگر سنکال کے بیروں میں رہ کر میں نے سب کچھ سیکھ لیا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اگر خدانہ کرے اب تم کسی وقت مجھ سے اچانک جدا ہو گئیں تو میں تمہیں کیسے اور کہاں تلاش کروں گا؟ مجھے کوئی ایسی نشانی بتا دو کہ جس کی مدد سے مجھے تمہارا سراغ مل جائے۔"

پروین ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"انسان کے جسم سے ہر وقت حرارت کی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ ان لہروں کی ایک خاص خوشبو ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے جسم سے نکلنے والی لہروں کی خوشبو الگ ہوتی ہے۔ اس خوشبو کو عام انسان محسوس نہیں کر سکتا جب کہ یہ خوشبو دنیا کی فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ سانپ اس خوشبو کو بڑی جلدی محسوس کر لیتا ہے۔ خاص طور پر میری خوشبو سانپ فوراً سونگھ لیتا ہے چاہے وہ مجھ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔ تمہیں بھی ایک سانپ ہی ناگ پور میں مجھ تک لایا تھا۔"

میں نے کہا "تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے کہ اگر تم مجھ سے جدا کر دی جاؤ تو میں تمہارا سراغ لگا سکوں؟"

پروین نے کہا "میں تمہیں ایک خاص منتر بتاتی ہوں اگر ہم پر کسی وقت کوئی مصیبت پڑ گئی اور میں تم سے جدا ہو گئی تو جو منتر میں تمہیں بتانے والی ہوں اس منتر کو کسی ویران علاقے میں جا کر تین بار پڑھنا۔ پھر زمین پر تین بار ہاتھ مارنا اس علاقے میں جو کوئی سانپ بھی ہو گا وہ اپنے بل میں سے نکل کر تمہارے پاس آ جائے گا۔ تم اسے

میرا رومال سنگھا دینا۔ پھر وہ تمہیں وہاں لے آئے گا جہاں میں ہوں گی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ مجھے وہ منتر یاد کرا دو۔"

پروین بولی۔ "منتر زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہے۔ صرف تین لفظ ہیں جن کو تمہیں تین بار دہرانا ہو گا۔ غور سے سنو۔ میں تمہیں وہ خاص منتر بتاتی ہوں۔"

اس کے بعد پروین نے مجھے وہ خاص منتر بتایا۔ یہ منتر مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں یہ منتر آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ اگر آپ نے یہ منتر تین بار پڑھ کر زمین پر تین مرتبہ ہاتھ مارا تو اس علاقے میں جہاں کہیں بھی کوئی سانپ ہو گا وہ نکل کر آپ کے سامنے آ جائے گا اور آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

میں نے وہ تین لفظ منتر کے جو پروین نے مجھے بتائے اچھی طرح سے یاد کر لئے۔ وہ کہنے لگی۔

"میرے رومال کو جس میں میرے جسم کی بو ہے سنبھال کر رکھنا کیونکہ اس رومال کو سونگھ کر ہی سانپ میری تلاش میں نکلے گا۔"

میں نے کہا "اگر خدانخواستہ رومال گم ہو گیا یا پھٹ پھٹا گیا تو اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟ پھر تو میں تمہیں کبھی نہیں تلاش کر سکوں گا۔"

پروین کچھ دیر چپ ہو کر غور کرتی رہی۔ اس کے بعد میری طرف چہرہ اٹھا کر بولی۔

"پھر تم ایسا کر سکتے ہو کہ جب سانپ تمہارے سامنے آ جائے تو تم منتر کے وہی تین لفظ پڑھ کر سانپ کے منہ پر پھونک مارو۔ سانپ کو میری خوشبو آ جائے گی۔"

"یہ تم نے بڑی اچھی بات مجھے بتا دی۔ بس اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ چلو شہر چل کر کسی اچھے سے ریستوران میں کافی پیتے ہیں۔ ایک مدت ہو گئی ہے کسی اچھے قسم کے ریستوران میں بیٹھ کر کافی پیے ہوئے۔"

"ہاں۔ یہ تم نے بالکل درست کہا۔ ہم تو بس جنگلی لوگوں کی طرح جنگلوں پہاڑوں میں ہی دربدری کرتے رہے ہیں۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اگر وہ شہر

Prepared By: S.Sohail Hussain

کے کسی کلاس ون ریستوران میں بیٹھ کر کافی پی سکیں۔"

ہم نے تاج محل کے باہر جہاں ٹیکسی سٹینڈ تھا وہاں سے ایک ٹیکسی لی اور اسے آگرہ شہر کے سب سے اعلیٰ ریستوران میں چلنے کو کہا۔ ٹیکسی سٹینڈ کے قریب ہی ایک آدمی سٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے پرلی کا کھسی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہماری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے سوچا اس ملک کے لوگ عورتوں کی طرف غور سے دیکھا ہی کرتے ہیں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور ٹیکسی میں پروین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔

جب ٹیکسی آگرہ شہر کے بازاروں میں آئی تو ڈرائیور نے کہا۔

"صاحب! یہاں ایک کیلاش ریستوران ہے وہاں کی کافی اور رس گلے سارے شہر میں مشہور ہیں۔ آپ کو وہاں نہ لے چلوں؟"

پروین بیکار تھی۔ رس گلوں کا سن کر بے تاب ہو کر بولی۔

"ہاں ہاں۔ وہیں لے چلو۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ایک مدت کے بعد رس گلوں کا نام سنا ہے۔ کافی کے ساتھ رس گلوں کا مزا آئے گا۔"

کیلاش ریستوران شہر کے فیشن ایبل علاقے میں واقع تھا۔ بڑا شاندار قسم کا ریستوران تھا۔ فرنیچر خوب چمک رہا تھا۔ میں اور پروین کونے والی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ اور لوگ بھی بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ فضا میں بڑی پرسکون خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے رس گلوں اور کافی کا آرڈر دیا اور جیب سے بڑی اعلیٰ قسم کا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ پروین مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں بیرا کافی اور رس گلے لے کر آ گیا۔ رس گلے واقعی بڑے لذیذ تھے۔ پروین کہنے لگی۔

"مگر ہمارے بنگال میں جیسے رس گلے بنتے ہیں ویسے نہیں ہیں۔"

پروین میرے لئے کافی بنانے لگی۔ کافی بناتے بناتے اچانک وہ رک گئی۔ میں نے

اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے پروین؟"

پروین ایسے سانس لے رہی تھی جیسے فضا میں کوئی خاص قسم کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

پھر اس نے کافی بنا کر مجھے دی۔ پھر اپنے لئے کافی بنائی۔ ہم کافی پینے اور باتیں کرنے لگے۔ لیکن مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ پروین فضا میں کیا سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ یونہی ایسا نہیں کر رہی تھی۔ اس کو فضا میں ضرور کوئی بو محسوس ہوئی ہو گی۔ میں نے کافی کا گھونٹ پینے کے بعد پیالی نیچے رکھی اور سگریٹ کا کش لگانے لگا تو اچانک میری نظر ریستوران کے دروازے پر پڑی۔ وہاں مجھے وہی کھدر کی کھسی ٹوپی والا آدمی نظر آیا جس کو میں نے تاج محل کے ٹیکسی سٹینڈ پر دیکھا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ یہ شخص یہاں کیسے پہنچ گیا؟ کہیں یہ ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا؟ ہوا خیال دلی میں ہم پر لگائے گئے چوری کے الزام اور پھر حوالات میں ہمیں بند کر کے بھی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ سی آئی ڈی کا آدمی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے دلی پولیس نے آگرہ پولیس کو خبردار کر دیا ہو کہ ایک لڑکا اور لڑکی جن پر چوری کا الزام تھا حوالات سے فرار ہو گئے ہیں۔ اگر نظر آ جائیں تو انہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ پھر سوچا کہ دلی پولیس سٹیشن کے پاس تو ہماری کوئی تصویر نہیں تھی۔ جو وہ آگرہ کی پولیس کو بھیجتے۔ پھر یہ آدمی ریستوران میں کیسے آ گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کاؤنٹر پر جا کر ریستوران کے منیجر سے باتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے بڑی سنگدلی اور ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران پروین کافی پی رہی تھی۔ اس نے ایک دم سے نظر اٹھا کر کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور دو تین گہرے سانس لئے۔

میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے پروین؟ تم کیا سونگھ رہی ہو؟"

Prepared By: S.Sohail Hussain

پروین نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

"مجھے ایک غیر مانوس سی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

"کس قسم کی بو؟" میں نے پوچھا۔ "کیا یہ کسی سانپ کی بو ہے؟"

پروین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ یہ سانپ کی بو نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی بو ہے۔ لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ یہ خطرناک بو ہے۔ چلو۔ اٹھو۔ چلتے ہیں۔ یہاں میرا جی گھبرانے لگا ہے۔"

میں نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ میری نظریں ریستوران کے دروازے کی طرف گئیں۔ وہ انگریزی ٹوپی والا پراسرار آدمی اب وہاں نہیں تھا۔ ہم بل ادا کر کے ریستوران سے باہر آ گئے۔ باہر آ کر میں نے پروین سے پوچھا۔

"کیا لگتا ہے تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو۔ آخر تمہیں کیا محسوس ہوا تھا؟"

پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں ناگن بھی ہوں اور ناگنوں کو فضا میں بعض اوقات عجیب عجیب بو نہیں محسوس ہوتی ہیں۔ چلو اپنے ہوٹل میں چلتے ہیں۔"

ہم نے ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے خاص طور پر چاروں طرف نگاہ دوڑائی تھی مگر وہ پراسرار آدمی مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے پروین سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی کہ وہ خوامخواہ پریشان ہو گی۔

میں نے ہوٹل کے کمرے میں آ کر پروین سے پوچھا۔

"چاندنی رات میں تاج محل کی سیر کا پروگرام ہے یا اسے ملتوی کر دیا ہے؟"

پروین نے فوراً جواب دیا۔

"کیوں نہیں۔ آج تو پورن ماشی کی رات ہے پورا چاند نکلے گا۔ ہم آج رات تاج محل دیکھنے ضرور جائیں گے۔"

دوپہر کو ہم کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ تیسرے پہر اٹھے۔ چائے پی اور اخبار رسالے پڑھنے اور باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ رات کا کھانا بھی ہم نے کمرے میں منگوا کر ہی کھایا۔ جب رات کے دس بج گئے اور آسمان پر پورا چاند چمکنے لگا تو ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر تاج محل کی طرف چل دیئے۔

تاج محل تو چاندنی رات میں نگینے کی طرح چمک رہا تھا۔ وہاں بہت لوگ چاندنی میں اس تاریخی عمارت کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے۔ ہم ایک روش پر کھڑے ہو کر تاج محل کی حسین عمارت کو دیکھنے لگے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم خواب کی دنیا میں آ گئے ہیں۔ پروین کہنے لگی۔

"کتنی خوش تھی ممتاز محل کہ اس کے خاوند نے اس کے لئے تاج محل بنوایا جس کو دیکھنے کے لئے دنیا کے کونے کونے سے لوگ آتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ممتاز محل کا خاوند ہندوستان کا بادشاہ تھا وہ جو چاہے بنا سکتا تھا۔"

پروین بڑے جذباتی انداز میں کہنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ اصل بات محبت کی ہوتی ہے۔ شاہجہان اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔"

ہم تاج محل کے پہلے چبوترے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک وردی پوش گائیڈ ہمارے پاس آ کر کہنے لگا۔

"صاحب جی! اگر آپ میاں بیوی ہیں تو باری باری تاج محل کے پہلے مینار کا ایک چکر لگائیں۔ آپ ساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔"

پروین پہلے ہی بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ہم ضرور چکر لگائیں گے۔ پہلے میں چکر لگاؤں گی۔"

گائیڈ خوش ہو کر بولا۔

"آپ بڑی خوش قسمت ہیں۔ کہتے ہیں جو عورت اپنے خاوند سے پہلے چکر لگائے

Prepared By: S.Sohail Hussain

"اپنے خاوند کا ساری زندگی بھرپور پیار حاصل کرتی ہے۔"

میں نے کہا "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

گلیڈ بولا۔

"نہیں بابو جی! میم صاحب کو اکیلے ہی چکر لگانے دیں۔ ورنہ مینار کی دعا کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

پروین اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھ سے کہا

"نہیں نہیں۔ تم میرے بعد چکر لگانا میں ابھی چکر لگا کر آتی ہوں۔"

پروین گلیڈ کے ساتھ تاج محل کے پہلو میں مینار کی طرف چل پڑی۔ یہ مینار کوئی ۲ قدم کے فاصلے پر تھا اور مجھے اس کا صرف سامنے والا حصہ ہی چاندنی میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے درختوں کے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے پروین سے کہا

"دیر نہ لگانا۔"

وہ بولی۔ "ابھی آتی ہوں۔ تم یہیں بیٹھے رہنا۔"

میں نے کچھ اور لوگوں کو بھی دیکھا جو مینار کا چکر لگا رہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ میں اس قسم کے توہمات کا قائل نہیں ہوں۔ مگر پروین کی ضد اور اس کے شوق کی وجہ سے خاموش رہا۔ میں پروین کو گلیڈ کے ساتھ جاتے دیکھتا رہا۔ مینار کے پاس جا کر پروین دوسری طرف مڑ گئی۔

میں نے سگریٹ سلگا لیا اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے پروین کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ واپس آ کر وہ مجھے بھی چکر لگانے پر مجبور کرے گی۔ میرا دل تو بالکل نہیں چاہتا تھا لیکن محض پروین کی خاطر میں نے سوچ لیا کہ مینار کا ایک چکر لگا لوں گا۔ چاندنی رات بڑی خوبصورت تھی۔ جو لوگ چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے وہ ادھر ادھر چلتے نظر آ رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے خواب میں چل رہے ہوں۔ میرا سگریٹ ختم ہو گیا۔ میں نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر سنگ مرمر کے کشادہ چبوترے پر ادھر سے ادھر

ٹہلنے لگا۔

میرا دوسرا سگریٹ بھی ختم ہو گیا۔ پروین ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ گلیڈ کے کہنے کے مطابق اسے مینار کا صرف ایک ہی چکر لگانا تھا۔ اب تک اسے واپس آ جانا چاہیے تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے سگریٹ پھینکا اور مینار کی طرف چلنے لگا کہ جا کر دیکھوں پروین نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ مینار کے پاس جا کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مینار کا چکر لگایا۔ پروین مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ وہاں ایک عورت اور ایک مرد چکر لگا رہے تھے۔ جب وہ چکر لگا چکے تو میں نے ان سے پروین کے بارے میں پوچھا جس پر انہوں نے کہا کہ اس حلیے اور لباس کی عورت انہوں نے یہاں نہیں دیکھی۔ وہ گلیڈ بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ ایک طرف ایک آدمی پتھر کی سیڑھی پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہاں ایک گلیڈ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک عورت کے ساتھ آیا تھا وہ کہاں چلا گیا؟"

وہ آدمی کہنے لگا۔

"رات کو تو یہاں کسی گلیڈ کی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "اس نے وردی پہنی ہوئی تھی۔ کہتا تھا میں گلیڈ ہوں۔ وہ میری بیوی کو مینار کا چکر لگانے کے لئے لے گیا تھا۔"

وہ آدمی بولا۔

"میں یہاں کا چوکیدار ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ رات کو کبھی کسی گلیڈ کی ڈیوٹی نہیں لگتی۔ آپ کو کسی نے دھوکا دیا ہے۔"

میں نے اسے گلیڈ اور پروین کا حلیہ بتایا۔ چوکیدار کہنے لگا

"میں بڑی دیر سے یہاں بیٹھا ہوں۔ میں نے اس حلیے کا کوئی گلیڈ اور کوئی عورت نہیں دیکھی۔"

میں سخت پریشان ہوا۔ ضرور وہ آدمی پروین کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ مگر پروین

Prepared By: S.Sohail Hussain

کو اتنے لوگوں کے درمیان اغوا کرنا آسان نہیں تھا۔ اور پھر پروین زندگی سے بھرپور تھی۔ وہ ناگن بن کر اغوا کرنے والے کو ہلاک کر سکتی تھی۔ نہیں نہیں۔ میں نے اپنے دل سے کہا۔ ایسا نہیں ہوا پروین ضرور یہیں کہیں ہو گی۔ ممکن ہے وہ دوسرے مینار کا چکر لگانے چلی گئی ہو۔ میں تیز تیز قدموں سے دوسرے مینار کے پاس گیا۔ وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس قسم کے چکر صرف اسی مینار کے گرد لگائے جاتے تھے جس طرف وہ گھنیڈ پروین کو لے کر گیا تھا۔ لیکن میں نے دوسرے مینار کے آس پاس بھی پروین کو تلاش کیا۔ اس طرح میں تیسرے اور چوتھے مینار پر بھی گیا۔ میں نے سارے تاج محل چھان مارا۔ جگہ جگہ دیکھا۔ جھاڑیوں اور باغیچوں میں تلاش کیا مگر پروین کو تو جیسے زمین کھا گئی تھی۔ سخت مایوسی اور پریشانی کی حالت میں واپس آ کر اسی چبوترے پر بیٹھ گیا جہاں پہلے بیٹھا تھا۔

ذہن انتہائی الجھ گیا تھا۔ دل میں طرح طرح کے خدشے اور وسوسے پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ پھر مجھے خیال آنے لگا کہ پروین نے دو بار کوئی خوشبو محسوس کی تھی جس کے بارے میں اس نے تشویش کا اظہار کیا تھا۔ کہیں کوئی دشمن تو اس کے پیچھے نہیں لگ گیا تھا؟ مگر ایسا دشمن کون سا ہو سکتا تھا؟ اچانک مجھے اس پراسرار آدمی کا خیال آ گیا جس کو میں نے سب سے پہلے دن کے وقت تاج محل کے ٹیکسی سٹینڈ پر اور پھر کیلاش ریستوران میں دیکھا تھا۔ میں ان ہی پریشان کن خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

پولیس کا ایک سپاہی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"بابو! تاج محل کا گیٹ بند ہونے والا ہے۔ حکم ہو گیا ہے۔ اب چلو۔ کل رات آ کر دیکھنا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ آج تاج محل دیکھنے آیا تھا۔ وہ ایک گھنیڈ کے ساتھ مینار کا چکر لگانے گئی تھی۔ پھر واپس نہیں آئی۔

سپاہی بولا۔

"گھنیڈ کے ساتھ تم نے اپنی بیوی کو کیوں بھیج دیا؟ عورتیں تو کونے والے مینار کا اپنی ہی چکر لگاتی ہیں۔ کوئی گھنیڈ انہیں ساتھ لے کر نہیں جاتا۔"

میں نے کہا۔ "میں دلی سے آیا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ گھنیڈ میری بیوی کو غائب کر دے۔ مجھے کیا یہاں کوئی سرکاری دفتر نہیں ہے جہاں سے مجھے گھنیڈ کے بارے میں پتہ چل سکے کہ وہ کون تھا اور کہاں رہتا ہے؟"

سپاہی نے کہا۔

"بھیا! پہلی بات تو یہ ہے کہ تاج محل پر رات کے وقت کسی سرکاری گھنیڈ کی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔ کیا معلوم وہ کون بدمعاش تھا جو گھنیڈ کی وردی پہن کر تمہارے پاس آیا اور تمہاری بیوی کو لے اڑا۔ ایسا کرو۔ تم میرے ساتھ تھانے چلو۔ تھانے میں رپٹ

Prepared By: S.Sohail Hussain

دے کر اور پولیس تمہاری بیوی اور بچیلا کو خود ہی تلاش کر لے گی۔"

میں پولیس سٹیشن نہیں جانا چاہتا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں الٹا پولیس مجھے ہی نہ پکڑ لے کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ دلی کی حوالات سے بھاگے ہوئے مجرم ہو۔ میں نے کہا

"کوئی بات نہیں۔ میں جہاں ٹھہرا ہوا ہوں وہاں جا کر دیکھتا ہوں شاید بچیلا وہاں پہنچ گئی ہو۔"

سہانی چاندنی رات میں مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں وہاں سے تاج محل کے بڑے احاطے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ سب لوگ جو چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے واپس جا رہے تھے۔ میں شکستہ دل تھا۔ ذہن ایک حلقہ کا شکار تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پروین کہاں اور کیسے غائب ہو گئی۔ میں ٹیکسی سٹینڈ پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کہ سارے لوگ وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو نہیں چلے گئے۔ وہاں صرف ایک ٹیکسی خالی رہ گئی تھی۔ ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔

"بابو شہر چلنا ہے تو۔" بولو۔ میں جا رہا ہوں پھر یہاں سے کوئی سواری نہیں ملے گی۔"

میں بوجھل قدم اٹھاتا اور بار بار تاج محل کے مینار کی طرف دیکھتا ٹیکسی میں آ بیٹھ گیا۔

"کہاں چلیں گے بابو جی؟"

میں نے اپنے ہوٹل کا نام لیا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے پتہ نہیں کب گاڑی وہاں سے چلی۔ کن کن بازاروں اور سڑکوں سے گزری اور کب ہوٹل کے پورچ میں آ کر رک گئی۔ سارا رستہ اسی خیال میں ڈوبا رہا کہ پروین کو کس نے اغوا کیا ہو گا۔ کیا وہ پراسرار آدمی جس نے کانگریسی کیپ پہنی ہوئی تھی اور جو میرے خیال کے مطابق ہمارا پیچھا کر رہا تھا کہیں یہ ساری مصیبت اسی کی وجہ سے تو نہیں پیدا ہوئی۔ مگر اس وقت تو وہ وہاں کہیں نہیں تھا۔ صرف گلیڈ میرے پاس تھا

بھی ہو سکتا ہے کہ گلیڈ بھی اسی کا بھیجا ہوا آدمی ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ پروین کو اتنی جلدی اغوا کیسے کر لیا گیا کہ وہ ایک آواز بھی بلند نہ کر سکی۔ وہ مجھے مدد کے لئے پکار بھی نہ سکی۔ وہ تو بڑی جلدی ناگن کا روپ بدل کر بچیلا کو ہلاک کر سکتی تھی۔ اسے بچانے کے لئے صرف تین سانس ہی کھینچنے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ پروین کو کوئی زبردست طاقت بلکہ اس سے تیز کوئی بے ہوشی کی دوائی سنگھائی گئی تھی کہ جس کو سنگھتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

میں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا یہی کچھ سوچتا رہا۔

ساری رات میں نے جاگ کر گزار دی۔ آخر میں نے وہی فیصلہ کیا جس کے لئے میں مجھے خوش قسمتی سے آگرہ میں پہنچتے ہی پروین نے بتا دیا تھا۔ یعنی اب مجھے اس سانپ کو منتر پڑھ کر بلانا اور اسے پروین کا رومال سنگھا کر پروین کی تلاش کے لئے روانہ کرنا تھا۔ دن نکلتے ہی میں تاج محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس خیال سے کہ شاید وہاں پروین کا کوئی سراغ مل جائے۔ اگر سراغ نہ ملا تو وہیں سے کسی سانپ کو بلا لوں۔ کیونکہ تاج محل دریا کے کنارے پر واقع تھا اور وہاں اکثر علاقہ ویران تھا اور اسی لئے وہاں سانپ اکثر پائے جاتے ہیں۔

دن کی روشنی میں تاج محل چاندنی رات والے تاج محل سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ میں سیدھے مینار کے پاس آ گیا۔ میں زمین پر جھک کر دیکھنے لگا کہ شاید پروین کی کوئی چیز وغیرہ وہاں ٹوٹی ہوئی پڑی ہو۔ مگر وہاں کوئی ایسی شے نہیں تھی۔ آخر میں تاج محل کی عمارت کے عقب میں ایک ویران جگہ پر چلا گیا۔ یہاں بنجر زمین تھی اور جنگلی جھاڑیاں کہیں کہیں اگی ہوئی تھیں۔ میں ایک جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ پروین کے بتائے ہوئے منتر کے تینوں لفظ مجھے زبانی یاد تھے۔ میں نے تینوں الفاظ تین بار اونچی آواز میں دہرائے اور پھر زمین پر تین بار ہاتھ مارا۔ اس کے بعد متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ سانپ آیا ہے یا نہیں۔ دس پندرہ سیکنڈ گزر گئے۔ کسی طرف سے کوئی سانپ نہ آیا۔ میں دوسری بار منتر پڑھ کر پھونکنے والا تھا کہ اچانک

Prepared By: S.Sohail Hussain

مجھے اپنے پیچھے سے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سوا
رنگ کا بالشت بھر کا سانپ میرے پیچھے اپنا چھوٹا سا پھن اٹھائے میری طرف
پھنکار رہا تھا۔ میں پروین کی ہدایت کے مطابق اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ سانپ آہستہ آہستہ
رینگ کر میرے قریب آ گیا۔ میں نے جیب سے پروین کا رومال نکال کر اس کی طرف
پھینکا۔ سانپ نے رومال پر منہ رکھ دیا۔ پھر فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ تین بار رومال سے
سر جھٹکا اور ایک طرف آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا۔

میں جلدی سے اٹھا۔ پروین کا رومال اٹھا کر جیب میں ڈالا اور سانپ کے پیچھے پیچھے
لگ گیا۔ سانپ اس طرف جا رہا تھا جدھر دریا کا کنارا تھا۔ مجھے خیال آیا اگر سانپ دریا
اتر گیا تو میں کیا کروں گا۔ یہاں تو کوئی کشتی بھی نہیں ملے گی۔ سانپ تو پانی پر تیر
لیتا ہے۔ میں بھی تیر سکتا تھا مگر کپڑوں سمیت دریا میں نہیں کودنا چاہتا تھا۔ دل میں دعا
مانگنے لگا کہ سانپ دریا میں نہ اترے۔ سواری سانپ دریا کے کنارے پہنچ کر رک گئی
اس نے گردن اوپر اٹھائی۔ دائیں بائیں گھمائی۔ زبان بار بار باہر نکال کر کچھ سونگھنے کی کوشش
محسوس کیا اور جدھر سے بو آ رہی تھی اس طرف چلنے لگا۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ
دور تک چلتا گیا۔ پھر اس نے دریا کے کنارے سے اٹھنا شروع کر دیا اور بنجر زمین پر چلنے
لگا۔ یہ کلر زدہ زمین تھی۔ سانپ ایک خاص آہستہ رفتار کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ میں
بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

کلر زدہ میدان ختم ہوا تو سامنے ایک گاؤں آ گیا۔ بستی کے کچے مکان دھوپ میں
صاف نظر آ رہے تھے۔ سانپ گاؤں میں داخل نہیں ہوا۔ بلکہ گاؤں کے باہر ہی باہر
سے گزر گیا۔ سامنے سے دو دیہاتی آ رہے تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں یہ
سانپ کو دیکھ کر ہلاک نہ کر دیں۔ میں چوکس ہو گیا کہ اگر انہوں نے سانپ کو مارنا چاہا
تو میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ شاید سانپ نے بھی سامنے سے آتے آدمیوں کو
دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک طرف جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میں وہاں کھڑا ہو گیا۔ دونوں دیہاتی
باتیں کرتے مجھ پر ایک نظر ڈالتے گزر گئے۔ ان کے جانے کے بعد سانپ جھاڑیوں میں

سے نکل کر دائیں طرف کے راستے پر چل پڑا۔ میرا اور سانپ کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ
گز کا ہو گا۔ چونکہ یہ آباد علاقہ تھا۔ کھیت بھی تھے اس لئے دیہاتی لوگوں کی آمد و
رفت جاری تھی۔ جو بھی سامنے سے کوئی آدمی آتا نظر آتا سانپ جلدی سے کسی طرف
چھپ جاتا۔ اس طرح میں اور سانپ آبادی والے علاقے سے نکل کر غیر آباد علاقے
میں آ گئے۔

سانپ میرے آگے آگے اسی پگڈنڈی پر بل کھاتا رینگتا چلا جا رہا تھا۔ ہم ایک نالے
کے پل پر سے گزر کر اس کی دوسری جانب آئے تو سامنے کچھ فاصلے پر چند ایک کچے
مکان دکھائی دیئے۔ میرا خیال تھا سانپ ان مکانوں سے بچ کر دوسری طرف سے ہو کر
نکل جائے گا مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سانپ کا رخ ان مکانوں کی طرف ہی
تھا۔ یہ ایک اونچے ٹیلے کے دامن میں ادھر ادھر بنے ہوئے چار پانچ جھونپڑی نما کچی
اینٹوں والے مکان تھے۔ آگے ایک چھوٹا سا جوہڑ تھا۔ ایک بوڑھا جوہڑ کے کنارے
بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں اور سانپ اس سے کچھ فاصلے پر سے ہو کر گزر گئے۔
سانپ تیز تیز چل رہا تھا۔ وہ ایک مکان کے سامنے جا کر رک گیا اور پھن اٹھا کر
زور زور سے پھنکارنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ پروین اسی مکان میں بند ہے۔ کچے مکان کا
دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی کون ہو؟ میں نے
کہا۔

"گھر کا باہر آ گیا ہے۔"

دروازہ کھلا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ وہی کانگڑی ٹوپی والا آدمی تھا جو
میرے خیال کے مطابق ہمارا پیچھا کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کا چہرہ بتا
رہا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے اور کچھ گھبرا گیا ہے مگر وہ جلدی سنبھل گیا اور
بولا۔

"کس سے ملنا ہے بھائی؟ کون ہو تم؟"

اس دوران سانپ میری ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر اس آدمی کی طرف حملہ

Prepared By: S.Sohail Hussain

کرنے کے لئے پھنکارتا ہوا بڑھا۔ وہ شخص چیخ مار کر کوٹھڑی میں گھس گیا اور سانپ کا شور مچا دیا۔ کوٹھڑی میں سے دو ہٹے کٹے آدمی نکل کر باہر آ گئے۔ انہوں نے سانپ کو دیکھا تو ایک نے لاٹھی اٹھا کر پوری طاقت سے سانپ پر ماری۔ سانپ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اب وہاں تین آدمی تھے اور میں اکیلا تھا۔ کانگریسی ٹوپی والے آدمی نے غصے کے ساتھ پوچھا

"یہ سانپ تم اپنے ساتھ لائے تھے؟"

میں نے کہا

"مجھے نہیں معلوم یہ کہاں سے آ گیا تھا مجھے تو پیاس لگ رہی تھی سوچا یہاں سے پینے کو پانی مل جائے گا اس لئے دروازہ کھٹکھٹایا۔"

کانگریسی ٹوپی والے آدمی نے اپنے ساتھیوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا

"تم لوگ اندر جاؤ۔"

وہ دونوں اندر چلے گئے۔ کانگریسی ٹوپی والے نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا کہ یہاں پانی نہیں ہے۔ میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ سانپ کو دیکھا اس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ سانپ مر گیا تھا۔ مجھے اس کی موت کا بڑا افسوس ہوا۔ مرتے مرتے سانپ مجھے بتا گیا تھا کہ اسی گھر سے پروین کی بو آ رہی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ سانپ مجھے ٹھیک بتا گیا ہے اور پروین یہیں کہیں ہے۔ مگر میں اکیلا تھا اور وہ تین تھے۔ اگر میں ان سے الجھتا تو وہ بڑی آسانی سے مجھے بھی مار ڈالتے۔ دونوں ہٹے کٹے آدمی شکل ہی سے بدمعاش پیشہ قاتل لگتے تھے۔

میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے اگر میں نے ان لوگوں سے پروین کے بارے میں کچھ پوچھا بھی تو یہ کبھی مجھے اس کے بارے میں نہیں بتائیں گے۔ سانپ نے مجھے اشارہ دے دیا تھا کہ پروین اگر ملے گی تو یہیں سے ملے گی۔ اگر وہ اندر نہیں ہو گی تو یہاں سے اس کا سراغ ضرور مل جائے گا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا

کہ مجھے اس کانگریسی ٹوپی والے آدمی کا پیچھا کرنا چاہئے کہ یہ یہاں سے کہاں جاتا ہے۔ چنانچہ میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ اوپڑ کے پاس آیا تو بوڑھے کو حقہ پیتے دیکھ کر اس کے پاس آ گیا۔

اسے سلام کیا اس نے وعلیکم السلام کہہ کر حقہ منہ سے ہٹایا اور بولا

"آؤ بھائی۔ مسافر ہو؟ کیسے آئے ہو؟"

میں اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور کہا

"ایک دوست کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ سامنے والے مکان میں رہتا تھا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ مکان چھوڑ کر جا چکا ہے۔ اب وہاں کوئی اور ہی لوگ رہ رہے ہیں۔"

"کون سا مکان؟ وہ کونے والا؟" بوڑھے نے پوچھا۔

میں نے کہا

"جی ہاں۔ وہی مکان۔"

بوڑھے نے ایک ہاتھ ران پر رکھا اور بولا

"میں تم مسلمان ہو اس لئے تمہیں ضرور خبردار کروں گا کہ آج کے بعد اس مکان کا رخ نہ کرنا۔"

میں نے پوچھا

"کیوں بابا؟ اس مکان میں کیا کوئی جن بھوت رہتے ہیں؟"

بوڑھا کہنے لگا

"بھائی یہ لوگ جن بھوتوں سے بھی بڑھ کر خطرناک ہیں۔ یہ بدی پشتی پیرے ہیں۔ ان کے پاس کالے علم کا جادو بھی ہے۔ یہ ہندو ہیں اور راتوں کو مرگھٹوں میں جا کر جہاں تازہ تازہ ہندو مردہ جلایا گیا ہو وہاں بیٹھ کر چلے کاٹتے ہیں۔ چوریاں اور ڈاکے بھی ڈالتے ہیں۔ بستی کے لوگ تو ان کے قریب نہیں پھٹکتے۔"

میں نے مزید کریدتے ہوئے پوچھا

Prepared By: S.Sohail Hussain

"پھر ان میں ایک آدمی سر پر کانگریس کی کھدر کی ٹوپی پہنے رکھتا ہے۔ وہ کون ہے؟"

بوڑھے نے کہا۔

"وہ ان کا سرغنہ ہے۔ اس کو تو سانپ بھی کاٹ لے تو کچھ نہیں ہوتا۔ سنا ہے ان کے پاس ایسے سانپ بھی ہیں جو زمین کے اندر چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ بتا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر انہیں شاندار بنگلہ بنا کر رہنا چاہیئے۔ اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں کیوں رہتے ہیں۔"

بوڑھا ماتھے کا کش لگا کر کہنے لگا۔

"بس ابھی کسی سانپ نے ٹھیک سے خزانے کا پتہ نہیں بتایا ہو گا۔ اور سنو ان کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ الو کی اندھیری راتوں میں ہندو عورتوں کی بدروحیں ان سے ملاقات کرنے آتی ہیں۔ تم پھر اس مکان کے قریب نہ جانا۔ قسمت والے ہو کہ ان سے بچ کر آ گئے۔ ورنہ یہ لوگ تو نوجوان لڑکوں کو بھی جادو ٹونے سے اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔"

جتنی دیر میں بوڑھے کے پاس بیٹھا رہا میری نگاہیں برابر کونے والے مکان پر لگی رہیں۔ اس دوران مکان کا دروازہ بند رہا۔ نہ کوئی باہر نکلا۔ نہ کوئی باہر سے اندر گیا۔ مجھے سانپ کے مرنے کا بہت افسوس تھا۔ پھر سوچا کہ پروین نے مجھے دوسری ترکیب بھی بتا دی ہے۔ اس ترکیب پر عمل کر کے کسی دوسرے سانپ کی راہ نمائی حاصل کر لوں گا۔ میں تھوڑی دیر بوڑھے کے پاس بیٹھ کر سلام کر کے واپس چل دیا۔

پروگرام یہ بنایا کہ اوپر سے چکر کاٹ کر مکان کے پیچھے کی طرف آ کر کسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاؤں گا اور ان لوگوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کروں گا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ پروین اس مکان میں کسی جگہ بے ہوش پڑی ہے۔ میں سیدھا چلتا گیا۔ پھر آگے

سے چکر لگا کر پیچھے مکانوں کے عقب میں آ گیا۔ اس طرف کھیت تھے۔ جس مکان سے سانپ کو پروین کی بو آئی ہوئی تھی اس کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک درخت اگا ہوا تھا جس کی شاخیں مکان کی چھت پر بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ میں کھیت کے کونے میں آ کر رک گیا اور مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ کھیتوں میں ایک آدمی ہل چلا رہا تھا مگر وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں آہستہ آہستہ چل کر مکان کے پچھواڑے والے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ آس پاس کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں درخت پر چڑھ گیا اور اس کی شاخوں کو پکڑتا ہوا مکان کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ چھت پر اترنے کے بعد میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ چھت کے کونے میں مرغیوں کا ڈربا بنا ہوا تھا مگر اندر کوئی مرغی نہیں تھی۔ میں جھک کر چھتا ڈربے کے پاس آیا اور گردن آگے کر کے نیچے دیکھا۔ اس طرف مکان کا دروازہ تھا۔

دروازہ اسی طرح بند تھا۔ میں نے بڑے غور سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی کہ شاید اندر جو لوگ بیٹھے ہیں ان کی باتیں سن سکوں مگر وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی ہو گی کہ دور سے کسی موٹر گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ میں سمجھا سڑک پر سے کوئی جیپ یا موٹر گاڑی گزر رہی ہو گی۔ مگر آواز قریب آتی گئی۔ میں نے چھت کی منڈیر پر سے سر اوپر کر کے دیکھا۔ ایک جیپ مکان کی طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ مکان کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ جیپ میں ایک بنا کٹا ڈرائیور بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے دو تین بار ہارن دیا۔ مکان کا دروازہ کھلا اور مکان کے اندر سے وہ تینوں آدمی باہر نکل کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ ان میں ایک وہی پراسرار کانگریسی ٹوپی والا تھا اور دوسرے دونوں ہٹے کٹے آدمی تھے جنہوں نے سانپ کو پکڑا تھا۔ انہوں نے جیپ میں تین پٹاریاں بھی رکھیں۔ یہ ایسی پٹاریاں تھیں جن میں سپیرے سانپ رکھا کرتے ہیں۔

میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ اتنے میں جیپ چل پڑی۔ اور بستی سے نکل کر بڑی سڑک کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں اگر نیچے مکان کے باہر بھی ہوتا تو کچھ

Prepared By: S.Sohail Hussain

نہیں کر سکتا تھا۔ میں جیپ کے پیچھے دوڑ کر اس کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ جیپ آہستہ آہستہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں جلدی جلدی درخت پر سے اتر کر نیچے آیا۔ سامنے کی طرف آ کر مکان کے دروازے کو دیکھا جو چوپٹ کھلا تھا۔ میں کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ کوٹھری کے فرش پر چیتھڑے سے بکھرے ہوئے تھے۔ ساری کوٹھری خالی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے گہرے گہرے لمبے لمبے تین چار سانس لئے کہ شاید مجھے پروین کی بو آ جائے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مایوس ہو کر مکان سے باہر آ گیا اور واپس اپنے ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ تاج محل کے پاس آ کر خیال آیا کہ کسی دوسرے سانپ کو بلا کر اس کی مدد حاصل کرنی چاہئے۔ دیکھا ہوں وہ مجھے پروین کی بو سونگھ کر کس طرف لے جاتا ہے۔

میں وہیں زمین پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ تین بار پروین کا بتایا ہوا منتر پڑھ کر تین بار زمین پر ہاتھ مارے اور سانپ کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر انتظار کیا مگر کوئی سانپ نہ آیا۔ دوسری بار پھر منتر پڑھ کر پھونکا۔ اس بار بھی کوئی سانپ نہ آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس علاقے میں وہی نسواری رنگ کا ایک سانپ تھا جو مارا گیا ہے۔ میں اٹھ کر تاج محل کی طرف چلنے لگا۔ وہاں ٹیکسی سٹینڈ پر آ کر ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل میں آ کر بستر پر گر پڑا۔ سخت مایوس تھا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ جلدی نخوامت دوپہر کا کھانا کھایا اور پروین کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا کہ وہ کہاں ہو گی کس حال میں ہو گی۔ جن لوگوں سے مجھے اس کا سراغ ملتا تھا کم بخت وہ فرار ہو چکے تھے۔

رات اسی پریشانی اور بے چینی کے عالم میں گزر گئی۔ اگلے روز ٹیکسی پکڑ کر دوبارہ وہاں گیا جہاں سانپ مجھے لے کر گیا تھا۔ مکان اسی طرح خالی پڑا تھا۔ میں جوہڑ کی طرف آ گیا۔ بوڑھا وہاں پر نہیں تھا۔ میں واپس جا رہا تھا کہ سامنے سے وہی بوڑھا آتا نظر آیا۔ میں نے سلام کیا تو وعلیکم السلام کہہ کر بولا۔

"میاں تم پھر کیسے آ گئے؟ تم کس کی تلاش میں ہو؟ مجھے کھل کر بتاؤ۔"

میں بوڑھے کو کھل کر نہیں بتانا چاہتا تھا۔ لیکن حالات ایسی صورت اختیار کر گئے

تھے کہ مجھے بوڑھے کو بتانا ہی پڑا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ آج کل کے بیچار سے میری بیوی پراسرار رات میں غائب ہو گئی ہے اور مجھے شک ہے کہ یہ کالے جادو والے کا کام ہے۔ کیونکہ جب سے ہم دونوں آگرے میں آئے تھے یہ آدمی ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔

بوڑھا مجھے لے کر وہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"بھائی تم مارے گئے۔ اپنی بیوی سے ہاتھ دھو لو اب وہ تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ ان لوگوں نے اس بے چاری کو جانے کہاں کا کہاں پہنچا دیا ہو گا۔"

میں نے بوڑھے سے کہا۔

"بابا میں اپنی بیوی کو تلاش کر لوں گا۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہ لوگ مکان چھوڑ کر کہاں گئے ہوں گے؟ ان کا یہاں کوئی دوسرا ٹھکانہ بھی ہے؟"

بوڑھا بولا۔

"میاں ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے اس مکان میں بھی سال میں ایک آدھ بار ہی آتے ہیں۔ ہاں تم ایسا کرو کہ یہاں سے سیدھا چھلوا ندی کے پل پر چلے جاؤ۔ پل کی دوسری طرف ایک ویران جگہ آئے گی وہاں ایک شمشان گھاٹ ہے۔ وہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی کبھی راتوں کو وہاں جا کر جادو ٹونہ کرتے ہیں۔ چلہ بھی کاٹتے ہیں۔ اور اپنے جادو ٹونے کے واسطے جلے ہوئی مردے کی ہڈیاں بھی تلاش کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہیں یہ لوگ وہاں مل جائیں مگر رات کو جانا اور کوئی ہتھیار ساتھ لے کر جانا۔ کیونکہ یہ لوگ قتل بھی کر دیتے ہیں۔"

میں بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے اپنے ہوٹل میں آ گیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب رات کافی گہری ہو گئی تو میں ٹیکسی لے کر اس بستی کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ دن کے وقت بوڑھے نے مجھے جو راستہ چھلوا ندی کو جانے والا بتایا تھا اس طرف اندھیرے میں چلنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک ندی کا پل آ گیا۔ بوڑھے نے کہا تھا کہ اس پل کی دوسری طرف شمشان گھاٹ ہے۔ میں

Prepared By: S.Sohail Hussain

پل کی دوسری طرف آگیا۔ یہ بڑی خوفناک جگہ تھی۔ ہر طرف موت کی خاموشی طاری تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ کسی لومڑی جگہ پر آگ دہکتی ہوئی نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا کہ کسی شمشان گھاٹ تھی۔ چبوترے پر کسی مردے کی لاش جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ آگ کے شعلے غائب ہو گئے تھے صرف انگارے دہک رہے تھے میں نے گہری نگاہ سے ماحول کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی انسان کیا جانور بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک طرف جھونپڑی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چل کر جھونپڑی کے پاس آ گیا۔ جھونپڑی کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ باہر مٹی کا ایک بڑا سا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ میں ٹاٹ کا پردہ اٹھاتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ خدا جانے پردہ اٹھانے پر اندر سے کیا چیز نکل کر مجھے چمٹ جائے۔

جھونپڑی میں سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔

میں جلدی سے ہٹ گیا۔ جھونپڑی میں سے ایک جھکی ہوئی کمر والا بوڑھا آدمی کھانستا ہوا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں سلاخ تھی۔ وہ اس چبوترے کے پاس گیا جہاں مردے کو جلایا گیا تھا۔ وہ سلاخ سے آگ کریدنے لگا۔ میں دبے پاؤں چل کر اس کے قریب ایک طرف اندھیرے میں کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ چتا پر انگارے دہک رہے تھے۔ اس نے انگاروں میں سے کسی چیز کو سلاخ سے نیچے گرا دیا۔ پھر کندھے پر ڈالا ہوا کپڑا لے کر اس چیز کو اٹھا لیا۔ وہ مردے کی کھوپڑی تھی۔ کھوپڑی کو کپڑے میں لپیٹ کر بوڑھا جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے چلنے لگا تو میرے پاؤں تلے ایک پتھر پھسل گیا۔ آواز سن کر وہ وہیں رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس نے مجھے اندھیرے میں دیکھ لیا تھا۔ بڑی رعب دار آواز میں بولا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے اس سے زیادہ رعب دار آواز میں کہا۔

"میں پولیس کا آدمی ہوں۔ تم مردے کی کھوپڑی نکال کر لے جا رہے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں ایسا کرنا جرم ہے جس کی سزا سات سال قید ہے۔"

بوڑھے نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! مجھے شما کر دیں۔ کسی نے کہا تھا میرا بچہ بیمار ہے۔ تازہ جلے ہوئے

Prepared By: S.Sohail Hussain

موے کی کھوپڑی لا دو۔ اس میں پانی ڈال کر بیمار بچے کو پلاؤں گا تو وہ اچھا ہو جائے گا۔"

میں نے کہا

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ نہیں تو ابھی پکڑ کر تھانے لے جاؤں گا۔"

بوڑھا تو میرے قدموں پر گر پڑا۔

"حضور معاف کر دیں۔ میں نے سچ بولا ہے میرا کوئی قصور نہیں۔ بیمار بچے کی خاطر کھوپڑی نکال کر لے جا رہا تھا۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور بتاؤ یہاں اور کون کون لوگ جادو ٹونہ کرنے آتے ہیں۔"

بوڑھا بولا۔

"مہاراج! کبھی کبھی رات کو سپیرے لوگ یہاں آتے ہیں۔ وہ موے کی دو تین ہڈیاں نکال کر چبوترے پر بیٹھ کر کچھ دیر منتر پڑھتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟"

"مہاراج! بستی کی طرف سے آتے ہیں۔ میں نے منع کیا تو وہ کہنے لگے تجھے جان سے مار دیں گے۔ خبردار کسی کے آگے ذکر نہ کرنا۔"

بوڑھا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس سے مجھے مفید معلومات حاصل ہونے کی توقع بھی نہیں تھی۔ جو کچھ وہ بتا سکتا تھا اور جتنا کچھ اسے معلوم تھا اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آئندہ وہ لوگ یہاں آئیں تو تھانے میں آ کر ہمیں خبردار کر دینا۔"

"جو حکم مہاراج۔"

میں شمشان سے واپس چل پڑا۔

مجھے ایک سانپ کی ضرورت تھی جس کو پروین کا رومال سنگھا کر میں اسے اس کی

تلاش میں روانہ کر سکوں۔ تاج محل کے ویران علاقے سے مجھے کوئی سانپ نہیں ملا تھا۔ آگرہ میں پرانے کھنڈروں کی کمی نہیں تھی۔ اگلے روز میں آگرہ کے پرانے قلعے کی طرف نکل گیا۔ قلعے کے آس پاس دو چار ٹوٹے پھوٹے کھنڈر تھے۔ میں ایک جگہ دیوار کی گری ہوئی پرانی اینٹوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھ گیا۔ وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے پروین کا سنبھالا ہوا منتر تین بار پڑھا۔ پھر زمین پر تین بار ہاتھ مارا اور سانپ کا انتظار کرنے لگا۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے ایک کالے رنگ کے سانپ کو دیکھا جو دوسرے کھنڈر کی طرف سے رینگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میں سانپ سے اس لئے نہیں ڈرتا تھا کہ میرے پاس پروین کا رومال تھا جس کی بو پا کر سانپ میرے سامنے ادب سے سر جھکا کر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کالا سانپ آہستہ آہستہ میرے قریب آ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے پروین کا رومال نکال کر اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ سانپ نے رومال میں آتی پروین کی تیز بو کو سونگھ کر زور سے پھنکار ماری اور پیچھے ہٹ کر ایک طرف دیکھنے لگا۔ وہ پرانے قلعے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ قلعے کی طرف چلنے لگا۔ میں نے پروین کا رومال جیب میں رکھا اور سانپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

کالا سانپ قلعے کے بہت بڑے محرابی دروازے کی دہلیز پر آ کر رک گیا۔ قلعے کا دروازہ آدھا زمین میں دھنس گیا ہوا تھا۔ سانپ نے منہ اوپر اٹھا کر پروین کی بو سونگھی اور قلعے کی ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا اندر بہت کھلے میدان میں آ گیا۔ یہ قلعے کا بہت بڑا اندرونی احاطہ تھا۔ تین طرف اونچی دیوار تھی۔ ایک جانب دو منزلہ ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑیاں اور دالان نظر آ رہے تھے۔ کالا سانپ ان کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں ایک شکستہ زینہ قلعے کی دوسری منزل کو جاتا تھا۔ سانپ زینے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اوپر ایک دالان تھا۔ دالان کے فرش پر گرد جمی ہوئی تھی اور اینٹیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ دالان کی ایک جانب تین کوٹھڑیاں تھیں۔ کسی کوٹھڑی کا دروازہ سلامت نہیں تھا۔ سانپ ایک کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس

Prepared By: S.Sohail Hussain

کے پیچھے کوٹھڑی میں آ گیا۔ یہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔

میں سانپ کو کوٹھڑی کے کونے میں جا کر پھنکارنے لگا۔ میں اس کے قریب گیا تو دیکھا کہ وہاں ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ سانپ زینہ اترنے لگا۔ آگے پھر ایک دالان آ گیا۔ اس دالان میں بھی ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ سانپ وہ زینہ بھی اتر گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی نیچے آ گیا۔ یہ زمین کے اندر ایک کشادہ جگہ تھی جہاں اونچی چھت کے دو بڑے سوراخوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ درمیان میں ایک پرانا تابوت پڑا ہے۔ سانپ اس تابوت کے سرہانے کی جانب فرش پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دھندلی روشنی میں تابوت کو غور سے دیکھا۔ لکڑی کے تابوت کی حالت بے حد شکستہ ہو رہی تھی۔ اس پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی اور مکڑیوں نے جگہ جگہ جالے بن رکھے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر سانپ مجھے یہاں لایا ہے تو اس تابوت کو کھول کر دیکھنا چاہئے۔ ممکن ہے اندر پروین بے ہوش پڑی ہو۔ وہ کمبخت پیر قاتل پیرے پروین کو بے ہوش کر کے اس تابوت میں ڈال گئے ہوں۔

تابوت کو تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے تبسم سے اس کا ڈھکن اٹھایا تو ایسی چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوئی کہ میں خود بھی ڈر گیا۔ تابوت کا ڈھکن ذرا سا اوپر اٹھا اور پھر اچانک اپنے آپ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ سانپ وہاں نہیں تھا۔ حیران ہوا کہ سانپ کہاں غائب ہو گیا۔ میں نے دوبارہ تابوت کو کھولنے کی کوشش کی مگر ڈھکن تابوت کے ساتھ ایسا جڑ چکا تھا جیسے کسی نے کیل ٹھونک کر بند کر دیا ہو۔ میں وہاں سے واپس بھی نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ سانپ یونہی مجھے وہاں نہیں لایا تھا۔ وہ یقیناً پروین کی بو کے پیچھے پیچھے چل کر یہاں آیا تھا۔ اس تابوت کے کھلنے سے پروین کی گمشدگی کا راز حل ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر پورا زور لگا کر تابوت کے ڈھکن کو کھولنا چاہا تو مجھے ایک عورت کی پرسکون مگر کمزور آواز سنائی دی۔

"میرے تابوت کو مت کھولو۔ تم اسے نہیں کھول سکو گے۔"

میں خوف کے مارے وہیں بیٹھ گیا۔ یہی عورت کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"جس کی تلاش میں سانپ تمہیں یہاں لایا ہے وہ یہاں لائی ضرور گئی تھی مگر اب وہ یہاں نہیں ہے۔"

میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

عورت کی آواز آئی۔

"میرا نام انار بیگم ہے۔ میں ہندوستان کے ایک ترک بادشاہ کی چہیتی کنیز تھی۔"

میں نے سوال کیا۔

"جس کی تلاش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے اس کا نام پروین ہے۔ اس کا پہلا ہندوانہ نام پاروتی تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد فقیر بابا نے اس کا نام پروین رکھ دیا تھا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ یہاں کب آئی تھی؟ اسے کون لایا تھا؟ اور اب وہ کہاں ہو گی؟"

انار بیگم کی روح نے گہرا سانس بھرنے کے بعد کہا۔

"تم دنیا والوں کے پاس سوال بہت ہوتے ہیں۔ جواب نہیں ہوتے۔ پروین کو یہاں دو آدمی لائے تھے۔ وہ بے ہوش تھی۔ انہوں نے بے ہوشی کی حالت میں اسے میرے تابوت کے پاس لٹا کر اس پر کچھ طلسمی منتر پڑھے تھے۔ دونوں آدمی خطرناک پیرے تھے جن کو جادو ٹونے کا کافی علم بہت آتا تھا۔ وہ پروین کو دوبارہ سانپ کی حالت میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ آپس میں اس قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ دیر تک وہ بے ہوش عورت پر کئی قسم کے منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہے۔ مگر وہ عورت پروین سانپ کی شکل میں تبدیل نہ ہوئی۔ اس کے بعد وہ اسے اٹھا کر یہاں سے لے گئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

انار بیگم کی روح نے کہا۔

"تم مجھ سے وہ باتیں پوچھ رہے ہو جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ میں نہیں جانتی۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"اے محترم روح! کیا تم مجھے کوئی ایسا طریقہ بتا سکتی ہو جس پر عمل کر کے میں پروین کے پاس پہنچ سکوں؟"

انار بیگم کی روح نے کہا۔

"تم اس کے پاس پہنچ بھی گئے تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

روح گویا ہوئی۔

"وہ اس لئے کہ ان پیروں نے پروین پر ایسا خطرناک منتر پڑھا تھا کہ اب وہ اور پریشان ہیں کہ اس منتر کا توڑ کیسے کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس منتر سے پروین سانپ میں تبدیل ہو جائے گی اور اس کی مدد سے زمین میں مدفون بادشاہوں کے خزانے لوٹ سکیں گے۔ لیکن منتر الٹا پڑ گیا۔ پروین اب جسمانی حالت میں زندہ ضرور ہے مگر اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر کسی اور جگہ پہنچ چکی ہے۔"

میں پریشان ہو گیا۔

"تو کیا پروین مر چکی ہے؟ کیا اب اس کی روح کبھی اس کے جسم میں واپس نہیں آئے گی؟"

اس پر انار بیگم کی روح نے جواب دیا۔

"نہیں۔ پروین مری نہیں۔ وہ زندہ ہے مگر دنیا والوں کے لئے وہ مر چکی ہے۔"

میں نے کہا۔

"کیا میں پروین کی روح سے بھی نہیں مل سکتا؟ آپ میری ملاقات پروین کی روح سے کرا سکتی ہیں؟"

انار بیگم کی روح نے کہا۔

"ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ پھر شاید تمہیں پروین کی روح خود کوئی ایسا طریقہ بتا دے کہ اس کی روح دوبارہ اپنے جسم میں واپس جا سکے۔"

میں نے انار بیگم سے کہا۔

"اے نیک دل روح! مجھے ایک بار پروین سے ملا دو۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گا۔"

انار بیگم کی روح بولی۔

"چونکہ پروین کی روح کا رشتہ اپنے جسم کے ساتھ ابھی تک قائم ہے اس لئے اس کی روح نہ عالم بالا میں ہے نہ عالم برزخ میں ہے اور نہ عالم ارضی میں ہے۔"

"تو پھر وہ کہاں ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

انار بیگم کی روح نے کہا۔

"پروین کی روح عالم ارضی اور عالم برزخ کے درمیان بھٹک رہی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بات نہیں کر سکتی۔ اپنی مرضی سے کسی کے پاس نہیں جا سکتی۔"

"تو پھر میں اس سے کس طرح مل سکتا ہوں؟"

"پروین کی روح سے ملنے کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ آگرہ شہر کے جنوب میں ولی کی طرف جاتے ہوئے ساتویں میل پر سڑک کی بائیں جانب بیری کے درختوں کے جھنڈ میں ایک پرانی خانقاہ ہے۔ اگر تم آدھی رات کو وہاں جا کر ایک خاص عمل پڑھو تو پروین کی روح ظاہر ہو جائے گی اور تم سے بات بھی کر سکے گی۔"

میں نے کہا۔

"وہ عمل کیا ہے اے نیک روح؟"

انار بیگم نے مجھے ایک خاص وظیفہ بتایا اور کہا۔

"یہ وظیفہ پڑھنے سے پہلے خانقاہ کے چبوترے پر قبر کے سرہانے کی جانب اگربتیاں سلگا لینا۔ اس کے بعد وظیفہ ایک سو مرتبہ پڑھنا۔ خدا نے چاہا تو پروین سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔"

میں نے انار بیگم کی روح کا شکریہ ادا کیا اور تہ خانے سے نکل کر قلعے سے باہر آ

Prepared By: S.Sohail Hussain

گیلہ ہوئی میں پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ حیرانی کی بات ہے کہ جو وظیفہ مجھے اماں بکھر کی روح نے بتایا تھا وہ مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ میں بڑی بے چینی سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب سورج غروب ہو گیا تو میں نے غسل کر کے وضو کیا۔ نئے کپڑے پہنے اور ٹیکسی لے کر اگرو سے ملی جاتی سڑک پر نکل گیا۔ ساتویں میل کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اگرو شہر سے نکلنے کے بعد میں نے بائیں جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ سب کچھ کھیتوں میں کہیں کہیں بیری کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دیتے تو میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"یہاں ایک خانقاہ ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے۔"

ڈرائیور بولا۔

"آپ شاہ جی کی خانقاہ پر جائیں گے؟"

میں نے سوچا کہ وہی خانقاہ ہو گی۔ میں نے کہا۔

"ہاں وہیں جانا ہے۔"

دو تین میل آگے جانے کے بعد بائیں جانب مجھے بیری کے درختوں کا ایک بن بیا جھنڈ نظر آیا۔ ڈرائیور بولا۔

"وہ سامنے شاہ جی کی خانقاہ ہے۔"

میں نے کہا "میں یہیں ٹیکسی روک لو۔"

میں اپنے ساتھ اگربتیوں کا پورا بنڈل اور رومال میں گلاب کے پھول بھی لیا تھا۔ ٹیکسی والے کو رخصت کرنے کے بعد میں کھیتوں میں سے گزرتا ہوا شاہ جی کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ خانقاہ پر بیری کے گھنے درختوں نے اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ درختوں کی ٹہنیاں خانقاہ کے صحن پر جھکی ہوئی تھیں۔ صحن میں ایک پرانی قبر بنی ہوئی تھی۔ میں نے جاتے ہی قبر پر گلاب کے کچھ پھول ڈالے۔ تین چار اگربتیاں سلگا کر قبر کے سرہانے کی طرف لگا دیں۔ پھر فاتحہ پڑھ کر مرحوم کی روح کو ثواب پہنچایا۔ اور وہیں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

مجھے اب آدھی رات گزرنے کا انتظار تھا۔

شام کے وقت میں اس لئے آ گیا تھا کہ رات کے اندھیرے میں مجھے خانقاہ تلاش کرنے میں مشکل پیش آ سکتی تھی۔ خانقاہ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی کو کبھی کبھی دور سڑک پر سے گزرنے والی کوئی گاڑی یا ٹرک کی آواز توڑتی اور اس کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی۔ شام کا سرمئی اندھیرا آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ پھر ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں نے جیب سے موم بتی نکال کر قبر پر روشن کر دی۔ اور وہیں بیٹھ کر آدھی رات کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے کلائی پر گھڑی باندھی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے کے بعد گھڑی پر نگاہ ڈال کر وقت دیکھ لیتا تھا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی خانقاہ پر چھائی ہوئی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جب رات کے ٹھیک بارہ بج گئے تو میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ قبر کے پہلو میں گلاب کے ساری پھول بکھیر دیئے باقی کی اگربتیاں بھی سلگا کر قبر کے پاس ہی لگا دیں۔ اس کے بعد اللہ کا نام لے کر وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ وظیفہ ایک سو بار پڑھنا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے وظیفے کا ورد کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ گنتا بھی جا رہا تھا۔ جب پورے سو کی گنتی مکمل ہو گئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خانقاہ پر موم بتی کی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اگربتیوں کی خوشبو نے فضا کو لبریز کر دیا تھا۔

اچانک ایسی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جیسے کسی نے لمبا سانس بھرا ہو۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"پروین! پروین! کیا یہ تم ہو؟"

مجھے پروین کی بڑی نحیف سی آواز سنائی دی۔

"ہاں۔ میں ہوں۔ پروین کی بھٹکتی ہوئی روح!"

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"پروین! خدا کے لئے مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟ تم کس حالت میں ہو؟ مجھے اپنی صورت تو دکھا دو۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

پروین کی آواز آئی۔

"میں نہ عالم بالا میں ہوں نہ عالم برزخ میں اور نہ عالم ارضی میں رہتی ہوں۔ میں چونکہ ابھی تک مردہ نہیں ہوں اور میری روح کا میری جسم کے ساتھ ایک باریک سا رشتہ قائم ہے اس لئے میں عالم حیرت میں بھٹک رہی ہوں۔ میں صرف تمہیں خواب میں مل سکتی ہوں۔ خواب میں ہی تمہیں اپنی شکل دکھا سکتی ہوں اور خواب میں ہی تم میری شکل دیکھ سکتے ہو اور مجھ سے بات کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تو خدا کے لئے مجھے خواب میں ملنے کے لئے آ جاؤ۔"

پروین کی روح کی آواز آئی۔

"آج رات میں تمہیں خواب میں ملنے آؤں گی۔ تم رات کو وضو کر کے اور کلام شریف پڑھ کر سونا۔ میں تمہیں ملنے آ جاؤں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ میں زیادہ دیر کسی جگہ نہیں ٹھہر سکتی۔ شاید یہ مجھے میرے گذشتہ برے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔ میرے حق میں دعا کرنا کہ خدا میرے گناہ معاف کر دے۔ میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔"

اس کے بعد موم بتی کی لو تھرتھرائی اور پھر پروین کی آواز نہ آئی۔ وہ جا چکی تھی۔

میں بہت اداس ہو گیا تھا۔ پروین پر سخت مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں نے پروین کو تاج محل کے مینار کے چکر لگانے کی کیوں اجازت دی۔ میں اسے روک لیتا۔ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا۔ مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ بھیڑیے کے روپ میں میری بدنصیبی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔

میں دیر تک خانقاہ میں قبر کے پاس بیٹھا خدا کو یاد کرتا اور خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔

ایک دو بار میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ آخر جب آسمان پر صبح کا نور نمودار ہونے لگا تو میں نے ایک بار پھر قبر میں آسودہ خاک بزرگ کی روح کے ایصال ثواب کے لئے فاتحہ پڑھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا خانقاہ سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر

ابھی تک پچھلے پہر کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ صبح کے نور کی روشنی آسمان کے مشرقی افق پر آہستہ آہستہ اجاگر ہو رہی تھی۔ کوئی رکشا ٹیکسی وہاں نہ ملی۔ پیدل ہی شہر کی طرف چلنے لگا۔ شاید ایک آدھ میل پیدل چلا ہوں گا کہ پیچھے سے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ میں سڑک کے کنارے ہو گیا۔ پیچھے دیکھا تو گاڑی کے اوپر سرخ بتی جل رہی تھی۔ یہ کوئی ٹیکسی تھی اور خالی تھی۔ میں نے ہاتھ دے دیا۔ گاڑی کی اینٹ لائیٹس میں ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر گاڑی روک لی۔

"شہر چلو گے بابو؟"

"ہاں بھئی۔"

میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کو ہوٹل کا نام بتا کر کہا کہ مجھے اس ہوٹل میں لے جائے۔ ٹیکسی چل پڑی۔ میرے کانوں میں ابھی تک پروین کی روح کی آواز گونج رہی تھی۔ کاش میں اس کی صورت بھی دیکھ سکتا۔ اب صرف ایک ہی امید باقی رہ گئی تھی کہ پروین کو میں کم از کم خواب میں تو دیکھ سکوں گا اور اس سے باتیں کر سکوں گا۔

رات میں نے غسل کرنے کے بعد وضو کیا اور بستر پر بتی بجھا کر لیٹ گیا۔ اس خیال سے نیند بھی نہیں آ رہی تھی کہ رات کو خواب میں پروین سے ملنا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کس وقت مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ اس کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ میں کسی شہر کے بازار میں سے گزر رہا ہوں۔ شہر کی ساری دکانیں کھلی ہیں مگر نہ کوئی دکاندار موجود ہے اور نہ کوئی گاہک ہی نظر آ رہا ہے۔ سارا بازار خالی ہے۔ کسی طرف سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی۔ بازار آگے جا کر اپنے آپ ایک گلی کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ مکانوں کے دروازوں پر خاموشی کی مہر لگی تھی۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ ایک عجیب سا ڈرا دینے والا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

گلی آگے ایک کھلی جگہ پر نکل آئی۔

مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ یہ دن کا وقت ہے یا رات کا وقت ہے۔ ایک عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جسے نہ آپ روشنی کہہ سکتے ہیں نہ اندھیرا۔ یہ اندھیرے اور روشنی کے درمیان کی کوئی حالت تھی۔ دھند یا کہرا بھی نہیں تھا۔ کھلی جگہ پر میں رک گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تالاب ہے جس کے اوپر سامنے ایک اونچی عمارت کو جانے کے لئے راستہ بنا ہوا ہے۔ یہ ایک قسم کا پل تھا۔ میں اپنے آپ عمارت میں داخل ہونے کے لئے تالاب کے پل کی طرف بڑھا۔ مجھے جیسے کوئی کہہ رہا تھا کہ سامنے والی عمارت میں چلو۔ پل پر قدم رکھتے ہی مجھے پھنکاریں سنائی دینے لگیں۔ میں نے ڈر کر نیچے دیکھا۔ میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ پل کے نیچے تالاب میں پانی کے اوپر سانپ ہی سانپ تیر رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ پانی نہیں بلکہ سانپوں سے بھرا ہوا تالاب ہے۔ ہر سانپ پھنکار رہا تھا اور بار بار گردن اوپر میری طرف کر رہا تھا۔ میں ڈر کر واپس جانے لگا تو میرے دل میں جیسے کسی نے آہستہ سے کہا۔ "سامنے والی عمارت میں چلو۔" اور میں پل پر چلنے لگا۔ میں تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے پاؤں جیسے من من بھاری ہو گئے تھے۔ میں جتنی تیز چلنے کی کوشش کرتا میرے پاؤں اتنے ہی بھاری ہو جاتے۔

کسی نہ کسی طرح آخر میں عمارت کے پاس پہنچ گیا۔

عمارت کو سر اٹھا کر دیکھا تو دہشت زدہ ہو گیا۔ ساری کی ساری عمارت ایک پہاڑ جتنے بڑے سانپ کی شکل کی بنی ہوئی تھی۔ دروازہ سانپ کے کھلے ہوئے منہ کا بنا تھا۔ یعنی دروازے کی جگہ ایک اژدہا قسم کے سانپ نے اپنا منہ کھول رکھا تھا۔ اس کی زبان پر اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ خوف کے مارے مجھے پسینہ آ گیا۔ اسی وقت میرے کانوں میں پروین کی کمزور اور نحیف سی آواز آئی۔

"سانپ کے اندر آ جاؤ۔"

پروین کی آواز سن کر مجھے حوصلہ ہوا اور میں سانپ کے منہ میں داخل ہو گیا۔ سانپ کی زبان کی سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا تو دیکھا کہ سامنے ایک اور سانپ کے منہ کا دروازہ بنا ہوا ہے۔ میں حوصلہ کر کے اس دروازے میں بھی داخل ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں سانپ کے پیٹ میں چل رہا ہوں۔ یہ گول سرنگ نما راستہ تھا جس کی دیواروں میں مجھے سانپ کی بڑی بڑی کلن کی طرح کی پسلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

آگے ایک چھوٹا سا طاق تھا۔ یہاں آ کر سرنگ ختم ہو جاتی تھی۔ میں نے طاق کو آہستہ سے دھکیل کر کھولا تو مجھے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے بہت سی عورتیں آہستہ آہستہ رو رہی ہوں۔ میں نے طاق کے اندر سر ڈال کر دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا باغیچہ نظر آیا۔ میں باغیچے میں اتر گیا۔ عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوتی گئیں۔ پھر ان آوازوں کی جگہ ایک سیٹی ایسی لمبی آواز نے لے لی۔ یہ سیٹی کی آواز رک رک کر آ رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا۔ میں نے بچپن میں برسات کے دنوں میں ایک تالاب کے پاس یہ آواز سنی تھی اور ایک سپیرے سے پوچھا تھا کہ یہ آواز کس جانور کی ہوتی ہے۔ اس نے کہا تھا۔ یہ سانپ کی سیٹی کی آواز ہے۔ سانپ برسات کے موسم میں کبھی کبھی ایسی آواز نکالا کرتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر وہیں رک گیا کہ کہیں آگے بھی سانپ ہی سانپ نہ ہوں۔ اتنے میں میرے کانوں نے ایک بار پھر پروین کی آواز سنی۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"رکو نہیں۔ چلتے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

"مگر تم سامنے کیوں نہیں آتیں؟ تم نے تو کہا تھا کہ تم خواب میں میرے سامنے آؤ گی مجھ سے باتیں کرو گی۔"

اس کے جواب میں پروین کی آواز نہ آئی۔ وہی سانپ کی سی تھوڑی تھوڑی دیر بعد سنائی دے رہی تھی۔ میں پاؤں میں چلنے لگا۔ ایک چھوٹی سی روش تھی جس پر میں چل رہا تھا۔ جب میں درختوں کے نیچے پہنچا تو دیکھا کہ ایک ایک درخت کی ٹہنیوں پر کئی کئی سانپ لپٹے نیچے لٹک رہے تھے اور اپنی گردن اٹھا اٹھا کر لہرا رہے تھے۔ جیسے ابھی مجھے ڈس دیں گے۔ میں نے سوچا کہ یہ خواب ہے۔ میں خواب میں مر نہیں سکتا۔ اس لئے بھاگنے کی ضرورت نہیں آگے پروین میرا انتظار کر رہی ہے۔

میں درختوں کے نیچے سر جھکا کر چل رہا تھا۔ ٹہنیوں پر لٹکے ہوئے سانپ میری طرف لہرا لہرا کر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بالکل قریب آ کر واپس پلٹ جاتے جیسے بھولا ایک مقام پر آ کر واپس چلا جاتا ہے۔ روش ختم ہوئی تو سامنے ایک سرسبز گھاس والا قطعہ آ گیا۔ قطعے کے وسط میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ میں تخت کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ یہ تخت لکڑی کا نہیں ہے بلکہ سانپوں کی سریاں اور پٹریوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ اتنے میں میں نے ایک جانب سے پروین کو اس عالم میں آتے دیکھا کہ اس کے جسم کے گرد ایک بہت بڑا سانپ لپٹا ہوا تھا جس کے بوجھ سے وہ دہری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے اردگرد چھ سات عورتیں اور مرد چل رہے تھے۔ ان مردوں اور عورتوں کے جسموں سے بھی سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے پروین کو دیکھا تو بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ پروین کے جسم کے گرد اژدہا قسم کا سانپ لپٹا ہوا تھا اس نے مجھے دیکھ کر اتنی زور سے پھنکار ماری کہ مجھے لگا دھوئیں اور آگ کا بادل میرے جسم کو چھوتا ہوا گزر گیا ہے۔ تب پروین کی آواز آئی۔

"تخت کے پیچھے چلے جاؤ۔"

میں دوڑ کر گھاس پر بچھے ہوئے تخت کے پیچھے جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ پروین اپنے گرد لپٹے ہوئے بہت بڑے اژدہا سانپ کا سر دونوں ہاتھوں میں اٹھائے رکتی رکتی چلتی تخت کے پاس آئی۔ اور اس پر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی اژدہا اپنے آپ اس کے جسم سے اتر کر ایک طرف کو چلا گیا۔ اس کے بعد وہ مرد اور عورتیں بھی اپنے اپنے جسموں کے گرد لپٹے ہوئے سانپوں کی گردنیں پکڑے وہاں سے چلے گئے۔ جب وہاں سوائے میری اور پروین کے اور کوئی نہ رہا تو میں جھاڑی کی اوٹ سے نکل کر پروین کے سامنے آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

"میں نے تمہیں اپنی حالت کا نظارہ کرنے کے لئے یہاں بلایا ہے۔ دیکھو۔ میں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ یہ خدا کی طرف سے نازل کیا ہوا عذاب نہیں ہے۔ بلکہ اس عذاب کو میں نے خود اپنے لئے دنیا میں پیدا کیا تھا۔"

میں اس کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ میں نے اسے کہا۔

"پروین! کیا اس حالت کو ان جرائم پیشہ پیسوں کی وجہ سے پہنچی ہو جنہوں نے تمہیں تاج محل کے مینار سے اغوا کیا تھا اور پھر تمہاری بے ہوشی کی حالت میں تم پر ایک ایسا طاقتور منتر پھونکا کہ جو الٹا پڑ گیا اور تمہاری روح نے عارضی طور پر تمہارے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

پروین عالم خواب میں میرے بالکل پاس تخت پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکان اور خستگی کے اثرات نمایاں تھے۔ جیسے وہ مسلسل کسی تکلیف میں مبتلا رہی ہو۔ کہنے لگی۔

"وہ تو ایک بہانہ تھا جو میرے اپنے کئے ہوئے اعمال نے پیدا کر دیا تھا تاکہ میں اپنے کئے ہوئے برے عملوں کی سزا بھگت سکوں۔"

میں نے پروین کی اس وقت کی ذہنی اور نفسیاتی حالت پر توجہ دینے کی بجائے اس سے پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ تاج محل سے کس طرح اغوا ہوئی تھی؟ کیا گلیڈ کے علاوہ بھی وہاں کوئی اور آدمی تھا؟

Prepared By: S.Sohail Hussain

پروین نے تھکی ہوئی آواز میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ ساری باتیں اب مجھے خواب کی طرح لگتی ہیں اور اب یہ حالت جس کو تم خواب کی حالت کہتے ہو اور کہتے ہو مجھے حقیقی زندگی کی طرح معلوم ہو رہی ہے۔"

میں چپ سا ہو کر پروین کی طرف تکنے لگا۔

"پروین! کیا تم اس دنیا سے کب نکل کر میرے پاس آؤ گی؟"

اس نے کہا۔

"یہ میں اپنے جسم پر کئے گئے عذاب کی سزا بھگت رہی ہوں۔ جس طرح انسان کے جسم پر کوئی زخم لگ جائے تو زخم کو آہستہ آہستہ آرام آتا ہے اور زخم ٹھیک ہونے تک اپنا پورا وقت لیتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں ایک آدمی گناہ کر کے اپنے اوپر جو ظلم کرتا ہے اور اپنی روح کو زخمی کر لیتا ہے اسے اگلی دنیا میں اس وقت تک تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں جب تک کہ اس کی روح کے زخم ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ یاد رکھو جسم کے زخم کو ٹھیک ہونے میں اتنی دیر نہیں لگتی۔ لیکن روح پر جو زخم لگتے ہیں انہیں بھرنے میں ایک لمبی مدت لگتی ہے یہ لمبی مدت ایک سال کی بھی ہو سکتی ہے ایک ہزار سال کی بھی ہو سکتی ہے۔ دس ہزار سال کی بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے یہاں ایسی ایسی گناہگار روحوں کو دیکھا ہے جو دو دو کروڑ سال سے یہاں پڑی اپنی روح پر لگے ہوئے گناہوں کے زخموں کے بھر جانے کا انتظار کر رہی ہیں۔"

میں تو حیران سا ہو کر پروین کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری ابھی مکمل طور پر موت واقع نہیں ہوئی۔ ابھی میری روح کا رشتہ ایک باریک ڈوری کے ذریعے میرے نیم مردہ جسم سے بندھا ہوا ہے۔ اگر میری روح کسی طرح واپس اپنی جسم میں چلی گئی تو مجھے عالم ارضی میں رہ کر اپنے گناہوں کو دھونے اور توبہ کرنے کا سنہری موقع مل جائے گا۔ کیونکہ زندہ رہ کر ایک گناہگار اگر صدق دل سے توبہ کر لے اور آئندہ گناہ نہ کرے تو اس کی روح پر لگے ہوئے سارے زخم اللہ پاک ٹھیک کر دیتا ہے اور اسے معافی مل جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری روح کو تمہارے جسم میں واپس لانے کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ تمہارا نیم مردہ جسم اس وقت کہاں ہے اور مجھے تمہیں دوبارہ عالم ارضی میں زندہ حالت میں دیکھنے کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

پروین نے کہا۔

"جن لوگوں نے مجھ کو تاج محل کے مینار سے اغوا کیا تھا وہ لوگ بڑے خطرناک قسم کے جرائم پیشہ پیرے تھے۔ وہ کالے علم اور سانپوں کے طلسم کے بڑے ماہر تھے انہوں نے مجھ کو کوئی روحانی سنگھا کر بے ہوش کیا تھا۔ میں تم سے الگ ہو کر گھاٹیا کے ساتھ جب تاج محل کے مینار کا چکر لگانے اس کی دوسری طرف گئی تو اچانک گھاٹیا نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا اور میرے منہ پر گیلا رومال رکھ کر اسے بند کر دیا۔ میں نے اس خیال سے زور سے سانس لیا کہ سانپ بن کر اسے ڈس دوں گی لیکن اس سانس کے ساتھ ہی میرے جسم کے اندر رومال میں رکھی ہوئی بے ہوشی کی دوا داخل ہو گئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ اس کے بعد جب ہوش آیا تو وہ لوگ مجھ پر نہ جانے کتنے ہلاک کرنے والے منتر پڑھ کر پھونک چکے تھے جس کی وجہ سے میں ہوش میں تو آ گئی تھی لیکن نہ بول سکتی تھی نہ ہاتھ ہلا سکتی تھی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ میں اپنی آنکھیں بھی ادھر ادھر نہ پھیر سکتی تھی۔ میرا سانس بھی بند ہو چکا تھا۔ وہ نہ میں سانس بھر کر سانپ کی شکل بدل سکتی تھی۔ ایک طرح سے میں زندہ مردہ تھی۔ میرا خیال تمہاری طرف چلا گیا کہ نہ جانے میرے غائب ہو جانے سے تم کس قدر پریشان نہیں ہو گے۔ میں کسی طرح تم سے ملاقات کرنے کو بے قرار تھی۔ مگر مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ تم کہاں ہو۔ اگر میں پوری طرح مر چکی ہوتی تو مجھے ایک سیکنڈ سے بھی پہلے پتہ چل جاتا کہ تم کہاں ہو۔ کیونکہ مرنے کے بعد روح کی آنکھوں کے آگے سے خدا بہت سے پردے اٹھا دیتا ہے۔ لیکن میرے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ میں پوری طرح مری ہوئی نہیں تھی۔ میرا جسم زندہ تھا مگر روح اس دنیا میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے ابتدائی مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ میری پتھرائی ہوئی آنکھیں صرف

Prepared By: S.Sohail Hussain

میرے جسم میں روح کا جو باریک سا رشتہ قائم تھا اس کی وجہ سے چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ ورنہ میرا جسم بالکل مردہ تھا۔"

میں خواب میں پروین کے پاس بیٹھا اس کی حیران کر دینے والی آنکھیں کھول دینے والی باتیں سن رہا تھا اور مجھے ایک لمحے کے لئے احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے پروین سے کہا۔

"خدا کے لئے مجھے بتاؤ تمہارا مردہ جسم ان لوگوں نے کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟"

پروین کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ وہ کہنے لگی۔

"انسان اگر صرف ایک بار موت کے بعد کی زندگی کی ایک جھلک دیکھ لے تو پھر ساری زندگی کبھی کوئی گناہ نہ کرے۔ ان جرائم پیشہ پیشہ ور لوگوں پر مجھے رحم آتا ہے کیونکہ میں جانتی ہوں اپنی موت کے بعد انتہائی دردناک اور شدید عذاب بھگتنا ہے مجھے اور کوئی پتہ نہیں کہ وہ ڈاکو خونی اور جرائم پیشہ لوگ یہ اذیت ناک عذاب ایک سال تک بھگتیں گے یا ایک لاکھ سال تک عذاب میں جلتے، کٹتے، سڑتے رہیں گے۔۔۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میرا مردہ جسم ان لوگوں نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ یہ بات ابھی ابھی کسی غیبی طاقت نے میرے دل میں ڈالی ہے۔ مجھ پر جو یہ رحم کیا گیا ہے تو صرف اس لئے کہ میری نیت نیک تھی اور میں نے بعد دیوی دیوتاؤں کی پوجا والے مذہب کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کرنے والے دین اسلام کو قبول کر لیا ہے۔"

پروین نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں کچھ کہنے لگا لیکن جیسے کسی نے میری زبان ایک لمحے کے لئے بند کر دی۔ پروین نے تین چار مرتبہ دھیمی آواز میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگی۔ پھر آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"آگرہ سے اٹاوا اور کان پور جاتے ہوئے راستے میں ایک سٹیشن فیروز آباد آتا ہے فیروز آباد ریلوے سٹیشن کے پاس انگریزوں کے زمانے کا ایک مردہ خانہ ہے جو اب

بالکل ویران پڑا رہتا ہے کیونکہ سرکاری مردہ خانہ شہر کے ہسپتال میں بنا دیا گیا ہے۔ اس ویران مردہ خانے کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔ اس تہہ خانے میں میری نیم مردہ لاش ان لوگوں نے ترپال سے ڈھک کر رکھی ہوئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"پروین! پلیز مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا جسم دوبارہ کس طرح زندہ ہو گا۔ میں ایسا کونسا جتن کروں کہ تمہاری روح پھر سے اپنے جسم میں داخل ہو جائے؟"

پروین نے آہ بھر کر کہا۔

"یہ بات اب میرے اختیار سے بھی باہر ہو چکی ہے۔ ان سپیروں نے مجھ پر ایسا آتشی طلسم پھونکا ہے کہ جو اتنا پڑھ جانے کے بعد ان کے قابو سے بھی باہر ہو گیا ہے۔ وہ خود اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں۔ اگر زندہ نہیں ہوتی تو کم از کم ناگن کی شکل ہی اختیار کر لوں۔"

"کیا تمہارے ذہن میں ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ تمہاری روح واپس تمہارے جسم میں چلی جائے؟"

پروین نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا۔

"ابھی تک مجھے ایسا کوئی طریقہ معلوم نہیں ہو سکا لیکن میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ چونکہ میں نے آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ مجھے ضرور بخش دے گا۔ اس دوران تم صرف ایک کام کرو کہ اس ویران مردہ خانے سے میری لاش نکال کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دو۔ یہ محفوظ جگہ ایسی ہونی چاہئے جہاں میرے دشمن جرائم پیشہ پیرے نہ پہنچ سکیں۔ کیونکہ اگر انہوں نے مجھ پر مزید کوئی جادو ٹونہ نہ کیا تو ممکن ہے اب تک میرے جسم کے ساتھ روح کا جو نازک رشتہ قائم ہے وہ بھی ٹوٹ جائے اور میں پوری طرح مر جاؤں۔ پھر میں تمہاری دنیا میں کبھی نہیں آ سکوں۔"

میں نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں اس کا انتظام ہر حالت میں کر کے رہوں گا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں تمہارا یہ مردہ جسم وہاں سے نکال کر محفوظ جگہ پر لے جاؤں گی۔ لیکن کہیں تمہاری لاش خراب ہونا تو شروع نہیں ہو جائے گی؟"

پروین بولی۔

"جب تک میری روح کا رشتہ میرے جسم سے قائم ہے میری لاش کو کچھ نہیں ہو گا۔"

اسی وقت اچانک ایک طرف سے عورتوں کے رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔ یہ وہی آوازیں تھیں جو پہلے بھی مجھے سنائی دی تھیں۔ میں نے پروین سے ان آوازوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے لمبا سانس بھر کر کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس دنیائے حیرت کی سیر کراتی ہوں۔"

وہ تخت پر سے اٹھی اور سامنے والے ٹیلے کی طرف چل پڑی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہوا میں تیر رہا ہوں۔

عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں سامنے والے ٹیلے سے آ رہی تھیں۔ پروین کی روح ٹیلے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"اب میرے ساتھ ساتھ چلنا۔"

ٹیلے پر ایک پگ ڈنڈی اوپر کو جا رہی تھی۔ ہم پگ ڈنڈی پر چلنے لگے۔ تھوڑا آگے جا کر پگ ڈنڈی ٹیلے کے پہلو کے ساتھ متوازی رخ اختیار کر گئی۔ ہم ذرا آگے گئے تو بین کرنے کی آوازیں پوری طرح سنائی دینے لگیں۔ پروین ٹیلے کے اندر بنے ہوئے غار کے دہانے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس نے غار کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

"ادھر دیکھو۔"

میں نے دیکھا کہ غار کے اندر چاروں طرف برف جمی ہوئی ہے۔ دیواریں برف کی ہیں۔ چھت برف کی ہے۔ فرش برف کا ہے۔ برف کے فرش پر جگہ جگہ عورتیں برف کے ستونوں کے ساتھ بندھی ہوئی ہیں۔ ان کے بال کھلے ہیں۔ گردنیں پیچھے کو جھکی ہوئی ہیں اور وہ دردناک آوازوں میں رو رہی ہیں۔ پروین نے کہا۔

"یہ وہ بدنصیب عورتیں ہیں جنہوں نے دنیا میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی خاطر فحاشی اور بدکاری کا راستہ اختیار کیا۔ ان کے سامنے نیکی کا راستہ بھی تھا۔ مگر انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اور برائی کے راستے پر چل پڑیں۔ یہ عذاب خود ان کا اپنا پیدا کیا ہوا ہے۔ جب تک ان دیواروں چھتوں اور فرش کی برف پگھل نہیں جاتی یہ اسی عذاب میں مبتلا رہیں گی۔ آؤ میں تمہیں کچھ اور دکھاتی ہوں۔"

پروین کی روح مجھے آگے لے گئی۔ یہاں ٹیلے کے دامن میں ایک سرسبز و شاداب باغیچہ تھا جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہاں سے خدا کی حمد و ثنا کی روح پرور پرسکون آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے کچھ سفید پوش خواتین نظر آئیں جن کے چہرے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ باغیچے میں سے ایسی خوشبوئیں آ رہی تھیں کہ میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھیں۔ پروین کی روح نے کہا۔

"یہ وہ پاکباز خواتین ہیں جو اپنے خاوندوں کی وفادار رہیں۔ ساری زندگی نیکی کے راستے پر چلیں۔ رزق حلال کی روکھی سوکھی کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا لیکن اپنی روح کو پاکیزہ رکھا۔ اپنی روح کو داغ دار ہونے سے بچایا اب یہ بہشت میں ہر وقت خدا کی حمد و ثنا میں مصروف ہیں۔ انہیں جو روحانی مسرت حاصل ہے ہم دنیا والے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

میں وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے باغیچے میں سے جو خوشبو آ رہی تھی وہ میری روح کو گہرا سکون عطا کر رہی تھی۔ مگر پروین نے کہا۔

"آؤ آگے چلیں۔"

اور ہم ٹیلے سے اتر کر دوسری طرف آ گئے۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

پروین نے مجھے اس دنیا کے کچھ اور منظر دکھائے جنہیں دیکھ کر میں نے دل میں عہد کر لیا کہ کبھی کوئی گناہ نہیں کروں گا۔ کسی کو برا نہیں کہوں گا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا اور خدا سے ہمیشہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہوں گا۔ اس کے بعد پروین اور میں ایک جگہ آ کر رک گئے۔

ہمارے سامنے ایک دریا بہہ رہا تھا۔ پروین نے کہا۔

"میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ اب مجھے یہاں سے واپس اپنے اعمال کا حساب پاک کے لئے واپس جانا ہو گا۔ تم جاؤ اور خدا کے حضور نماز پڑھ کر میری بخشش کی دعا کرو۔ اگر تم میرے نیم مردہ جسم کو محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور خدا کی رضا شامل حال رہی تو میں خواب میں آ کر بتاؤں گی کہ میری روح اپنے جسم میں دوبارہ کس طرح داخل ہو سکتی ہے۔"

اتنا کہہ کر پروین دریا کی لہروں پر چلتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے دیکھا کہ میں آگرہ کے ہوٹل کے کمرے کے بیڈ روم میں بستر پر لیٹا ہوا ہوں اور کھڑکی پر گرے ہوئے پردوں میں سے دھوپ چھن چھن کر کمرے میں آ رہی ہے۔ میرے دل و دماغ پر خواب کا گہرا اثر تھا۔ میرا دل بستر سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ واپس خواب کی دنیا میں چلا جاؤں۔ لیکن ایک بار خواب ٹوٹ جائے

تو پھر اسے دوبارہ دیکھنا محال ہوتا ہے۔

میں کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ فوراً غسل خانے میں جا کر غسل کیا۔ وضو کیا۔ دو رکعت نفل پڑھے۔ خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کا طلبگار ہوا۔ پروین کے حق میں صدق دل سے دعا مانگی اور نیچے جا کر ناشتہ کیا۔ اور وہیں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ وہاں سے مجھے فیروز آباد جا کر ویران مردہ خانے سے پروین کے نیم مردہ جسم کو نکال کر کسی محفوظ جگہ پر لے جانا تھا۔ فیروز آباد کا شہر آگرہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ میں اسی ہوٹل میں رہوں گا۔ یہاں سے فیروز آباد جا کر پروین کا نیم مردہ جسم رات کے اندھیرے میں اٹھا کر لے آؤں گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں اسے رکھوں گا کہاں۔ یہ کوئی زیور یا قیمتی دستاویزات نہیں تھیں کہ میں انہیں کسی بینک کے لاکر میں جمع کرا دیتا۔ ایک انسانی لاش تھی۔ اگرچہ یہ لاش پوری طرح مردہ نہیں تھی۔ اسے اپنے ساتھ ہوٹل میں نہیں لا سکتا تھا۔ یہاں لاتا تو پولیس کو خبر ہو جاتی۔ پولیس والے فوراً لاش کو قبضے میں لے کر مجھے گرفتار کر لیتے۔ ہوٹل والوں کو اتنا معلوم تھا کہ میرے ساتھ ایک عورت بھی آ کر کمرے میں ٹھہری تھی۔ اگر میں انہیں بتاؤں کہ وہ میری بیوی تھی اور دوسرے شہر گئی تھی۔ وہاں بیمار ہو کر مر گئی تو وہ لوگ ضرور یقین کر لیں گے لیکن اس حالت میں بھی لاش کو ہوٹل میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ لوگ یہی کہتے کہ اگر یہ آپ کی بیوی تھی اور مر گئی ہے تو اسے قبرستان میں دفن کیوں نہیں کرتے۔

فیروز آباد والے ویران مردہ خانے میں اگر لاش کو پڑی رہنے دیتا تو وہاں بھی وہ محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ جن جرائم پیشہ پیروں نے پروین کی لاش کو وہاں چھپایا ہوا تھا وہ ضرور واپس آ کر لاش کو اٹھا کر لے جاتے۔ یا اس پر کوئی دوسرا جادو ٹونہ کرنا شروع کر دیتے۔ ایک بات طے تھی کہ مجھے پروین کے نیم مردہ جسم یا لاش کو ویران مردہ خانے سے ضرور لے جانا تھا اور اسے میں آگرہ شہر والے اپنے ہوٹل میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ روپیہ پیسہ تو میرے پاس کافی ہے۔ کیوں نہ میں پروین کی

Prepared By: S.Sohail Hussain

لاش کو فیروز آباد یا آگرے کے کسی ہسپتال میں داخل کرا دوں۔ انہیں کہوں کہ میری بیوی اچانک بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ میں اس کا علاج کرانا چاہتا ہوں۔ پھر خیال آیا کہ جن لوگوں پر سکتہ طاری ہوتا ہے ان کے دل کی دھڑکن جاری ہوتی ہے اور وہ بے ہوشی کی حالت میں بھی سانس ضرور لے رہے ہوتے ہیں۔ مگر پروین نے تو مجھے بتایا تھا کہ میں سانس بھی نہیں لے رہی اور میرے دل کی دھڑکن بھی بند ہو گئی ہے لیکن میرا جسم اسی طرح گرم ہے اور روح کے ساتھ جسم کا رشتہ برقرار ہے۔ ہسپتال والے تو اس حالت میں پروین کو مردہ قرار دے کر لاش میرے حوالے کر دیں گے۔ پھر کیا کرنا چاہئے۔

میں ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں اتنی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لاش کو کہاں چھپایا جائے۔ آخر ایک ترکیب میرے دماغ میں آ گئی۔ یہ بڑی مناسب اور محفوظ ترکیب تھی۔ اس طرح میں پروین کی لاش کو چاہے جتنے دن جتنے سال چاہوں محفوظ رکھ سکتا تھا اور کسی کو ذرا سا شک بھی نہیں پڑ سکتا تھا۔ ترکیب یہ تھی کہ میں پروین کی لاش فیروز آباد سے لے کر اپنے ہوٹل میں آگرے آ جاؤں اور ہوٹل والوں سے کہہ دوں کہ میری بیوی فیروز آباد اپنے عزیزوں سے ملنے گئی تھی وہاں بخار چڑھا اور مر گئی۔ اس کے بعد میں اسے آگرہ کے کسی قبرستان میں دفنا دوں۔ پھر آدھی رات کو قبرستان میں جا کر قبر کی ایک جانب اتنا بڑا سوراخ بنا دوں کہ جس میں سے گزر کر میں ہر رات پروین کی لاش کو دیکھنے اور چیک کرنے آتا جاتا رہوں۔ اس طرح کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا اور مجھے لاش کی حفاظت کی پریشانی بھی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ میں اپنی اس انوکھی اور محفوظ ترین ترکیب پر خود ہی بڑا خوش ہوا۔ اسی وقت ہوٹل کے کاؤنٹر پر گیا۔ کاؤنٹر کلرک سے کہا۔

"میری بیوی جو میرے ساتھ یہاں آئی تھی اپنے رشتے داروں سے ملنے فیروز آباد گئی تھی۔ ابھی ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ وہاں بیمار پڑ گئی ہے۔ میں اس کی خبر لینے جا رہا ہوں۔ یہاں میرا کمرہ محفوظ رکھئے گا۔ میں آپ کو مزید ایک ہفتے کا کرایہ ادا کر

دوں گا۔"

ہوٹل کے کلرک نے کہا۔

"کوئی بات نہیں صاحب۔ آپ ضرور اپنی بیگم صاحبہ کی خیر گیری کو جائیے۔ آپ کا کمرہ بالکل محفوظ رہے گا۔ صرف آپ کے ہفتے کی ایک چابی ہمارے پاس رہے گی۔"

میں نے کہا "بے شک آپ چابی اپنے پاس رکھئے گا۔"

میں تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں آیا۔ تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ اپنے سب پرانے کپڑوں اور پروین کے کپڑوں کو اچھی طرح تہہ کر کے الماری میں بند کیا۔ پروین کے پانچ ہزار روپے بھی میرے پیسوں کے ساتھ ہی میرے پاس پڑے تھے۔ ان میں سے ابھی تک بمشکل تین چار سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ اتنی رقم میں اپنے ساتھ ساتھ لے کر نہیں پھر سکتا تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ رقم میں ہوٹل کے منیجر کے پاس جمع کرا دیتا ہوں۔ اس طرح رقم محفوظ رہے گی۔ چنانچہ میں نیچے آ گیا۔ کاؤنٹر کلرک کو مزید ایک ہفتے کا کرایہ ادا کیا۔ تین چار سو روپے اپنے پاس رکھ لئے اور باقی نو ہزار روپے کے نوٹ جیب میں ڈال کر ہوٹل کے بڑے منیجر کے کمرے میں گیا۔ اسے ساری بات بیان کی کہ میری بیوی بیمار ہے۔ میں اس کی تیمارداری کے لئے فیروز آباد جا رہا ہوں۔ میری یہ رقم اپنے پاس بطور امانت رکھ لیجئے۔ اور میں نے نو ہزار روپے کے نوٹ نکال کر منیجر کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔ منیجر ادھیڑ عمر کا شریفانہ چہرے والا آدمی تھا۔ اس نے سارے نوٹ گنے۔ انہیں ایک لفافے میں ڈال کر میرے سامنے سربمہر کیا۔ سامنے والی لوہے کی الماری کھول کر اس کے دراز میں رکھا۔ اور مجھے نو ہزار روپے کی رسید لکھ کر دے دی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں ہوٹل سے نکل کر ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ فیروز آباد جانے والی گاڑی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد ملے گی۔ میں وہیں سٹیشن کے ریفرشمنٹ روم میں بیٹھ کر چائے وغیرہ پینے لگا۔ فیروز آباد کا ٹکٹ میں نے لے لیا تھا۔ گاڑی آئی تو میں اس میں سوار ہو کر فیروز آباد پہنچ گیا۔ اس زمانے میں

Prepared By: S.Sohail Hussain

یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ شہر میں جانے کی بجائے میں گاڑی سے اترنے کے بعد ریلوے
سٹیشن کے پیچھے آ گیا۔ پروین نے مجھے خواب میں بتایا تھا کہ سٹیشن کے آس پاس ہی
انگریزوں کے زمانے کا بنایا ہوا کوئی مردہ خانہ ہے جو اب ویران پڑا ہے وہاں میری اصل
چھپائی گئی ہے۔ سٹیشن کے پیچھے کھوکھا نما دکانیں تھیں۔ میں ایک دکاندار کے پاس گیا
میں نے اس سے پوچھا۔

"بھائی صاحب یہاں صادق علی صاحب کا مکان کہاں ہو گا؟"

دکاندار کہنے لگا "بھائی صاحب! ان کا کوئی اتا پتا بھی تو معلوم ہو۔ خالی مکان کا
پوچھنے سے کیا پتہ چلے گا؟"

میں نے کہا "انہوں نے کہا تھا کہ میرا مکان انگریزوں کے پرانے مردہ گھر کے
کہیں قریب ہی ہے۔"

دکاندار بولا۔

"تو بھائی صاحب! انگریزوں کا پرانا مردہ خانہ یہاں سے پیچھے نالہ پار کر کے تو ہے
آپ کہو وہاں جا کر معلوم کر لیں۔"

مجھے یہی معلوم کرنا تھا کہ پرانا مردہ خانہ کس طرف ہے۔ اگر میں صرف مردہ خانے
کا ہی پوچھتا تو دکاندار کو ضرور تشویش ہوتی کہ یہ شخص مردہ خانے کیا لینے جا رہا ہے۔
میں نے دکاندار کا شکریہ ادا کیا اور کھوکھوں کی دکانوں کے پیچھے کی طرف چل پڑا۔ پیچھے
کچھ دور چلنے کے بعد ایک گندا نالہ آ گیا۔ نالے کا پل پار کر کے ایک اجاڑ سے میدان
میں پہنچا تو دور ایک کوٹھڑی سا نظر پڑا۔ قریب پہنچ کر دیکھا کہ ایک بوسیدہ سا کمرہ ہے جس
کی دیواریں قلعہ ہو رہی ہیں۔ برآمدے کی آدھی چھت اڑ چکی ہے۔ برآمدے میں
ایک جگہ مٹی کھود کر ایک کتا سو رہا تھا میرے قدموں کی آہٹ پر کتے نے سر اٹھا کر
مجھے دیکھا اور اٹھ کر دوسری طرف بھاگ گیا۔ میں برآمدے میں آ گیا۔ مردہ خانے کا
گرد آلود دروازہ بند تھا۔ باہر تالا بھی لگا ہوا تھا۔ تالا دروازے کی بوسیدگی کے مقابلے
میں نیا لگ رہا تھا۔ صرف معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے دو تین روز پہلے ہی لگایا ہے۔ میں

نے قریب پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھا کر زور سے تالے پر ماری۔ تالا تو نہ ٹوٹا مگر اس کا
کنڈا ٹوٹ گیا۔ دروازہ کھول کر مردہ خانے میں داخل ہوا۔ فرش گرد آلود تھا۔ درمیان
میں ایک لوہے کا سٹریچر پڑا تھا جس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔ سٹریچر پر بھی گرد کی تہہ
جمی ہوئی تھی۔ پروین نے کہا تھا کہ یہاں نیچے تہہ خانے میں میرا جسم چھپایا ہوا ہے۔
میں جھک کر فرش کو غور سے دیکھنے لگا۔

کونے میں ایک جگہ مجھے کچھ اینٹیں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے انہیں ایک
ایک کر کے پرے ہٹایا تو دیکھا۔ نیچے ایک گرد آلود بوریا بچھا ہوا تھا۔ بوریا ہٹایا تو نیچے
لکڑی کا چوکھٹا دکھائی دیا۔ یہ کوئی چار فٹ لمبا اور پانچ فٹ کے قریب چوڑا چوکھٹا تھا۔
اس کے ساتھ کنڈا لگا ہوا تھا۔ میں نے کنڈے کو پکڑ کر چوکھٹے کو زور لگا کر اوپر اٹھا دیا۔
نیچے لوہے کا زینہ تھا۔ میں نے چوکھٹے کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ دروازے کو بند کیا اور
ماچس جلا کر تہہ خانے کا زینہ اترنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں اترنے کے بعد ماچس کی
تیلی بجھ گئی۔ میں نے دوسری تیلی جلائی اس کی روشنی میں سامنے دیوار کے پاس فرش پر
ایک انسانی جسم پڑا دیکھا جس پر ترپال پڑی ہوئی تھی۔ پروین نے کہا تھا کہ جرائم پیشہ
لوگوں نے وہاں میرا نیم مردہ جسم ڈال کر اوپر ترپال ڈالی ہوئی ہے۔ میں اس کی طرف
بڑھا۔ ماچس کی تیسری تیلی جلا کر ترپال کو ہٹایا تو نیچے پروین کا چہرہ دکھائی دیا۔ میری
آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے
اپنے جذبات پر قابو پایا۔ پروین کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے
دیکھ رہی ہے مگر بول نہیں سکتی۔ ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتی۔ مگر میری آواز ضرور سن رہی
ہو گی۔ میں نے کہا۔

"پروین! تم جس قدر بھی سن سکتی ہو جس قدر بھی دیکھ سکتی ہو۔ تم ضرور مجھے
دیکھ رہی ہو گی۔ میری آواز سن رہی ہو گی میں تمہارے پاس پہنچ گیا ہوں۔ اب تمہیں
فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ میں رات کو
آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

میں نے پروین کے چہرے پر دوبارہ ترپال ڈال دی۔ تہہ خانے سے باہر آ کر اسی طرح اسے بند کیا۔ اوپر اینٹیں رکھیں۔ پھر مردہ خانے سے باہر آ کر دروازے کا کنڈا اس طرح پھنسا دیا کہ معلوم ہو تالا لگا ہوا ہے۔

اب اس لینڈ لارڈ کا سب سے مشکل مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ یعنی مجھے وہاں سے پروین کی لاش کو نکال کر اپنے ساتھ آگرے لے جانا تھا۔ میں کچھ دیر تک اس ویران مردہ خانے کے شکستہ برآمدے میں کھڑا سوچتا رہا۔ آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ میں وہاں سے فیروز آباد شہر کی طرف چل پڑا۔ پروین نے مجھے خواب میں بتایا تھا کہ اس شہر میں بھی ایک ہسپتال ہے۔ شہر میں آ کر میں نے ہسپتال کا پتہ معلوم کیا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ چھوٹا سا سرکاری ہسپتال تھا۔ میں خاموشی سے واپس ہوا اور ٹیکسی تلاش کرنے لگا۔ مگر وہاں ٹیکسیاں نہیں چلتی تھیں۔ ٹیکسی کے بغیر میں پروین کے نیم مردہ جسم کو مردہ خانے سے نکال کر نہیں لا سکتا تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ ابھی سارا دن پڑا ہے اور آگرہ فیروز آباد سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ مجھے آگرے جا کر وہاں سے ایک ٹیکسی لے کر یہاں آنا چاہیے۔ اس وقت کوئی ریل گاڑی آگرے کی طرف جانے والی نہ ملی تو میں ایک لاری میں بیٹھ کر آگرے پہنچ گیا۔ وہاں شہر کے بڑے ٹیکسی سٹینڈ پر آ کر ایک ٹیکسی والے سے بات کی۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور کافی عمر کا تھا۔ سفری داڑھی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میری بیوی فیروز آباد کے ہسپتال میں بیمار پڑی تھی۔ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی میت آگرے لانی ہے۔ یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ ہم پنجاب سے تاج محل دیکھنے آگرہ آئے تھے۔ میری بیوی نے کہا کہ فیروز آباد بھی دیکھنا ہے۔ میں اسے وہاں لے کر گیا تو اس کی پیٹ میں اچانک شدید درد اٹھا۔ میں نے اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ ہسپتال والوں نے کہا کہ آپریشن کرنا پڑے گا۔ انہوں نے آپریشن کیا لیکن میری بیوی وفات پا گئی۔ فیروز آباد سے پریشان حال یہاں آیا ہوں۔ کیونکہ فیروز آباد میں کوئی ٹیکسی وغیرہ نہیں تھی۔ ہسپتال والوں نے لاش مردہ خانے میں رکھ دی ہے۔ تم جتنے پیسے کہو گے میں تمہیں دے دوں گا۔

مسلمان بوڑھے ڈرائیور نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بابو جی۔ چلتے ہیں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

کوئی ایک گھنٹے میں ہم فیروز آباد پہنچ گئے۔ میں نے ٹیکسی پرانے مردہ خانے کے باہر رکوائی۔ ڈرائیور کو باہر کھڑا کر کے خود مردہ خانے میں گیا۔ تہہ خانے سے پروین کی نیم مردہ لاش کو کاندھے پر اٹھا کر باہر لایا۔ اسے ٹیکسی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا اور ڈرائیور سے کہا۔

"اب آگرہ لے چلو میاں۔"

ڈرائیور بولا۔

"بابو جی آپ اپنی بیوی کی میت کو پنجاب اپنے شہر میں کیوں نہیں لے جاتے؟"

میں نے کہا۔

"ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ میت کی حالت ٹھیک نہیں یہ بڑی جلدی خراب ہو جائے گی۔ اسے فوراً دفن کر دو۔"

ٹیکسی آگرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں پروین کے جسم کو سیدھا ہوٹل بھی نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ راستے میں میں نے مسلمان ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ چونکہ آگرہ میں ہمارا کوئی واقف کار نہیں ہے اس لئے میت کو سیدھا قبرستان لے چلے۔ وہ کہنے لگا۔

"بابو جی! آپ کو ہسپتال سے پرچی بنوا کر لانی چاہیے تھی۔ کیا آپ پرچی لائے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میاں جی! پرچی تو میں نے نہیں بنوائی۔ کچھ آپ ہی میری مدد کیجئے گا۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ بیوی بھی وفات پا گئی ہے۔ پنجاب لے کر گیا تو راستے میں میت کے خراب ہو جانے کا خطرہ ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس امانت کو جتنی جلدی ہو سکے آگرہ کے کسی قبرستان میں ہی دفن کر دوں۔"

ٹیکسی ڈرائیور کہنے لگا۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

"بھئی! شہر کے قبرستان میں تو گورکن لاوارث کو دفن نہیں کریں گے۔ آپ ایسا کریں۔ تاج محل کے پیچھے ایک قبرستان ہے۔ وہاں چونکہ دریا کا پانی مار کرنے لگا ہے اس لئے وہاں اب کوئی اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتا۔ ہم وہاں قبر کھود کر میت کو سپرد خاک کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ ہو سکتا ہے۔"

میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اپنی مرضی کی قبر بناؤں اور قبر ایسی جگہ پر بنے کہ یہاں کسی کا آنا جانا بھی نہ ہو۔ بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ اس شہر میں داخل ہوئے تو بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی ایک الگ تھلگ جگہ پر کھڑی کر دی۔ میں نے اسے سو روپے دیئے۔ وہ بازار سے کفن دفن کا مختصر سا سامان لے آیا۔ میں نے ٹیکسی میں ہی پروین کے نیم مردہ جسم کو ٹاٹ کی چادر میں لپیٹ دیا۔ اس کے بعد ٹیکسی ڈرائیور تاج محل کے عقب میں دریا کے کنارے ایک ویران جگہ پر لے آیا۔ یہاں ایک پرانا تالاب تھا جو نہ جانے کب سے خشک پڑا تھا۔ اس میں تھوڑے پودے اگے ہوئے تھے۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کسی پرانی عمارت کے کھنڈر کی صرف ایک محرابی دیوار ہی باقی رہ گئی تھی جو ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ دیوار کی دوسری طرف دریا کا پانی دلدل کی شکل میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں دس بارہ قبریں شکستہ حالت میں باقی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

"ان قبروں پر بھی دیا جلانے والے نہیں آتے معلوم ہوتا ہے ان کے لواحقین بھی یا تو خود مر کھپ گئے ہیں یا کسی دوسرے شہر جا چکے ہیں۔"

ایک جگہ مجھے نشیب میں کسی پرانی قبر کا لحد شگاف نظر آیا۔ یہ شگاف زمین کے اندر لحد کی صورت میں تھا مجھے یہ جگہ پسند آ گئی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"یہ کہیں ایک ہی بغلی قبر بن گئی ہے میں یہاں اپنی بیوی کو دفن کر دیتا ہوں۔"

میں نے پروین کے نیم مردہ جسم کو ٹیکسی میں سے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور پرانی قبر کے پاس لے آیا۔ اس دوران ٹیک دل ٹیکسی ڈرائیور نے نشیب کی جگہ کو خوب صاف کر دیا ہوا تھا۔ میں نے "لاش" کو لحدی لحد کے اندر لٹا دیا۔ اس کے بعد ہم

نے ادھر ادھر سے اینٹیں اور پتھر اکٹھے کئے اور لحد کے شگاف پر لگا کر اسے بند کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کچھ جھاڑیاں توڑ کر لے آیا۔ انہوں پر ہم نے جھاڑیاں ڈال دیں۔ اب وہ قبر باہر سے کسی کو نظر نہیں آتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ فاتحہ تو نہ پڑھ سکا۔ بس خدا سے یہی التجا کی کہ یا اللہ تو مجھے معاف کر دے۔ فاتحہ پڑھ کر ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

"بھئی! آپ اس قبر کو پاٹ ضرور کروا لیں رات کو یہاں مردار خور جانور دریا پار کر کے آ جاتے ہیں۔ کہیں وہ اینٹیں اکھیڑ کر میت کو خراب نہ کر دیں۔"

میں نے کہا۔ "اب تو میں واپس جا رہا ہوں۔ ایک ہفتے بعد آؤں گا تو قبر کو ضرور پاٹ کروا دوں گا۔"

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دو سو روپے دیئے۔ وہ بہت خوش ہو گیا اور مجھے میرے ہوٹل چھوڑ کر چلا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔ پروین نے کہا تھا کہ جب میں اس کی لاش کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں تو وہ مجھے بتائے گی کہ اس کی روح واپس اس کے جسم میں کیسے داخل ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے مجھے خواب میں آ کر بتانے کے لئے کہا تھا یا نہیں۔ جو کچھ بھی تھا میں اس کے نیم مردہ جسم کو زیادہ دیر تک ویران قبرستان کی قبر میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ دریا پار سے مردار خور وغیرہ آ کر اس کو چیر پھاڑ نہ دیں۔ پروین اگرچہ مردہ حالت میں نہیں تھی۔ لیکن وہ اٹھ کر درندوں کو بھگا بھی نہیں سکتی تھی۔ میں شام ہوتے ہی ویران قبرستان چلا گیا۔ پرانی قبر کی جھاڑیاں اور اینٹیں ہٹا کر دیکھا۔ پروین کی لاش کفن میں لپٹی محفوظ پڑی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"پروین! میں نے تمہیں اپنے پاس محفوظ کر کے رکھ لیا ہے۔ اب مجھے خواب میں آ کر بتاؤ کہ تمہاری روح کس طرح تمہارے جسم میں واپس آئے گی؟ تم مجھے جو کہو گی میں اسی طرح کروں گا۔"

Prepared By: S.Sohail Hussain

اس کے بعد میں نے قبر کو اچھی طرح سے بند کر کے جھاڑیوں میں چھپا دیا اور ہوٹل میں آ کر منہ ہاتھ دھو کر بچے کھلا کھانے چلا گیا۔ رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ یہی خیال آتا کہ خدا جانے پروین نے میری بات سنی بھی ہے یا نہیں۔ وہ خواب میں آئے گی یا نہیں۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دریا بہہ رہا ہے۔ کنارے پر ایک گنبد والی بارہ دری ہے۔ بارہ دری میں ایک چاندی کی چوکی پر سرخ لباس پہنے پروین بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ مجھے پاس بلایا۔ کہنے لگی۔

"خدا نے میرے گناہوں کو بخش دیا ہے۔ اس لئے کہ میں نے سچے دل سے گناہوں سے توبہ کی تھی۔ انسان اگر سچے دل سے توبہ کرے اور آئندہ گناہ نہ کرے تو خدا اسے معاف کر دیتا ہے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے اب تم واپس اپنے جسم میں داخل ہو سکتی ہو۔ کیونکہ تم پوری طرح مری نہیں تھیں۔ تمہارے جسم کے ساتھ روح رشتہ قائم تھا۔"

وہ بولی۔ "ہاں — اب خدا کی طرف سے اپنے جسم میں واپس جانے کی اجازت ہے۔ مگر اس کے لئے تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔"

میں پروین کی طرف دیکھنے لگا۔

"کہو۔ مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

پروین نے کہا۔

"گیارہ دیگیں میٹھے چاولوں کی پکوا کر غریبوں کو کھلاؤ۔ اس کے بعد میری قبر پر جانا مگر رات کے وقت آنا۔ جب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہو۔"

میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔

میں دوسرے دن شہر کی سب سے بڑی مسجد کے امام صاحب کے پاس گیا۔ انہیں جا کر کہا کہ میں گیارہ دیگیں میٹھے چاولوں کی پکوا کر غریبوں محتاجوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا۔

"ضرور پکوائیں۔ ہم اعلان کروا دیں گے محتاج اور غریب لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے امام صاحب کے تعاون سے گیارہ دیگیں دم کروا دیں۔ شام تک دیگیں تیار ہو گئیں۔ کتنے ہی محتاج اور غریب غربا وہاں جمع ہو گئے۔ ساری دیگوں کے چاول ان میں بانٹ دیئے گئے۔ میں نے مسجد کے دروازے کی مرمت کے لئے بھی امام صاحب کو ایک ہزار روپے بطور نذرانے کے دیئے۔ میرے پاس ابھی تک کافی رقم موجود تھی۔ جب رات ہو گئی تو میں سیدھا پرانے قبرستان پہنچ گیا۔ اس وقت چاند غروب ہو رہا تھا اور اس کی مدھم چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ پرانی قبر کے پاس گیا تو یہ دیکھ

Prepared By: S.Sohail Hussain

کہ میرے اوسان خطا ہو گئے کہ قبر کی اینٹیں ادھر ادھر پڑی تھیں اور لحد خالی تھی۔ پروین کا جسم وہاں نہیں تھا۔ دل بیٹھنے لگا۔ یا اللہ یہ کیا مصیبت آن پڑی ہے۔ پروین کو کون اٹھا کر لے گیا ہے ضرور یہ ان جرائم پیشہ پیشہ ور لوگوں کا کام ہے۔ مگر اب میں انہیں کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ وہ تو پروین کا نیم مردہ جسم اٹھا کر نہ جانے کہاں لے گئے ہوں گے۔

سخت پریشانی کے عالم میں وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے میرا نام لے کر مجھے آواز دی۔ یہ پروین کی آواز تھی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ پیلی چاندنی میں شلوار قمیض میں ملبوس کفن کی چادر سر پر ڈالے مجھ سے چھ سات قدم کے فاصلے پر پروین کھڑی تھی۔ کچھ نہ پوچھیں کہ خوشی سے میرا کیا حال ہوا۔ میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے میرے ہاتھوں کو وہیں روک لیا۔ کہنے لگی۔

"خوشی کا اظہار صرف جائز حد تک ہو تو اچھا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پروین! تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ تمہیں پھر سے زندہ حالت میں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔"

پروین مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"چلو اب ہوٹل والوں چلتے ہیں۔ تم نے ہوٹل والوں کو کیسے یہ تو نہیں کہا کہ میں مر چکی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ میں نے انہیں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ تم بیہوش ہو گئی ہو گی کہ وہاں بیمار پڑ گئیں۔"

ہم وہاں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ رات کے وقت وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی ٹیکسی رکشا نہیں تھا۔ ہم پیدل ہی چل پڑے۔ شہر کے قریب پہنچ کر ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس میں بیٹھ کر ہم ہوٹل میں آ گئے۔ پروین نے آتے ہی سب سے پہلے غسل کیا۔ صاف کپڑے پہنے اور اپنے بستر میں بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے بھوک بالکل نہیں ہے۔ لیکن کافی پینے کو بہت جی چاہتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس وقت شاید ہی ہوٹل کی طرف سے کافی سپلائی ہو مگر میں کوشش کرتا ہوں۔ نہیں تو میں خود نیچے جا کر بنوا لاؤں گا۔"

میں نے اوپر سے فون کر کے کہا کہ میری بیوی کے سر میں شدید درد ہے۔ اگر آپ کافی بنا کر اوپر بھجوا دیں تو بہت شکر گزار ہوں گا۔ فون پر سروس کلرک نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں ابھی کافی بھجوائے دیتا ہوں۔"

میں اور پروین باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں ملازم کافی لے کر آ گیا۔ یہ وہ آدھی کی کافی تھی۔ میں نے پروین کو کافی بنا کر دی۔ ایک پیالی اپنے لئے بنائی۔ پروین نے کافی کا نیم گرم گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔

"کافی نے میری روح کی پاتال کو تازہ کر دیا ہے ایک لمحے کے لئے غور کرو کہ کہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا اور کہاں پہنچ گئے ہیں۔ کیسے کیسے خطرناک حالات سے نہیں گزرے۔ کیسی کیسی تکلیفیں اور اذیتیں ہم نے برداشت نہیں کیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرا انجام بخیر ہوا ہے۔ اور میں ایک مسلمان عورت کی حیثیت سے کلمہ پڑھ کر جان دوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تو تمہاری بہت عمر پڑی ہے ابھی تم ایسی باتیں نہ کرو۔"

پروین نے کافی کی پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں سمجھ سکو گے۔ یقین کرو میں عالم برزخ میں نہیں تھی کیونکہ میری مکمل موت واقع نہیں ہوئی تھی میں اس کرہ فلک کا نام نہیں جانتی۔ میں اسے چھوٹا عالم برزخ ہی کہوں گی۔ میں کہہ رہی تھی کہ جب سے میں نے اس چھوٹے عالم برزخ کی جھلک دیکھی ہے اور وہاں کچھ وقت گزارا ہے اس دنیا میں اب میرا جی نہیں لگتا۔ اگر انسان اس دنیا میں رہ کر برائی سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔ خدا کی یاد اپنے دل میں ہر وقت رکھے اور نیک کام کرے تو یقین کرو اوپر کی دنیا اور اس دنیا کی زندگی میں نیک

Prepared By: S.Sohail Hussain

انسانوں کو خوشیاں اور لذتیں خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہیں اس دنیا کی لذتیں اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میں یہ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں اوپر کی دنیا کی ایک جھلک دیکھ آئی ہوں۔"

میں پروین کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ خواب میں ہی سہی، لیکن اس عالم بالا کی ایک ہلکی سی جھلک میں نے بھی دیکھ لی تھی۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کبھی کوئی برا کام نہیں کروں گا اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھوں گا۔ کافی رات ہو گئی تو پروین نے کہا۔

"اب مجھے نیند آ رہی ہے۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔"

میں اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ دیر تک بستر پر لیٹا گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرتا رہا۔ پھر مجھے بھی نیند آ گئی۔ دوسرے روز پروین نے کلکتے جانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

میں سب سے پہلے کلکتے میں اپنے مکان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ ان گلیوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں کھیل کود کر میں بڑی ہوئی۔ اس کے بعد میں کالکا بازار کے جنگل میں سنتالی ہندوؤں کے لڑکے پر جا کر اس جھوٹے ناگ دیوتا کے مندر کو آگ لگانا چاہتی ہوں جہاں مجھے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔"

میں نے پروین کے پروگرام پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ یہ اس کی جذباتی خواہشات تھیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک سوچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"میں جھوٹے ناگ دیوتا کے مندر کو جلا کر کے اس برائی کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتی ہوں جہاں معصوم لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کی زندگیاں برباد کی جاتی ہیں۔"

میں نے ہوٹل ہی سے ریلوے انکوائری کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ کلکتے جانے والی گاڑی ہمیں کان پور سے ملے گی۔ ہمیں پہلے آگرہ سے کان پور جانا ہو گا۔ میں نے آگرے سے کان پور تک سیکنڈ کلاس میں دو سیٹیں بک کروا لیں۔ ہمارے پاس روپیہ پیسہ آ گیا تھا تو سامان بھی نمودار ہو گیا۔ یعنی میرے اور پروین کے نئے جوڑے وغیرہ۔

اس کے لئے ہمیں ایک اٹیچی کیس خریدنا پڑا۔ ہوٹل کا حساب وغیرہ صاف کر کے ہم اٹیچی کیس لے کر ٹیکسی میں سوار ہوئے اور آگرہ کے ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ کلکتے جانے والی گاڑی ہمیں دوپہر کے بعد ملی۔ اس گاڑی نے ہمیں رات کے پچھلے پہر کان پور پہنچایا۔ کلکتہ میل وہاں سے صبح روانہ ہوئی۔ سارا دن اور ساری رات سفر میں رہے۔ اگلے دن صبح گاڑی کلکتے کے دوسرے بڑے سٹیشن ہاوڑہ پہنچ گئی۔

پروین نے اپنا اٹیچی کیس سٹیشن کے لاکر روم میں رکھوا دیا۔ وہاں سے ہم پروین کے محلے میں آ گئے۔ پروین کے ماں باپ تو مدت ہوئی اپنا مکان چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف جا چکے تھے۔ ان کے مکان میں کوئی اور بنگالی فیملی رہ رہی تھی۔ محلے کی عورتوں نے پروین کو پہچان لیا۔ وہ اسے مسلمانوں والے لباس شلوار قمیض میں دیکھ کر بڑی حیران ہوئیں۔ ایک بوڑھی بنگالی عورت نے اس سے پوچھا۔

"پاروتی! تم نے ساڑھی کیوں نہیں پہنی ہوئی؟"

پروین نے کہا۔

"دیدی! میں اب پاروتی نہیں ہوں۔ میرا نام پروین ہے۔ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔"

یہ سن کر عورتیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ پھر وہ اپنے اپنے گھروں میں چلی گئیں۔ کسی نے پروین سے کوئی بات نہ کی۔ پروین نے مجھے کہا۔

"تم نے دیکھ لیا کہ ہندو لوگ مسلمانوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔ جب تک ان عورتوں کو میرے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا مجھ سے بڑی گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ جیسے ہی انہیں پتہ چلا کہ میں مسلمان ہو گئی ہوں تو مجھ سے اس طرح دور ہو گئیں جس طرح لوگ کوڑھیوں سے دور بھاگتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مجھے بھی بہت تجربہ ہو چکا ہے۔ ہندوؤں میں اچھے لوگ بھی ہیں۔ مگر وہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ ہندوؤں کی اکثریت یہاں کے مسلمانوں سے نفرت کرتی ہے۔ ان کے اسی نفرت کے رویے کی وجہ سے مسلمانوں کو

Prepared By: S.Sohail Hussain

ایک ملک پاکستان بنا پڑا۔"

ہم باتیں کرتے گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ یہ بنگالی ہندوؤں کا محلہ تھا۔ ہم اپنے لباس سے صاف پہچانے جاتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ بنگالی ہندو ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ ہم بڑے بازار میں آ گئے۔ یہاں ہم ایک ریستوران میں کافی پینے بیٹھ گئے۔

میں نے پروین سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم اپنا اپنا کیس ریلوے سٹیشن کے لاکر روم میں ہی رہنے دیتے ہیں۔ اور ان کپڑوں میں ہی کاکسز بازار کے جنگل والے سنتالوں کے جھونپڑے مندر میں چلتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

پروین نے کہا۔

"ایسا ہی کریں گے۔ مگر ہم کل صبح صبح یہاں سے چلیں گے۔ آج کا دن اور رات ہم آرام کرتے ہیں۔"

"تو پھر ہمیں کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑے گا۔"

"ٹھہر جائیں گے۔ ہمارے پاس پیسے موجود ہیں ضرورت پڑی تو سانپ کے ذریعے کسی اور مدفون خزانے میں سے کوئی ہیرا موتی منگوا لیں گے۔" پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔

"تو پھر ہم سٹیشن سے اٹیچی کیس نکلوا لیں گے۔"

ہم نے ایسا ہی کیا۔ کافی پینے کے بعد ہم ریستوران سے نکل کر سٹیشن پر گئے۔ وہاں سے اٹیچی کیس نکلوایا اور سٹیشن کے قریب ہی ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ڈبل بیڈ والا کمرہ لے لیا۔ رات آرام کیا۔ دوسرے روز صبح صبح ہم کاکسز بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سارا علاقہ ہمارا دیکھا بھالا اور جانا پہچانا تھا۔ آگے سنتال کے ہیروں کے جنگل کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا مگر پروین ایک ایک جھاڑی ایک

ایک درخت سے واقف تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ ہم جنگل میں پیدل ہی چلے جا رہے تھے۔ جنگلوں میں کئی کئی میل تک پیدل چلنا ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی ہم گھنٹہ آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کر لیتے تھے۔ ہم نے کھانے پینے کی چیزیں ساتھ رکھ لی تھیں۔ میرے بھرے سے پانی سے بھری ہوئی تھرمس لٹک رہی تھی۔ تھیلے میں کچھ برگر قسم کی خوراک تھی۔ شام کے وقت ہم جنگل میں ایک جگہ کچھ کھانے پینے کے لئے بیٹھے تو پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے۔ کبھی مجھے بھوک لگتی تھی تو میں تمہیں جنگل میں چھوڑ کر سانپ کی تلاش میں نکل جاتی تھی۔"

اس نے ایک ہاتھ کان سے لگا کر توبہ توبہ کہا اور بولی۔

"لگتا ہے وہ میری جنگلی زندگی کا زمانہ تھا۔ اب میں تہذیب کی روشنی میں آ گئی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی۔ اب مجھے سانپ دیکھ کر ایک سیکنڈ کے لئے بھی خیال نہیں آتا کہ اس سے اپنے آپ کو ڈسوا دوں۔ یا اس کو کھا جاؤں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔"

جب شام کا اندھیرا تھوڑا گہرا ہو گیا تو پروین نے جنگل کے سامنے والے درختوں کی طرف غور سے دیکھا۔

"ان درختوں کے پیچھے ایک ٹیلہ ہے۔ اس ٹیلے کے دامن میں جھولے ناگ دیوتا کا مندر ہے جہاں سنتالی سپیروں کا اڈہ ہے۔ یہ سارے کے سارے بردہ فروش اور بدکار آدمی ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتی۔ خدا کرے کہ یہ سارے بدمعاش ڈیرے پر موجود ہوں۔"

درختوں سے نکلنے کے بعد جب ہم سامنے والے ٹیلے کی طرف بڑھے تو پروین رک گئی۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے پروین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اس شیرنی کی آنکھوں کی چمک دکھائی دی جس نے اپنے شکار کی بو سونگھ لی

Prepared By: S.Sohail Hussain

ہے۔ اس وقت مجھے پروین پہلے والی پاگل لگی معلوم ہوئی۔ وہ سامنے والے ٹیلے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ہم سنتالی سپیروں کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں۔ آگے اونچی آواز میں بات نہ کرنا۔ کھانسنا بھی نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے دبے پاؤں چلتے آؤ۔"

وہ میرے آگے آگے جھاڑیوں میں چل پڑی۔ اس نے اپنا دوپٹہ سر کے گرد باندھ لیا تھا کیونکہ بکھرے پڑے پڑے وہ جھاڑیوں میں الجھ رہا تھا۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ یہ سنتالی کے بدمعاش سپیروں کا کس طرح مقابلہ کرے گی۔ نہ اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا نہ میرے پاس ہی کوئی ہتھیار تھا۔ نکلنے سے پہلے وقت میں نے اسے کہا تھا کہ ہم کوئی خنجر خرید کر ساتھ رکھ لیتے ہیں جس پر پروین نے جواب دیا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں کی آنکھیں جنگلوں کے اندھیرے کی عادی تھیں۔ ہم نے نہ جانے کتنی تاریک راتیں ان جنگلوں کی دربدری میں گزار دی تھیں۔ ہم ٹیلے کے نشیب میں پہنچ گئے تھے۔ درخت اتنے ساتھ ساتھ کھڑے تھے کہ انہوں نے ایک دیوار بنا دی تھی۔

ایک بہت بڑے درخت کے پاس جا کر پروین رک گئی۔ اندھیرے میں مجھے اس کا سایہ لہرا کر صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اور ہاتھ سے مجھے بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا۔ درخت کا تنا بہت بڑے ستون کی طرح تھا۔ بیٹھتے ہی مجھے درخت کے پیچھے کچھ فاصلے پر روشنی جھلملاتی نظر پڑی۔ پروین نے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔

"یہی ناگ دیوتا کا استھان ہے۔ ہمیں رینگ کر وہاں جانا ہو گا۔"

ہم گھاس اور جھاڑیوں میں احتیاط سے رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ روشنی قریب ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ مٹی کے تیل کا ایک بڑا لیمپ ہے جو درخت کے تنے میں بنے ہوئے ناگ دیوتا کے بت کے آگے جل رہا ہے۔ اس کے ارد گرد کچھ آدمی زمین پر لیٹے گہری نیند سو رہے تھے۔ پروین نے منہ میرے قریب لا کر سرگوشی کی۔

"یہ سنتالی بدمعاش مداری سو رہے ہیں۔ میں انہیں جہنم کی آگ میں دھکیلنے جا رہی ہوں۔"

پروین نے اتنا کہہ کر دو تین گہری سانسیں لیں۔ دوسرے لمحے وہ سانپ بن گئی۔ یہ وہی نیلا سانپ تھا جس کے گلے میں روپاں میں ڈال کر کیلاش پربت نے کہا تھا۔ سانپ نے پھن کھول کر میری طرف ایک نگاہ ڈالی گویا کہہ رہا ہو کہ تم اسی جگہ لیٹے رہو۔ نیلا سانپ اندھیرے میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اپنی نگاہیں مٹی کے تیل کے لیمپ کے آس پاس جما دیں۔ جہاں سنتالی سپیرے گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے انہیں گنا وہ کل پانچ تھے۔ جنگل میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

یہ سناٹا نیلے سانپ کے جانے کے بعد مجھے زیادہ خوفناک اور پراسرار ہوتا محسوس ہوا۔ پھر اچانک سویا ہوا ایک سپیرا اپنا آدھا دھڑ اوپر اٹھا کر بیٹھ گیا۔ اس کا منہ ایسے کھل گیا جیسے کچھ کہنے یا چلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ بے جان ہو کر پیچھے کو گر پڑا۔ اسی طرح دوسرا سپیرا بھی اٹھا اور کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہوئے وہیں لڑھک گیا۔ عجیب بات تھی کہ سویا ہوا سپیرا اٹھ کر بیٹھتا۔ منہ کھولتا۔ اس کی آواز نہ آتی اور وہ پیچھے کو پچھاڑ کھا کر گر پڑتا اور پھر ساکت ہو جاتا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پروین سانپ کے روپ میں انہیں کچھ ایسے طریقے سے ڈس رہی ہے کہ سب سے پہلے ان کی آواز بند ہو جاتی تھی اور آدھا دھڑ سرد ہو جاتا تھا۔ بعد میں پروین نے مجھے بتایا کہ ان خطرناک سنتالی سپیروں کو سانپ کے زہر سے مارنا آسان نہیں تھا۔ یہ لوگ سانپ کے ڈستے ہی ایک ایسا منتر پڑھ کر پھونک دیتے تھے کہ نہ صرف ان کے بدن پر سانپ کے زہر کا اثر ختم ہو جاتا تھا بلکہ جس سانپ نے انہیں ڈسا ہوتا تھا وہ بھی جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔ اس لئے پروین انہیں ان کی گردن کی ایک خاص رگ پر ڈس کر زہر داخل کر دیتی کہ سب سے پہلے ان کی آواز بند ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ نچلے دھڑ کو ڈستی اور یوں ایک ایک کر کے پانچوں کے پانچوں بدکردار سپیرے میری آنکھوں کے سامنے اپنا دھڑ اوپر اٹھا اٹھا کر منہ کھول کر بولنے کی ناکام

Prepared By: S.Sohail Hussain

کوشش کرتے کرتے مر گئے۔ جب پانچواں سپیرا بھی سانپ کے زہر سے مر گیا تو پروین اصلی شکل میں چل کر میرے پاس آئی اور بولی۔

"اب ہمیں کسی سے بچنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے تمام سپیروں کو اپنے زہر سے ہلاک کر دیا ہے۔ اب میرے ساتھ آؤ اور ان بدکردار ظالم سپیروں کو جہنم کی آگ میں جلتے دیکھو۔"

ہم آہستہ آہستہ چل کر اس درخت کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے جس کے تنے میں سانپ دیوتا کا بت لگا ہوا تھا اور جس کے سامنے پانچوں سپیروں کی لاشیں پڑی تھیں۔ پروین نے ایک سپیرے کی لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ وہ سپیرا ہے جس نے مجھے کلکتے میرے گھر سے اغوا کیا تھا۔ اب ان کا انجام دیکھو۔"

لیمپ کی روشنی میں مجھے سپیروں کی لاشوں میں سے ہلکے ہلکے بخارات اٹھتے نظر آنے لگے۔ پروین نے کہا۔

"میرے زہر نے ان کے اندر کے دوزخ کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ان کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون جم گیا ہے اور اب اپنے ہی گناہوں کی آگ میں سرخ ہو کر ان کے جسم کو جلانے لگا ہے۔"

پروین نے درخت کے تنے میں نصب ناگ دیوتا کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کل تک میں گناہوں کی دلدل میں اوپی ہوئی تھی اور تجھی پوجا کرتی تھی۔ آج میں سچائی کی روشنی میں ہوں اور تجھے جہنم میں پھینکنے لگی ہوں۔"

یہ کہہ کر پروین نے سانس اندر کو کھینچ کر منہ سے پھنکار کی آواز نکالی۔ میں نے پہلی بار اس کے منہ سے پھنکار کے ساتھ آگ کی چنگاریاں نکلتے ہوئے دیکھیں۔ ان چنگاریوں میں اس قدر تپش اور زبردست آتش گیر مادہ تھا کہ جیسے ہی چنگاریاں درخت پر پڑیں درخت نے آگ پکڑ لی۔ ایک دھماکے کے ساتھ درخت آگ کے شعلوں کا ایک ستون بن گیا اور اس آگ میں جھوٹا ناگ دیوتا بھی جل کر بھسم ہونے لگا۔ دوسری

پھنکار پروین نے پانچوں بدکردار سپیروں کی لاشوں پر پھینکی۔ پھنکار کی چنگاریاں سپیروں کی سبز اور سیاہ ہوتی لاشوں پر گرتیں تو وہ بھی ایک دھماکے سے آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہاں اب آگ ہی آگ تھی۔ شعلے ہی شعلے تھے۔ پروین نے مجھے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے نکل آؤ۔"

ہم وہاں سے وہاں دوڑ پڑے۔ آگ کے شعلے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ واقعی جہنم کی آگ معلوم ہوتی تھی کہ اس کے شعلے بلند سے بلند تر ہو رہے تھے اور جنگل میں چاروں طرف بڑھتے ہوئے سپیروں کے چھوٹے بڑے بتوں اور مندر کو بھسم کرتے جا رہے تھے۔

اردو فینز ڈاٹ کام

Prepared By: S.Sohail Hussain

جنگل کی اندھیری رات میں ہم دونوں کافی دور تک واپس دوڑتے چلے گئے۔ پروین کی چنگاریوں نے ناگ مندر کے ارد گرد لکڑی بھیانک آگ لگا دی تھی کہ اس نے ارد گرد کے سارے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور بے حد تیز چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ اس کے پل پر سے ندی پار کی اور دوسرے کنارے پر تھک کر بیٹھ گئے۔ میں بہت زیادہ تھک گیا تھا جبکہ پروین اتنی زیادہ نہیں تھکی تھی۔ ہم پلٹ کر دور جنگل کی آگ کے شعلوں کو دیکھنے لگے۔ پروین نے کہا۔

"یہ آگ کافروں کے تمام مندروں اور ان کے مکار جھوٹے پجاریوں کو جب تک بھسم نہیں کرے گی، بجھے گی نہیں۔"

آگ کے ابھرتے ہوئے آسمان کی طرف بلند ہوتے شعلوں نے جنگل کی رات کو روشن کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر ہم ندی کے پاس بیٹھے آگ کو دیکھتے رہے۔ پھر جنگل میں اس راستے پر چل پڑے جو ناکسر بازار کے سمندری ساحل کی طرف جاتا تھا۔ رات کا باقی حصہ ہم نے ایک کھاڑی کے پاس گھنے درختوں کے نیچے ایک چٹان کی کھوہ میں بسر کیا۔ دوسرے دن سورج نکلا تو ہم ناکسر بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ پروین بڑی خوش تھی کہ اس نے سنتال کے بدکردار پجاریوں اور ناگ دیوتا کے مکار پجاریوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان سے اپنا بدلہ ہی نہیں چکا دیا بلکہ آئندہ کے لئے برائی کی جڑ کو ہی کاٹ دیا ہے۔

ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ ہم ناکسر بازار پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم واپس نکلتے آ گئے۔ ایک دن اور ایک رات نکلتے کے ہوٹل میں آرام کیا۔ میں نے پروین سے پوچھا کہ اب جبکہ اس نے اپنے ماں باپ کے پرانے گھر کو دیکھ لیا ہے اور سنتال پجاریوں سے اپنے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا انتقام بھی لے لیا ہے تو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں اس نے کیا سوچا ہے۔ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟"

میں نے کہا "یہ تمہاری اپنی زندگی کا معاملہ ہے۔ اپنی زندگی جس طرح اور جہاں چاہو بسر کر سکتی ہو۔"

پروین کی چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ کہنے لگی۔

"میرا ہندوستان میں رہنے کو بالکل جی نہیں چاہتا۔ یہاں قدم قدم پر کفر کا رواج ہے۔ یہ بت پرستوں، توہم پرستوں اور مسلمانوں سے نفرت کرنے والے ہندوؤں کا ملک ہے۔ وہاں ایک خدا ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب کو ماننے والے رہتے ہیں۔ ویسے بھی اب ہندوستان میں اب میرا کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ خدا جانے کہاں غائب ہو چکے ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں ہے۔ یہاں کے ہندوؤں کو جب معلوم ہو گا کہ میں ہندو تھی اور اب مسلمان ہو گئی ہوں تو مجھ سے نفرت کریں گے۔ میرا جینا حرام کر دیں گے۔ مجھے نہ سکون سے زندہ رہنے دیں گے اور نہ چین سے مرنے دیں گے۔

میں نے خوش ہو کر کہا "تم میرے ساتھ پاکستان چلی چلو گی تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ میں وہاں تمہیں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملاؤں گا۔ وہ تمہیں مل کر بڑے خوش ہو جائیں گے۔"

پروین کہنے لگی "میں اگر تمہارے ساتھ پاکستان گئی تو صرف ایک شرط پر جاؤں گی کہ تم نہ تو مجھے اپنے گھر لے کر جاؤ گے اور نہ ہی اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے

Prepared By: S.Sohail Hussain

ملا کے۔

"وہ کون؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

پروین نے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم اس بات کو نہیں سمجھ سکو گے۔ بہرحال میں ابھی اس مسئلے پر تھوڑا اور غور و فکر کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے آج رات سوچ لینے دو۔ کل تمہیں اپنا آخری فیصلہ بتا دوں گی۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اگر میں پاکستان گئی تو نہ تم اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں کچھ بتاؤ گے اور نہ میں ان سے ملاقات کروں گی۔ میں پاکستان کے کسی بھی شہر میں اکیلی رہ لوں گی۔ میں نے ایف ایس سی کی ہوئی ہے۔ میں کسی ہسپتال میں نرس بن کر بیماروں کی خدمت کروں گی اور ہسپتال کے نرسز کوارٹرز میں ہی رہائش اختیار کر لوں گی۔"

میں نے اس بات کو مزید آگے نہ بڑھایا۔ وہ دن اور رات بھی گزر گئے۔ اس کے اگلے دن پروین میرے ساتھ بیٹھ کر رہی تھی۔ بولی۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تمہارے پاکستان ساتھ چلوں گی۔ وہاں کسی شہر میں نرسنگ ٹریننگ کا کورس کروں گی اور باقی زندگی پاکستان میں رہ کر بیماروں کی خدمت کرتے ہوئے گزار دوں گی۔ اب یہی میری زندگی کا نصب العین ہے۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

پروین نے میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے تو خوشی ہوگی کہ میرے وطن پاکستان کو ایک اچھی نرس مل جائے گی۔"

پاکستان کا قیام عمل میں آئے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ دونوں ملکوں یعنی بھارت اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ سرحدوں میں دونوں جانب بلاضروری فورس کا قیام بھی عمل میں آ چکا تھا۔ کوئی آدمی خاص پرمٹ کے بغیر سرحد پار نہیں کر سکتا تھا۔

کلکتے سے مشرقی پاکستان زیادہ قریب تھا۔ پروین کا خیال تھا کہ ہم کلکتے سے مشرقی

پاکستان جائیں گے۔ وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز یا بحری جہاز پاکستان چلے جائیں گے۔ ہم نے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ کلکتے میں ابھی پاکستان کا ہائی کمیشن کا آفس قائم نہیں ہوا۔ ہمیں اس کے لئے دہلی جانا ہوگا۔ جہاں پاکستان کا ہائی کمیشن کام کرنے لگا تھا۔ پروین کہنے لگی۔

"تم پاکستان کے شہری ہو۔ پاکستان کے رہنے والے ہو۔ تمہیں کوئی پرمٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم مغربی بنگال سے بارڈر پار کر کے مشرقی پاکستان میں آسانی سے داخل ہو سکتے ہیں۔ یہاں بارڈر پر ابھی کسی قسم کی سختی نہیں ہے۔ مہاجرین ابھی تک ادھر سے ادھر آ جا رہے ہیں۔ میں بھی مہاجر ہوں اور ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان میں آباد ہونا چاہتی ہوں۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

پروین بنگال کی رہنے والی تھی۔ بنگلہ زبان اس کی مادری زبان تھی۔ مغربی بنگال کے سارے سرحدی علاقے سے وہ واقف تھی۔ چنانچہ ہم نے مشرقی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے پاس انڈین کرنسی تھی۔ ہم نے ہوٹل میں ہی ایک ایجنٹ سے اس کے عوض پاکستانی کرنسی بدلوا لی۔ یہ کل سوا چھ ہزار روپے تھے۔ جو اس وقت اچھی خاصی رقم ہوا کرتی تھی۔ پروین نے کہا۔

"ہم بلی کے مقام سے بارڈر کراس کر کے مشرقی پاکستان میں داخل ہو جائیں گے۔"

اس نے ہوٹل کے بنگالی منیجر سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ہم ٹرین کے ذریعے بلی پہنچے۔ وہاں مسلمان مہاجروں کا ایک چھوٹا سا قافلہ مغربی بنگال سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان جا رہا تھا۔ ہم بھی اس قافلے کے ساتھ ہو گئے۔ بارڈر پر پاکستانی فوج موجود تھی مگر وہ ضروری چیکنگ کے بعد مہاجرین کو جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ ہماری بھی چیکنگ ہوئی۔ میں نے پروین کو اپنی بیوی ظاہر کیا۔ اور اپنے بارے میں بتایا کہ میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ کلکتے میں نوکری کرتا تھا۔ وہیں پروین سے شادی کی۔ اور اب مشرقی پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ ہمارے عارضی پرمٹ بنائے گئے۔ اور ہم مشرقی پاکستان کی سرزمین میں داخل ہو گئے۔

Prepared By: S.Sohail Hussain

بلی سے ہمیں ڈھاکے جانا تھا۔ راستے میں ایک مقام پر دریا کا پل بن رہا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ٹرین سے ایک جگہ اتر کر کشتی میں دوسرے مسافرین کے ساتھ دریا پار کیا۔ دوسری جانب ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ ایک دن اور ایک رات ٹرین میں سفر کرنے کے بعد ہم ڈھاکہ پہنچ گئے۔ ڈھاکہ میں ہم ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ ہم نے اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کیا تھا۔ ہمیں مجبوراً ایک ہی کمرہ لینا پڑا۔ جس میں ڈرائینگ روم اور بیڈ روم ایک ہی کمرے میں تھا۔ میں نے ابھی تک مشرقی پاکستان نہیں دیکھا تھا۔ پروین سکول کے زمانے میں اپنے ماما چاچا کے ساتھ ڈھاکہ آچکی تھی۔ میں نے پروین سے کہا۔

"میں ڈھاکہ شہر کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا کرتے ہیں ہم ہوائی جہاز پر کراچی کے لئے اپنی نشستیں ریزرو کروا دیتے ہیں۔ ہمیں ایک دو دن ضرور مل جائیں گے۔ اس دوران ہم شہر کی سیر کر لیں گے۔"

پروین نے کہا "چلو پہلے ایئرلائنز کے آفس جا کر جہاز میں سیٹیں بک کراتے ہیں۔"

اس زمانے میں پی آئی اے کی جگہ اورینٹ ایئرویز کے جہاز ڈھاکہ سے کراچی جایا کرتے تھے۔ ہم اورینٹ ایئرویز کے آفس گئے جو ڈھاکہ ایئرپورٹ کے پاس ہی تھا۔ ہمیں تین دن بعد کی فلائٹ میں جگہ مل گئی۔ میں بڑا خوش ہوا۔ اس طرح مجھے ڈھاکہ کی سیر کا موقع مل گیا تھا۔ ہم ہوٹل میں آگئے۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ پروین کہنے لگی۔

"ہم کل شہر کی سیر کرنے نکلیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں رات ہو جائے گی۔"

رات کو میں نے پروین کو پلنگ پر سلایا اور خود صوفے پر سو گیا۔ کمرے کی ایک بتی میں نے روشن رہنے دی تھی۔ کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد پروین سو گئی۔ میں صوفے پر لیٹا کچھ دیر ڈھاکہ کے اردو اخبار کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر میں نے بھی اخبار ایک طرف رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں ابھی غنودگی کے عالم میں تھا کہ

مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی شے صوفے کی پشت کے اوپر سے گزر رہی ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

دیوار پر لگی بتی جل رہی تھی۔ میں نے بجلی کی روشنی میں ایک سبز رنگ کے سانپ کو دیکھا جو صوفے کے اوپر سے رینگتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں جلدی سے صوفے پر سے اچھل کر قالین پر آگیا۔ سانپ بھی وہیں رک گیا۔ اس نے گردن اٹھائی پھر اپنا پھن کھولا اور پھنکارنے لگا۔ میری جیب میں پروین کا رومال نہیں تھا۔ میں نے پروین کو آواز دے کر جگا دیا۔

"کیا ہوا؟"

پروین پلنگ پر اٹھ بیٹھی۔ اب اس نے بھی سانپ کو دیکھ لیا تھا۔ سبز سانپ نے اپنی گردن اور اوپر اٹھائی اور اپنے پھن کو دائیں بائیں لہراتے ہوئے آگے کو جھکا دیا۔ پروین پلنگ پر سے اتر کر صوفے کے پاس آئی۔ اس نے سانپ کو اٹھا لیا اور اس کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا

"یہ بنگال کا دریائی سانپ ہے۔"

پروین کے ہاتھ میں سانپ بالکل نیم مردہ سا ہو کر لٹکنے لگا تھا۔ پروین نے اس کی گردن پکڑ کر اوپر کر لی۔ اور پھر اس سے ہلکی ہلکی سسکاریوں میں باتیں کرنے لگی۔ جس طرح کہ وہ عام طور پر سانپوں سے باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کے بعد پروین نے سانپ کو اپنی کلائی کے گرد لپیٹا۔ میرے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"لگتا ہے بنگال کے سپیروں کو میرے آنے کا پتہ چل گیا ہے۔ انہوں نے اس سانپ کو میری سراغ رسانی کے لئے یہاں بھیجا ہے۔"

میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے یہاں ایک نئی مصیبت ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اس سانپ کو واپس مت جانے دینا۔ اسے یہیں ختم کر ڈالتے ہیں۔ یہ واپس جا کر ہمارے دشمن سپیروں کو ہمارا ٹھکانہ بتا دے گا۔"

پروین نے سانپ کی طرف دیکھا۔ اس سے مسکرا کر کوئی بات کی۔ پھر میری طرف

Prepared By: S.Sohail Hussain

پلٹ کر کہا "فکر نہ کرو! یہ سانپ واپس جا کر ہم سپیروں کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔"

میں نے کہا "سانپ کا کیا بھروسہ ہے۔"

پروین بولی "میرا مطیع ہے۔ میں نے اسے حکم دیا ہے کہ جس سپیرے نے اسے میری تلاش میں یہاں بھیجا ہے۔ اسے واپس جا کر میرے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ گھبراؤ نہیں۔ سانپ میرا حکم مانتے ہیں۔"

"تو کیا ہم ساری رات اس سانپ کو اپنے کمرے میں رکھیں گے؟"

پروین نے آگے بڑھ کر کمرے کی کھڑکی کھولی اور سانپ کو دوسری طرف گلی میں گرا دیا۔ کھڑکی بند کر کے پلنگ پر آ گئی اور مجھے کہا۔

"بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ سانپ واپس سپیروں کے پاس جانے کی بجائے دریا کی طرف چلا جائے گا جہاں وہ رہتا ہے۔"

باقی رات میں نے بڑی مشکل سے گزاری۔ پروین تو مزے سے سو گئی۔ مگر میری آنکھ بار بار کھل جاتی۔ ایسے محسوس ہوتا کہ سبز سانپ کمرے میں رینگ رہا ہے۔

دوسرے دن ہم ڈھاکہ شہر کی سیر کو نکل گئے۔ دوپہر تک شہر کے بازاروں، بالکنی اور دریائے بوڑھی گنگا کی سیر کرتے رہے۔ دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے گھاٹ پر جا کر کشتی لی اور دریا کے دوسرے کنارے کی طرف دریا کے اوپر کی جانب نکل گئے۔ کافی آگے جا کر ہم نے کشتی چھوڑ دی اور کنارے کے درختوں کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ ایک چھوٹا سا راستہ پٹ سن کے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا آگے اونچے اونچے تاڑ اور ناریل کے درختوں کی طرف نکل گیا تھا۔ ہم اتر کر اس راستے پر چلتے ہوئے ناریل کے جھنڈوں میں آ گئے۔ ہم پھر یہاں سے بھی آگے چلے گئے۔

آگے کسی کارخانے کا بہت بڑا گودام تھا۔ آس پاس چند ایک جھونپڑیاں تھیں۔ کچھ عورتیں مرد اور بچے جھونپڑیوں کے پاس بیٹھے تھے۔ ایک کھوکھا تھا جہاں چائے پک

رہی تھی۔ ہم نے وہاں چائے پی اور واپس دریا کی طرف چلنے لگے تو ایک سیاہ رنگ کی ہڈیوں کی ڈھانچہ عورت ہاتھ باندھ کر ہمارے راستے میں کھڑی ہو گئی اور بنگلہ زبان میں تیز تیز بولنے لگی۔ پروین اس سے بنگلہ میں باتیں کرنے لگی۔ پھر پروین نے اپنے پرس میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس عورت کو دیا۔ عورت نے آگے بڑھ کر پروین کا ماتھا چوم لیا۔ اس کے بعد ہم وہاں سے واپس دریا پر آ گئے۔ یہاں سے کشتی پر بیٹھے اور دریا پار بوڑھی گنگا کے دوسرے کنارے پر اتر گئے۔ یہاں سبزیوں اور پھلوں کی منڈی تھی۔ شام کے وقت بھی وہاں کاروبار ہو رہا تھا۔ ہم نے کچھ کیلے، خربوزے اور سائیکل رکشے لے کر واپس اپنے ہوٹل میں چلے آئے۔

رات کو ہم نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے دوران بھی پروین بار بار اپنے ماتھے کو بائیں ہاتھ سے سہلاتی رہی۔ میں نے پوچھا۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے پروین۔ کیا سر درد کر رہا ہے؟"

وہ بولی "نہیں، جہاں اس بھکاری عورت نے میرے ماتھے کو چوما تھا وہاں جلن سی ہونے لگی ہے۔"

میں نے پروین کے ماتھے کو غور سے دیکھا۔ ماتھے پر ایک طرف جلد نیلی پڑ رہی تھی۔ پروین کا رنگ گہرا سانولا بلکہ کالا تھا اور نیل کا نشان بجلی کی روشنی میں صاف نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اسے نہ بتایا کہ ماتھے پر نیل کا نشان پڑ گیا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ غسل خانے میں گئی۔ آئینے میں اس نے اپنے ماتھے کو دیکھا۔ باہر آئی تو بولی۔ "وہ عورت بھکارن نہیں تھی۔" میں چونک سا گیا۔

"تو پھر وہ کون تھی؟"

پروین صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہمیں پرسوں کی بجائے کل کی فلائیٹ میں جگہ مل سکتی ہے؟"

"آخر بات کیا ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا

پروین نے کہا "پہلے تم ایئر لائنز کے آفس میں فون کر کے پوچھو۔ اگر کل صبح کی یا

Prepared By: S.Sohail Hussain

آج رات کی فلائیٹ میں بھی جگہ مل جائے۔ تو ہم یہاں سے کراچی پرواز کر جائیں گے۔"

مجھے معلوم تھا کہ پروین جب بھی اس قسم کی ہدایت کرتی ہے تو اس کے پیچھے کوئی گہری بات ہوتی ہے۔ میں نے کہا "میں نیچے جا کر فون کرتا ہوں۔"

میں پروین کو اپنا ہاتھ سلاتا چھوڑ کر نیچے ہوٹل کے منیجر کے کاؤنٹر پر آگیا۔ میں نے اوریئنٹ ایئر لائنز کے آفس فون کر کے اپنا نام پروین کا نام اور پرسوں کی فلائیٹ میں اپنے سیٹ نمبر بتائے اور کہا۔

"ہمیں ایک ایمرجنسی آن پڑی ہے۔ ہمارا جلد سے جلد کراچی پہنچنا ضروری ہو گیا ہے۔ کیا ہمیں آج رات بارہ بجے کی یا کل صبح کی فلائٹ میں دو سیٹیں مل سکتی ہیں؟"

دوسری طرف سے ریزرویشن کلرک نے کہا "آپ تھوڑا ہولڈ کریں۔"

کوئی ایک منٹ کے بعد ریزرویشن منیجر کی آواز آئی۔

"آج رات ایک بجے کی فلائیٹ میں دو سیٹیں آپ کو چانس پر مل سکتی ہیں۔ ہم آپ کی ریزرویشن کنفرم نہیں کر سکتے۔ آپ ایئرپورٹ پر آجائیں۔ جن لوگوں کی ریزرویشن ہو چکی ہے۔ اگر وہ آگئے تو آپ کو جہاز سے اترنا پڑے گا۔"

میں نے لوبی آکر پروین کو ساری بات بتائی۔ وہ بولی میں یہ چانس لینے کے لئے تیار ہوں۔"

میں نے کہا "آخر ایسی کونسی بات ہو گئی ہے۔ تم مجھے بتاتی کیوں نہیں وہ بھکارن کون تھی۔ کیا وہ کوئی جادوگرنی تھی؟"

پروین نے ماتھے پر پٹی باندھ لی اور کہنے لگی۔"

"کپڑے وغیرہ اٹیچی کیس میں رکھ لو۔ ہم گیارہ بجے رات یہاں سے ایئرپورٹ چل دیں گے۔"

اس وقت ابھی رات کے نو ہی بجے تھے۔ ہم نے اپنے تھوڑے بہت کپڑے جو ہمارے پاس تھے اٹیچی کیس میں بند کر دیئے۔ میں نیچے چلا آیا۔ ہوٹل والوں کو بلوں کی

ادائیگی کی اور کہا کہ ہمیں اچانک ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ ہم رات کی فلائٹ سے کراچی جا رہے ہیں۔ ہوٹل سے باہر آکر ہم نے ٹیکسی لی۔ اور سیدھا ایئرپورٹ آگئے۔ یہاں اوریئنٹ کا ڈیلی آفس کاؤنٹر کی شکل میں موجود تھا۔ انہیں اپنے ٹکٹ دکھائے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم آپ کی ریزرویشن کنفرم نہیں کر سکتے۔ جن لوگوں کی یہ سیٹیں ہیں ان لوگوں کی بھی کنفرمیشن نہیں ہوئی۔ لیکن اگر وہ عین وقت پر آگئے تو آپ کو واپس جانا ہوگا۔ ہم نے چانس لے لیا اور لاؤنج کے باہر ہال میں آکر بیٹھ گئے۔ پروین تھوڑی تھوڑی دیر بعد ماحول کا جائزہ لے لیتی تھی۔ جیسے اسے ابھی تک فضا میں خطرہ محسوس ہو رہا ہو۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہماری فلائیٹ کنفرم ہو گئی۔ ہم نے بورڈنگ کارڈ لئے اور لاؤنج میں آگئے۔ میں نے پروین سے کہا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں مطمئن ہو جانا چاہئے۔ یہاں کوئی سانپ ہماری سراغ رسانی کے لئے یہاں نہیں آئے گا۔"

پروین نے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا جائزہ لیا اور بولی۔

"جب تک جہاز اڑ کے سے ٹیک آف نہیں کر جاتا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم بنگال کے سپیروں کے جادو طلسم سے واقف نہیں ہو۔"

لیکن جہاز ٹیک آف کر گیا اور کوئی ہلڑ ہنگامہ واقعہ پیش نہ آیا۔ جب طیارہ اڑ کے اوپر رات کے اندھیرے میں چکر لگا کر کراچی کی طرف روانہ ہوا تو پروین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے پروین نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر ایسا اطمینان تھا جیسے اس کے سر پر سے کسی نے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہو۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں دشمنی کی دلدل میں سے نکل کر ایک پاک صاف نئی زندگی کا آغاز کر رہی ہوں۔"

کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد مجھے بھی یوں محسوس ہوا جیسے میں دشمنوں کے

Prepared By: S.Sohail Hussain

ملک سے نکل کر اپنے گھر کی سرزمین پر آگیا ہوں۔ یہ میرے نئے آزاد وطن پاکستان کی سرزمین تھی۔ پروین بڑی خوش تھی۔ کراچی سے ہم نے دوسری فلائیٹ لی اور لاہور آگئے۔ پروین سے کیے گئے وعدے کے مطابق میں اسے لے کر اپنے گھر جانے کی بجائے ائیرپورٹ سے سیدھا ایک ہوٹل میں آگیا۔ یہاں پروین کے لئے ایک کمرہ لے لیا۔ اسے ہوٹل میں چھوڑ کر میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد میں اپنے گھر جا رہا تھا۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پھر سب کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ سب نے مجھے گلے لگایا۔ والد صاحب نے دبی زبان میں میری آوارہ گردیوں کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا۔ میں نے آئندہ کبھی گھر سے نہ بھاگنے کا انہیں یقین دلایا اور معافی مانگی۔ پروین کا ذکر میں نے کسی سے نہ کیا۔ رات کو میں پروین کے پاس اس کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ ایک ہفتہ پروین ہوٹل میں رہی۔ اس دوران میں نے کوشش کر کے اسے ایک نیم سرکاری ہسپتال میں بطور نرس بھرتی کروا دیا۔ اسکی ٹریننگ کا کورس شروع ہو گیا۔ اسے ہسپتال سٹاف ہاسٹل میں ایک کمرہ مل گیا۔ یوں پروین نے پاکستان کے شہر لاہور میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔

وہ بڑی محنتی اور لائق لڑکی ثابت ہوئی۔ ٹریننگ ختم ہونے کے بعد وہ ہسپتال میں بطور نرس کام کرنے لگی۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اب آزاد اسلامی ملک پاکستان ہی اس کا وطن ہے اور وہ پاکستان میں ایک نیک اور خدمت گزار زندگی بسر کرنے کی خواہش مند ہے۔ ہسپتال میں پروین کی دن کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ میں ہر روز پروین سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ اس نے خود مجھے منع کر رکھا تھا۔ ہم دوسرے تیسرے دن ایک دوسرے سے ملتے۔ ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد وہ کافی ہاؤس میں آ جاتی۔ میں پہلے سے وہاں اس کا انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ ہم دونوں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کافی ہاؤس کی گیلری میں بیٹھے باتیں کرتے کافی پیتے اور پھر پروین اپنے ہوسٹل کی طرف چلی جاتی تھی اور میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا تھا۔

ایک دن شام کو میں اور پروین کافی ہاؤس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ میں نے

جذبات میں آ کر اپنے دل کی بات بے اختیار کہہ دی۔ میں نے کہا۔

"پروین! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

پروین میری طرف دیکھ کر تھوڑا شرما گئی۔ پھر مسکرا کر کہنے لگی۔

"اگر میں تمہاری دشمن ہوتی یا تم میرے دشمن ہوتے تو میں تم سے ضرور شادی کر لیتی۔"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔"

پروین نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

تقدیر نے مجھے عورت سے ناگن بنا دیا ہے میں جس سے شادی کروں گی وہ شادی کی پہلی رات کو ہی مر جائے گا۔ اب بتاؤ میں تم سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟"

پروین کے اس انکشاف پر میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ سانپوں اور ان کے جس زہریلے عمل سے وہ گزر چکی تھی اس کے نتیجے میں وہ ایک انتہائی زہریلی عورت بن چکی تھی۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی کو کاٹ دے تو وہ آدمی مر جاتا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک آدمی اس سے شادی کے بعد زندہ رہ سکتا۔

پروین کہنے لگی۔

"آج میں تم پر اپنے دل کا حال ظاہر کرتی ہوں۔ میرے سینے میں عورت کا دل ہے۔ اس دل میں بھی محبت کے جذبات ہیں۔ جب تم پہلی بار مجھے سنسانی جنگلوں میں ملے تھے تو تم مجھے بڑے اچھے لگے تھے۔ پھر ایک عرصہ ہم نے اکٹھے بسر کیا۔ تمہاری بہادری اور شرافت نے مجھے تمہارا گرویدہ بنا دیا۔ آہستہ آہستہ میں تم سے محبت کرنے لگی۔ لیکن میں نے تم سے کبھی اس کا اظہار نہ کیا۔ اس لئے کہ میں جانتی تھی کہ میں تمہاری محبت کے لائق نہیں ہوں۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارے قریب گئی تو تم زندہ نہیں رہ سکو گے۔ مجھے اپنی محبت سے بڑھ کر تمہاری زندگی عزیز تھی۔ اس لئے میں نے تمہارے آگے کبھی اپنی محبت کا اظہار

Prepared By: S.Sohail Hussain

نہ کیا۔ اب تم نے مجھ سے شادی کی بات کی تو میرے لئے ضروری ہو گیا کہ میں حقیقت حال بیان کر دوں۔ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے دوست ہیں اور ساری زندگی بڑے اچھے دوست بن کر رہیں گے۔"

یقین کریں اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پروین نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا۔

"ان آنسوؤں میں تمہاری روح کی توانائی ہے اس توانائی کو صرف ایک عورت کی محبت کی خاطر ضائع مت کرو۔ اسے دوسروں کی بھلائی کے لئے استعمال میں لاؤ۔ جس طرح میں نے پاکستان میں رہ کر بیماروں کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے اسی طرح تم بھی اپنی زندگی اپنے وطن کی تعمیر اور بھلائی کے لئے وقف کر دو۔ وہ محبت جو ہمیں انسانیت کا کوئی بلند مقام عطا نہیں کرتی جھوٹی محبت ہے۔ جو محبت ہمیں زندگی کی عمارت کی پہلی منزل سے دوسری تیسری اور چوتھی منزلوں کی راہ دکھاتی ہے وہی اصل محبت ہے۔ وہی سچی محبت ہے۔"

پروین متبسم نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ میں نے پروین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"پروین!"

اس سے آگے میں ایک لفظ نہ بول سکا۔ میرا خیال ہے کہ میں محبت — سچی محبت کے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں دنیا کی زبانوں کے تمام الفاظ، تمام آوازیں، تمام سماعتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جہاں جسم پاکیزہ اور شفاف ہو کر نہ سہیرت ہو جاتے ہیں۔ جہاں محبت کرنے والا دل دوسرے محبت کرنے والے دل کے آر پار دیکھنے لگتا ہے۔ جہاں خیال بعد میں پیدا ہوتا ہے اور مفہوم پہلے سمجھ میں آ جاتا ہے۔

شام گہری ہو گئی تھی جب میں اور پروین لاہور کے کافی ہاؤس سے باہر آئے۔ کافی ہاؤس کے قریب ہی ایک خالی تانگہ کھڑا تھا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے پروین کو رنگ ہوسٹل میں چھوڑا اور خود اپنے گھر چلا آیا۔ پاکستان آ کر پروین کی زندگی ایک

معمول پر آ گئی تھی۔ پروین ہسپتال میں مریضوں کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی اور میں دوبارہ اپنی کالج کی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ یوں میری ایک طویل ایڈونچرس داستان کا اختتام ہو گیا۔

اردو پوائنٹ ڈاٹ کام